Gandhi Ji Badshan Khan ke Des meiN (Pyary Laal)

گاندھی جی
بادشاہ خاں کے دیس میں

گاندھی جی

بادشاہ خاں کے دیس میں

مہاتما جی کے سکریٹری شری پیارے لال کے قلم سے

ترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین ایم ۔ اے ۔ پی ایچ ۔ ڈی

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

جامعہ نگر دہلی

تعداد طبع ۱۰۰۰

قیمت سے

باراول

۱۰۰۰

شاخ دہلی

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

اردو بازار

دہلی نمبر ۶

شاخ بمبئی

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

پرنسس بلڈنگ جے جے ہسپتال

بمبئی نمبر ۳

اکتوبر سنہ ۱۹۵۰ء

جید برقی پریس، دہلی

فہرست مضامین

تقریب

گاندھی جی کی روحانی فتوحات میں صوبہ سرحد کی فتح بڑی حیرت انگیز سمجھی جاتی ہے۔ ناواقف لوگوں کو بڑا اچنبھا ہوتا ہے کہ ان کی اہنسا کی تعلیم نے جنگ جو پٹھانوں کے دلوں پر اتنا گہرا اثر کیسے ڈالا۔ لیکن جو لوگ اہنسا کی حقیقت سے واقف ہیں اور سرحدی پٹھانوں کو بھی جانتے ہیں ان کو اس میں کوئی تعجب کی بات معلوم نہیں ہوتی۔ اہنسا بہادروں کا ہتھیار ہے پٹھان صرف جنگ جو ہی نہیں بلکہ سچے معنی میں سپاہی اور اچھے ہتھیاروں کے قدرداں ہیں۔ پھر بھلا انھیں اہنسا کی تیغ جوہر دار جس کا لوہا دنیا کی سب سے بڑی سلطنت نے مانا ہے، کیوں نہ پسند آتی۔

سرحد میں گاندھی جی کی کامیابی کی ایک اور وجہ بھی ہے وہاں انھیں ستیہ گرہ کی لڑائی میں ایک ایسا سپہ سالار مل گیا جس کی کھری سچائی میں کھوٹ کا نام تک نہ تھا۔ خان عبد الغفار خاں جو سرحدی گاندھی کے نام سے مشہور ہیں چند گنتی کے آدمیوں میں سے ہیں جنھوں نے عدم تشدد کو وقتی غرض کی بنا پر نہیں بلکہ اپنے قلب اور روح کے تقاضے سے اختیار کیا تھا۔ اس لیے انھوں نے اس کی آب و تاب کو سیاسی مصلحت کا زنگ

نہیں لگنے دیا۔ اور اس سرے سے اسی طرح کام لیا جیسے گاندھی جی چاہتے تھے شاید کہنے والے یہ کہیں کہ سرحد میں اہنسا کا ظہور محض ایک وقتی چیز تھی۔ آج اہنسا کہاں ہے؟ اور ایک سرحد ہی پر کیا موقوف ہے ہندوستان میں بھی تو کہیں نظر نہیں آتی۔

مگر یہ نظروں کی کوتاہی ہے۔ اہنسا آج بھی اس برصغیر میں جو کل تک ہندوستان کہلاتا تھا اس سرے سے اُس سرے تک موجود ہے۔ مگر کہاں؟ وہیں جہاں پہلے تھی ــــ خدا کے چند نیک بندوں کے دلوں میں صرف اتنی بات ہے کہ ارباب سیاست جنھوں نے اُسے عارضی مصلحت سے اختیار کیا تھا آج اس کو چھوڑ بیٹھے ہیں۔ اس لئے وہ ایک عام تحریک کی حیثیت سے دکھائی نہیں دیتی۔ مگر اب بھی وہ ایک قوت ہے اور جھوٹ نفرت، تعصب، ظلم کی قوتوں کا مقابلہ کر رہی ہے۔

بہر حال پٹھانوں کو اہنسا کا پیام پہنچانے کی یہ داستان جو پیارے لال جی نے لکھی ہے بڑی دلچسپ اور سبق آموز ہے۔ مجھے یقین ہے کہ پڑھنے والے اس سے صرف لطف ہی نہیں بلکہ فائدہ بھی اٹھائیں گے۔

جامعہ نگر

۲۴ ستمبر ۵۰ء

ذاکر حسین

تعریف کرنے بگاڑ دیا گیا ہے۔ وہ نہیں چاہتے کہ پٹھان سماج کا غنڈہ بنے۔ وہ مانتے ہیں کہ پٹھان کو جاہل رکھا گیا ہے، اور اُس کی جہالت سے ناجائز فائدہ اُٹھایا گیا ہے۔ ان کی خواہش ہے کہ پٹھان اور بھی زیادہ بہادر بنے اور اس کے ساتھ ساتھ سچا گیان (علم) بھی حاصل کرے اور ان کے نزدیک یہ چیز صرف عدم تشدد سے حاصل ہو سکتی ہے۔

چونکہ بادشاہ خاں میری اہنسا پر اعتقاد رکھتے ہیں، اس لیے اُن کی خواہش تھی کہ جتنے دن ہو سکے میں خدائی خدمتگاروں میں رہوں وہاں جانے کے لیے مجھے کوئی لالچ دینے کی تو ضرورت تھی ہی نہیں کیوں کہ میری تو خود ہی یہ خواہش تھی کہ خدائی خدمت گاروں کو جان لوں۔ میں ان کے دلوں تک پہنچنا چاہتا تھا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ میں اس میں کامیاب ہو گیا۔ ہاں اس کی کوشش ضرور کی ہے۔

یہ بیان کرنے سے پہلے کہ میں نے اپنا کام کس طرح شروع کیا اور کیا کیا کام کیے، مجھے چند لفظ بادشاہ خاں کے بارے میں کہنے چاہئیں۔ میرے میزبان کی حیثیت سے سارے دورے میں ان کو ایک ہی فکر رہی اور وہ یہ

اہنسا یا خیر اندیشی ہمیں صرف انگریزوں کے ساتھ لڑنے ہی
میں نہیں برتنی چاہیئے بلکہ آپس کے برتاؤ میں بھی اس کا
پورا پورا استعمال کرنا چاہیئے۔ ہوسکتا ہے کہ انگریزوں کے
مقابلے میں اہنسا سے کام لینا ایک لاچاری کی خوبی ہو۔ لوگ
آسانی سے اسے اپنی بزدلی یا کمزوری کا پردہ بنا سکتے ہیں،
یا محض مصلحت کی خاطر اختیار کر سکتے ہیں، اور اکثر ایسا ہی
ہوتا ہے۔ لیکن اگر ہمیں ہنسا اور اہنسا میں سے کسی ایک
کو پسند کرنے کا یکساں موقعہ ملے اور ہم اہنسا کو چنیں تو
اسے محض ایک کام چلانے کی ترکیب سمجھ کر استعمال نہیں
کر سکتے۔ ایسے موقع خانگی زندگی میں، آپس کے برتاؤ میں
سماجی اور سیاسی تعلقات میں اکثر آتے ہیں۔ نہ صرف ایک
مذہب کے دو فرقے بلکہ مختلف مذہبوں کے لوگ بھی ایک
دوسرے کے ساتھ اہنسا کا برتاؤ کر سکتے ہیں۔ اگر ہم اپنے
ہمسایوں اور برابر کے لوگوں کی بات کو برداشت نہ کر سکیں
تو انگریزوں کے ساتھ بھی سچی رواداری نہیں برت سکتے۔
اس لئے اگر ہمارے اندر دوسروں کی خیر اندیشی کا ذرا سا
بھی مادہ ہے تو اس کا روزمرہ امتحان ہوتا رہے گا۔ اور اگر

ہم اس پر عمل کرنے کے عادی ہو گئے تو اس سے وسیع تر میدانِ عمل میں بھی ہمیں اس کے استعمال کی عادت پڑ جائے گی یہاں تک کہ یہ ہماری فطرت ثانیہ بن جائے گی۔

بادشاہ خان نے انھیں خدائی خدمت گاروں کا جو نام دے رکھا ہے، اسی سے ظاہر ہے کہ ان کا کام بنی نوع انسان کی خدمت کرنا ہے، انھیں نقصان پہنچانا نہیں۔ کیونکہ خدا تو نہ اپنے لیے کسی خدمت کا خواہاں ہے اور نہ کوئی ذاتی کام لیتا ہے۔ وہ خود اپنے بندوں کی خدمت کرتا ہے اور اس کے عوض کچھ مانگتا نہیں۔ اس کی ہستی اور چیزوں کی طرح اس معاملے میں بھی بے مثل ہے۔ اس لیے خدائی خدمت گار کی بھی سچی آزمائش اسی سے ہوگی کہ وہ خدا کے بندوں کی کتنی خدمت کرتا ہے۔

خدائی خدمت گاروں کی اہنسا اُن کے روزمرّہ کے کاموں میں جھلکنی چاہیئے اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ اُن کے قول، خیال اور عمل میں اہنسا ہی اہنسا بھری ہو۔

جیسے اُس شخص کو، جو اپنے روزمرّہ کے کاموں میں تشدد کی طاقت پر بھروسا کرتا ہے، فوجی ٹریننگ لینی پڑتی ہے،

اسی طرح ایک خدائی خدمت گار کو ایک خاص قسم کی تربیت حاصل کرنی ہوگی۔ اس کا انتظام ۱۹۲۰ء میں کانگریس کے خاص اجلاس میں ایک تجویز کے ذریعے کیا تھا۔ آگے چل کر اس کا دائرہ وسیع ہوتا گیا۔ جہاں تک مجھے علم ہے یہ ضابطہ کبھی کمزور نہیں ہوا۔ ہماری خیراندیشی جیتی جاگتی ہے کہ نہیں اس کے امتحان کے لیے چار خاص چیزیں رکھی گئیں:۔ فرقہ وارانہ اتحاد، ہندوؤں میں چھوت چھات کا مٹانا، کروڑوں انسانوں کے ساتھ اتحاد کی سچی نشانی کے طور پر گھروں میں ہاتھ سے کتے ہوئے سوت کی کھادی بننا اور اس کو استعمال کرنا اور شراب بندی۔ اس چہار پہلو پروگرام کو تہذیب نفس اور ملک کی حقیقی آزادی کے حصول کا یقینی طریقہ بتایا گیا تھا۔ کانگریسی اور عام لوگ اس پروگرام کو بے دلی سے چلا رہے ہیں، اس سے پتہ چلتا ہے کہ یا تو انھیں اہنسا پر سچا عقیدہ نہیں یا جو طریقہ اس پر عمل کرنے کا رکھا گیا ہے اس پر بھروسہ نہیں، یا دونوں کو نہیں مانتے۔ لیکن خدائی خدمت گاروں کے بارے میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ اس پر عقیدہ رکھتے ہیں۔

اس لیے ان سے یہ توقع ہے کہ اپنی صفائی قلب کے لئے کانگریس کے بنائے ہوئے تعمیری پروگرام پر پورا پورا عمل کریں گے۔ میں نے اس میں گاؤں کی صفائی، حفظان صحت اور فرسٹ ایڈ کو بھی شامل کر دیا ہے۔ ایک خدائی خدمتگار اپنے کاموں سے پہچانا جائے گا۔ اگر وہ کسی گاؤں میں ہو تو یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ اس کی صفائی نہ کرے اور گاؤں والوں کو عام بیماریوں سے بچنے میں مدد نہ دے۔ ہسپتال وغیرہ تو امیروں کے کھلونے ہیں اور صرف شہر والوں کے لیے ہوتے ہیں۔ بے شک کوشش کی جا رہی ہے کہ ملک میں جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے دوا خانے قائم ہو جائیں لیکن ان کے اخراجات ہماری حیثیت سے زیادہ ہیں۔ خدائی خدمت گار تھوڑی سی لیکن ٹھوس ٹریننگ کے بعد بڑی آسانی سے گاؤں کے زیادہ تر مریضوں کو عام طور پہ مدد پہنچا سکے گا۔

میں نے خدائی خدمت گاروں کو بتایا کہ سول نافرمانی عدم تشدد کا پہلا قدم ہے آخری نہیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی میں نے ۱۹۱۸ء میں اس ملک میں غلط مقام سے

کام شروع کیا۔ میں حالات سے مجبور ہو گیا تھا۔ مگر اس سے ملک کو نقصان نہیں ہوا کیوں کہ عدم تشدد کے طریقِ عمل کے ایک ماہر کی حیثیت سے میں جانتا تھا کہ کب اور کیسے ہمیں اپنے قدم پیچھے ہٹا لینے چاہئیں۔ پٹنہ میں سول نافرمانی کو بند کرنا اس طریق عمل کا ایک جزو تھا۔ مجھے پٹنے میں بنائے ہوئے تعمیری پروگرام پر اب بھی اُتنا ہی اعتقاد ہے، جتنا کہ اس وقت تھا۔ میں مکمل آزادی کے لئے سول نافرمانی کر ہی نہیں سکتا۔ جب تک کہ ہم تعمیری پروگرام پر جیسا چاہیئے عمل نہ کریں۔ سول نافرمانی کا حق انھیں کو مل سکتا ہے جو اپنے یا دوسروں کے بنائے ہوئے قاعدوں پر عمل کرنا فرض سمجھتے ہیں اور عمل کرتے ہیں۔ قواعد کی پابندی خلاف ورزی کی سزا کے خوف سے نہ ہونی چاہیئے نہ محض عادت کے طور پر بلکہ دل سے اور فرض سمجھ کر ہونی چاہیئے۔ جب تک یہ پہلی شرط پوری نہ ہو، سول نافرمانی محض نام کی 'سول' ہو گی۔ وہ طاقت ور کا ہتھیار نہیں بلکہ کم زور کی مصلحت یا حکمت عملی ہو گی۔ اس میں اہنسا یا خیراندیشی نام کو بھی نہ ہو گی۔ خدائی خدمت گاروں نے سول نافرمانی

کی تحریک میں دوسرے صوبوں کے ہزارہا لوگوں کی طرح سختیاں برداشت کرکے اپنی بہادری کا وہ ثبوت دیا ہے جس میں کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہ دلی خیر اندیشی کا یقینی اور پختہ ثبوت نہیں ہے۔ اور یہ تو ایک پٹھان کے لئے ذلت کی بات ہوگی کہ اس میں صرف ظاہری عدم تشدد ہو۔ اس لیے پٹھان میں تو کمزوری آنی ہی نہیں چاہیئے۔

جو کچھ میں نے کہا خدائی خدمت گاروں نے بڑے غور سے سنا۔ یہ صحیح ہے کہ عدم تشدد پر ان کا عقیدہ بادشاہ خان کی وجہ سے ہے، اور انھیں سے حاصل کیا گیا ہے تاہم جب تک وہ اپنے رہنما پر کامل اعتماد رکھتے ہیں اور وہ ان کے دلوں پر پوری پوری حکمرانی کرتا ہے تب تک ان کے عدم تشدد کو ادھورا یا بے جان نہیں کہا جا سکتا اور بادشاہ خان کا عقیدہ کوئی زبانی چیز نہیں ان کا تو سارا دل اسی میں لگا ہے۔ جن کو شک ہو وہ ان کے ساتھ رہ کر دیکھیں جیسے میں ان پانچ قیمتی ہفتوں میں رہا ہوں، ان کے شکوک اس طرح دور ہو جائیں گے جیسے آفتاب کے نکلنے سے غبار چھنٹ جاتا ہے۔

دورے کے آخری دنوں میں مجھے ایک پٹھان ملے۔
ان پر میرے سارے دورے کا جو اثر ہوا اُس کا اظہار انھوں
نے ان الفاظ میں کیا: "جو کچھ آپ کر رہے ہیں، مجھے پسند ہے۔
آپ بہت چالاک ہیں (شاید "مکّار" کا لفظ ان کے مطلب
کو زیادہ صحیح طور پر ادا کرتا ہو) آپ ہماری قوم کے لوگوں
کو زیادہ بہادر بنا رہے ہیں۔ آپ انھیں اپنی طاقت کو بچا
کر رکھنا سکھا رہے ہیں۔ بے شک یہ اچھا ہے کہ کچھ حد تک
آدمی عدم تشدد پر قائم رہے۔ آپ کی تعلیم سے وہ ایسا کریں گے۔
تشدد کے استعمال کے بغیر تشدد سے کیونکر فائدہ اٹھایا جا سکتا
ہے، اس فن کو ہٹلر نے کمال تک پہنچا دیا ہے۔ لیکن آپ ہٹلر
کے بھی اُستاد نکلے۔ آپ ہماری قوم کو عدم تشدد کی تعلیم دے
رہے ہیں۔ مارے بغیر مر جانا، تاکہ جب کبھی تشدد کے استعمال
کا موقع آئے تو وہ اُسے پہلے سے کہیں زیادہ زور کے ساتھ
استعمال کر سکیں اور یہ طے شدہ امر ہے کہ وہ اسے دوسروں
سے زیادہ قابلیت سے استعمال کریں گے۔ میں آپ کو مبارک باد
دیتا ہوں۔"

میں خاموش رہا۔ مجھے اتنی جرأت نہ ہوئی کہ اس کا جواب

دے کر اُن کے اس وہم کو دور کردوں۔ میں صرف مسکرا دیا اور سوچ میں پڑ گیا۔ مجھے یہ تو اچھا لگا کہ پٹھان میری تعلیم کی وجہ سے پہلے سے زیادہ بہادر ہو جائیں گے۔ ایسے کسی شخص سے میں واقف نہیں جو میرے اثر کی وجہ سے بزدل بن گیا ہو۔ لیکن ان دوست نے اس سے جو نتیجہ نکالا وہ بہت زہریلا ہے۔ اگر آخری آزمائش میں خدائی خدمت گار اس عقیدے کو بھول گئے، جس کے ماننے کا وہ اقرار کرتے ہیں تو یقینی بات ہے کہ وہ اہنسا کو دل سے نہیں مانتے، اس کا ثبوت جلد ہی مل جائے گا۔ اگر وہ تعمیری پروگرام پر جوش اور صداقت کے ساتھ عمل کریں گے تو ان پٹھان دوست نے جس خطرے کا اظہار کیا ہے وہ کبھی پیش نہیں آسکتا۔ اس کے برعکس آزمائش کے وقت وہ سب سے بڑے بہادروں کی صف میں نظر آئیں گے۔

۱۱ر نومبر ۱۹۳۸ء　　　　موہن داس کرم چند گاندھی

پیش لفظ

پچھلے سال گاندھی جی کی اَلَم ناک وفات کے بعد ہمارے کئی محترم نیتاؤں اور عزیز دوستوں اور ساتھیوں نے جن کو گاندھی جی کا خاندان کہا جا سکتا ہے مجھ سے کہا کہ میں ان کی مکمل اور مستند سوانح عمری لکھنے کا مقدس فرض ادا کردوں۔ اس کتاب کا خاکہ ۶ رمارچ ۱۹۴۹ء کے ہریجن میں شائع ہوا تھا۔ مگر نوا کھالی میں گاندھی جی نے جو کام میرے اور دوسرے ساتھیوں کے سپرد کیا تھا اس کو پورا کرنے میں مجھے دس مہینے لگ گئے۔ اس کے بعد دوسرے ضروری ابتدائی کاموں میں کچھ اور وقت لگ گیا۔ ابھی تھوڑے ہی دن ہوئے کہ سب جزئیات کے مکمل ہونے کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ نوجیون ٹرسٹ کی سرپرستی میں جو اس سوانح عمری کو چھاپے گا کام شروع کر دیا جائے۔

مکمل سوانح عمری شائع کرنے سے پہلے جو وقت ملا وہ میں نے گاندھی جی کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر چھوٹی چھوٹی کتابیں تیار کرنے میں صرف کیا۔ خصوصاً ایسی کتابیں جو اُن کے آخری دنوں کے واقعات سے تعلق رکھتی ہوں۔ یہ اس سلسلے کی پہلی کتاب ہے۔ دوسری اُن کے

"کرو یا مرو" والی مہم کے بارے میں ہوگی جس کے ذریعے وہ نواکھالی میں امن قائم کرنے میں کامیاب ہوئے۔ تیسری کتاب میری بہن ڈاکٹر سوشیلا کی ڈائری ہے جو انھوں نے آغا خان پیلس میں گاندھی جی کے ساتھ اکیس مہینے کی نظربندی کے زمانے میں لکھی۔ اس کو سستا ساہتیہ منڈل کناٹ سرکس۔ نئی دہلی شائع کرے گا۔ اس کے ساتھ ہی اس کا گجراتی ترجمہ نوجیون پریس۔ احمد آباد سے شائع ہوگا۔

ان کتابوں کو پہلے شائع کرنے کی ایک خاص وجہ ہے۔ دنیا کو جوہری قوت نے چیلنج دیا ہے اس کا گاندھی جی کی طرف سے جواب ان کتابوں میں موجود ہے۔ ہمارے سامنے یہ اہنسا کے نظریے اور عمل کو جن کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے گاندھی جی نے خاص طور سے اپنی زندگی کا آخری حصہ وقف کر دیا تھا تفصیل سے پیش کرتی ہیں۔ ان کا لب لباب گاندھی جی کی مکمل سوانح عمری میں شامل کر دیا جائے گا۔

میں خاص طور سے مسٹر آرتھر مور اور مسٹر ہورس الگزینڈر کا مشکور ہوں جنھوں نے نہایت خوشی سے اس مسودہ پر نظرثانی کرنا منظور کیا۔ میں ان فوٹوگرافروں کا بھی مشکور ہوں جنھوں نے اس کتاب میں اپنے فوٹو شامل کرنے کی اجازت دی اور آخر میں ان دوستوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں جن کی مدد کے بغیر شاید یہ کتاب کبھی شائع نہ ہو پاتی۔

ہریجن کالونی
کنگس وے۔ دہلی
یکم جنوری ۱۹۵۶ء

پیارے لال

۱۹۳۸ء کے موسم خزاں میں گاندھی جی ایک عرصے تک صوبۂ سرحد میں ٹھیرے اور خان عبدالغفار خاں صاحب کے ساتھ صوبے کا دورہ کیا۔ یہ گاندھی جی کے لیے ایک پرانی آرزو کی تکمیل تھی۔ اس یادگار سفر میں روح کا جو اہتزاز گاندھی جی سے ظاہر ہوتا تھا اسے میں کبھی نہ بھول سکوں گا۔ اس کے مشاہدہ کا شرف بڑا ہی قیمتی شرف تھا۔

میں نے اس زمانے میں اس دورہ کی داستان اخبار ہری جن کے ایک سلسلۂ مضامین میں شائع کی تھی لیکن خاں صاحب کی خواہش تھی کہ اس دورے میں گاندھی جی نے جو کچھ فرمایا ہو خصوصاً خدائی خدمتگاروں کے سامنے انھوں نے عدم تشدد پر جو کچھ کہا ہو وہ سب کا سب اصل صورت میں پبلک تک پہنچ جائے۔ لیکن میں دوسرے کاموں میں پھنسا رہا اور ان بابرکت اور پرمسرت ایام کی کیفیت کو اس پس منظر سے دور، جہاں وہ پیدا ہوئی تھی، پھر اپنے اوپر طاری نہ کر سکا۔ لیکن دو مرتبہ جیل جانے کے بیچ میں خرابی صحت کی وجہ سے جو مختصر سا وقفہ ملا اس میں اس کام کی تکمیل کا موقع نکل آیا اور مجھے بڑی خوشی ہے کہ اس

فرض کو جس کے ادا کرنے کا بوجھ مجھ پر عرصے سے تھا اب ادا کر رہا ہوں۔

یہ کتاب دو حصوں میں منقسم ہے۔ (پہلے حصے میں "ہریجن" کے بارہ مضمون تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ درج ہیں ان سے پس منظر سمجھ میں آجائے گا۔ دوسرے حصے میں گاندھی جی کے اپنے ارشادات ہیں)

اس کتاب کی اشاعت کے لیے یہ زمانہ کچھ ناموزوں نہیں ہے۔ میں جو دو مرتبہ ناگپور جیل میں کانگریس کی جنگ میں شرکت نہ کرنے والی تحریک کے سلسلے میں قید رہا تو مجھے سی، پی کے کئی قومی کام کرنے والوں اور سیاسی رہنماؤں سے قریبی میل جول کا موقع ملا۔ یہ سب تہ گر ہی تھے، اس لیے سب کے سب عدم تشدد کی نظری اور عملی حیثیت دونوں میں خاص دلچسپی رکھتے تھے، بار بار نت نئے سوال اٹھتے تھے اور وہ جواب چاہتے تھے، بحثیں اور مناظرے ہوتے تھے، جو کبھی کبھی تو ہفتوں چلتے تھے، مجھے بڑا اچنبھا ہوا یہ دیکھ کر کہ تقریباً سب ان سوالوں کا خیال گاندھی جی نے پہلے سے کر لیا تھا اور خدائی خدمت گاروں سے جو گفتگوئیں انھوں نے کی تھیں ان میں ان سب کا جواب دے دیا تھا۔ میرا تو خیال ہے کہ عدم تشدد کے طریق کار پر ان گفتگوؤں سے زیادہ مکمل اور کوئی کتاب نہ ملے گی۔

لیکن یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔ صوبہ سرحد میں گاندھی جی کو عدم تشدد کا مسلک ایسے لوگوں کے سامنے پیش کرنا تھا جن میں یہی نہیں کہ عدم تشدد کی روایات موجود نہیں بلکہ جن کی پچھلے دو

ہزار سال کی تاریخ اس مسلک کے بالکل خلاف ہے۔ ایسے لوگ جن کے لیے عدم تشدد کسی ایسی چیز کی توسیع کا نام نہ تھا جو ان میں پہلے سے پائی جاتی تھی، بلکہ اب تک جو کچھ ان کے پاس تھا اور جیسا کچھ ان کا عمل تھا وہ اکثر و بیشتر اس اصول کی ضد تھا۔ اس لئے انھیں اس مسئلے کی الف۔ بے سے شروع کرنا ضروری تھا اور اپنے دلائل کو ایسی سادہ سے سادہ شکل میں پیش کرنا تھا کہ بچہ بھی انھیں سمجھ سکے۔ گاندھی جی نے خدائی خدمت گاروں کے سالاروں سے جو کچھ کہا تھا اور جو ان تقریروں کا مغز ہے، اس میں انھوں نے ایک تشریح اعضا کے ماہر کی طرح عدم تشدد کی ماہیت اور اس کی بناوٹ کی تفصیلوں کو وہاں تک پرت پرت کھول کر سامنے رکھ دیا ہے کہ آخر میں آپ ان روحانی سرچشموں تک پہنچ جاتے ہیں جو اس الٰہی قوت سے پھوٹتے ہیں جو روح انسانی میں پوشیدہ ہیں۔

گاندھی جی کا یہ دورہ اس وقت ہوا جب دنیا پر میونک کے واقعہ کا سایہ پڑ رہا تھا۔ پڑھنے والے دیکھیں گے کہ اپنے ارشادات میں گاندھی جی نے بہیمی قوت کے مقابلے کے لیے (جس کا ایک مظہر یہ واقعہ بھی تھا) اپنے پیام کی عالمی اہمیت کا دعویٰ کیا ہے۔ یہ دلیل دی جاتی ہے کہ اور باتوں سے قطع نظر عدم تشدد کا ہتھیار اسی وقت کام دے سکتا ہے جب کہ وہ قوت جو مقابلہ میں ہو اخلاقی اثرات کو قبول کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو، لیکن

اگر کسی طاقت نے اپنی ہر شعبۂ زندگی میں جاری و ساری بے رحمی و سفاکی اور پروپیگنڈا سے اپنے آپ کو تمام و کمال دنیا کی رائے کے اثر یا اور ہر اخلاقی اثر سے "مامون" کر لیا ہو تو پھر یہ ہتھیار کسی کام نہیں آتا۔ مثلاً یہ کہا جاتا ہے کہ جرمن یہودیوں کی مثال بتائی جاتی ہے کہ اگر وہ ستیہ گرہ کرتے تو موجودہ نازی حکمرانوں کو اس میں ذرا تامل نہ ہوتا کہ وہ چند لاکھ یہودیوں کو مشین گن سے اس طرح مار کر کھپا دیتے جیسے کیڑے مکوڑوں کو مارا جاتا ہے اور یوں ساری شورش اور شورش کرنے والوں کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو جاتا۔

یہ نکتہ چیں بھول جاتے ہیں کہ عدم تشدد اپنے عمل اور اپنی کامیابی کے لئے کسی شکل میں بھی ظالم کی تائید کا محتاج نہیں ہوتا۔ یہ تو تمام خارجی اثرات سے بے نیاز ہوتا ہے۔ مثلاً اس میں نیرو NERO کی قوت ارادی کی کمزوری نہ تھی نہ خود اعتمادی کی کمی کہ وہ اس "تاریک، حقیر، توہم پرست ارتداد" کو ــــ جیسا کہ اس وقت عیسائیت کو سمجھا جاتا تھا ــــ یک قلم مٹا سکتا ہے، جس نے اس کے ہاتھ کو اس وقت روکا تھا جب اس نے روم کے شبینہ کھیلوں میں روشنی کے لئے عیسائیوں کو زندہ جلانے کا کام شروع کیا تھا یا روا کے چھٹیوں والے ہجوموں کی تفریح کی غرض سے عیسائیوں کو خونی پہلوانوں اور بھوکے شیروں کے سامنے کولیسیم میں پھینکا جاتا تھا۔ عیسائیوں کو وبا کے کیڑوں کی

طرح فنا کر دینا ایک بڑا قابلِ تعریف اور نیک کارنامہ سمجھا جاتا تھا۔ اس لیے کہ عوام کے تخیل میں یہ لوگ خود اپنی ذات سے ناپاک بغاوت کے پتلے تھے، ریاست کے بھی دشمن اور سچے دین کے بھی۔ یہودیوں کے خلاف گوئے بلز اور اشترائشر کی کوئی اشتعال انگیز تقریر شدت میں اور نفرت میں مندرجہ ذیل الفاظ سے زیادہ تو نہیں ہو سکتی جو اناطول فرانس نے پانٹیئس پائلیٹ PONTIUS PILATE کی زبان سے ادا کرائے ہیں جن سے ابتدائی عیسائیوں کے ساتھ رومی حکام کے تاریخی رویہ کی سچی تصویر سامنے آجاتی ہے :۔

"ہم اُن پر حکومت نہیں کر سکتے، لہٰذا ہم مجبور ہوں گے کہ انہیں تباہ کر دیں اور اس میں کوئی ذرا شک نہ کرے۔ یہ ہر دم ایک نافرمانی کی سی حالت میں رہتے ہیں، ان کے مشتعل دماغوں میں ہمیشہ بغاوت کا سودا پکتا رہتا ہے، یہ ایک دن ہم پر اس شدت سے پھٹ پڑیں گے کہ اس کے سامنے نومیدوں NUMIDIANS کا غصہ اور پارتھیوں PARTHINS کا بلبلانا بچوں کا کھیل معلوم ہوگا۔ یہ لوگ چھپے چھپے موہوم امیدوں کی پرورش کرتے ہیں اور اپنے جنون میں ہماری تباہی کے خواب دیکھ رہے ہیں، اور کیوں نہ ہو جب کہ ایک غیبی آواز کے بھروسے پر یہ اس توقع میں زندگی کاٹتے ہیں کہ خود ان کا ایک خون شریک شہزادہ آئے گا اور اس کی حکومت سارے سنسار میں ہوگی۔ ان جلیوں

کے ساتھ کوئی ادھوری بات تو چل ہی نہیں سکتی۔ انھیں تو بس نیست ونابود ہی کر دینا چاہیئے، بیت المقدس کو بنیادوں سے مسمار کر دینا چاہیئے۔ میں ہوں تو بوڑھا مگر کیا عجب ہے کہ مجھے بھی وہ دن دیکھنا نصیب ہو جب اس کی دیواریں گریں اور اس کے گھروں سے آگ کے شعلے اٹھتے ہوں، اس کے باشندے تلوار کے گھاٹ اتر رہے ہوں اور جہاں کبھی عبادت گاہ تھی وہاں ہل چلا کر نمک کی کھاد بکھیری جاتی ہو۔ اس دن میں سمجھ لوں گا کہ میں حق پر تھا۔"[1]

یہ بھی نہ تھا کہ ان ابتدائی عیسائیوں کی تعداد اتنی کثیر ہو یا اور کسی حیثیت سے اتنی اہمیت رکھتے ہوں کہ رومی ظالموں کے خلاف "تنگ کرنے والی تدبیریں" اختیار کر سکتے ہوں۔ اور رومیوں کو یہ بات اچھی طرح معلوم بھی تھی۔ اگر انھوں نے واقعی فیصلہ کر لیا ہوتا کہ عیسائیوں کو فنا ہی کر دیں تو کوئی چیز انھیں اس سے باز رکھنے والی نہ تھی۔ مگر پھر بھی انھوں نے ایسا نہیں کیا، نہ وہ ایسا کر سکتے تھے۔ اناطول فرانس نے، جس کے شاہکار سے ہم اوپر بھی ایک عبارت نقل کر چکے ہیں، بڑی خوبی سے رومی شہنشاہی دماغ کی اس گتھی کا خلاصہ پیش کیا ہے جو اس زچ کر دینے والے مظہر نے اس کے اندر پیدا کر دی تھی، لکھتا ہے:-

---

[1] ANATOLE FRANCE: THE PROCURATOR OF INDIA

"عیسائی آمن تم نے تو خود اپنے سپاہیوں کی ضربوں سے سیدھے سادے انسانوں کو مرتے دیکھا ہی جو کسی ایسے مقصد کے لئے جان دیتے ہیں جسے وہ حق جانتے ہیں ۔ یہ مرجاتے ہیں اور اپنے نام تک نہیں بتاتے ۔ ایسے انسان ہماری حقارت کے مستحق نہیں ہیں ۔ یہ میں اس لئے کہتا ہوں کہ ہر معاملے میں میانہ روی اور توازن دماغی قائم رکھنا پسندیدہ چیز ہے ۔ لیکن یہ اقرار ضرور کرتا ہوں کہ میرے دل میں یہودیوں کے ساتھ کبھی بھی ہمدردی کا کوئی خاص جذبہ پیدا نہیں ہوا ۔"

اس وقت جو قوت ان کے مقابلے میں تھی وہ اپنی نوعیت میں ایسی نرالی تھی ، اور جس قوت کو وہ ہمیشہ سے جانتے اور مانتے تھے اس سے اس قدر مختلف تھی کہ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس کے ساتھ کریں تو کیا کریں ۔ انھیں خبر ہوتے ہوتے یہ ایک پوشیدہ خمیر کی طرح سارے میں سرایت کر گئی تھی ، اور اس نے سب کی ماہیت پلٹ دی تھی ۔ زندہ جلنے کے لئے خاموشی کے ساتھ جاتے وقت عیسائی شہید کے چہرہ کی فاتحانہ مسکراہٹ پہلے ان لوگوں کو حیرت میں ڈالتی تھی ، پھر انھیں سراسیمہ کرنے لگی اور آخر میں تو اس نے ان بر خود غلط آرا کی خود اعتمادی کو کھوکھلا کر کے بالکل ہی ختم کر دیا تھا ، رومی فوج کا فولادی لباس تیر اور نیزہ سے محفوظ تھا مگر اس نازک قوت سے ہرگز محفوظ نہ تھا ۔ یہ دھیرے دھیرے

چھپے چھپے امراء اور اشراف کے خاندانوں میں داخل ہوئی اور آخر ایوانِ شاہی تک میں اس نے اپنے قدم جما لیے۔

ذرا اپنے زمانے سے قریب آئیے تو جسمانی زور اور مکاری پر عدم تشدد اور امداد باہمی کی فوقیت کے ثبوت اس مشہور عالم شہزادہ کروپوٹکن نے اپنی معرکۃ الآراء کتاب "امداد باہمی بہ حیثیت ایک عنصر ارتقاء" میں پیش کئے ہیں، قطرت کے وحشت زار میں بھی جہاں جنگل کا آئین چلتا ہے اور طاقت و رکے تباہ کن رجحانات پر کسی قسم کی روک ٹوک نہیں ہوتی "باقی رہنے کی سب سے زیادہ صلاحیت ان میں نہیں ہوتی جو جسمانی حیثیت سے سب سے طاقتور ہیں، یا سب سے زیادہ چالاک اور مکار ہیں، بلکہ ان میں ہوتی ہے جو اس طرح ملنا سیکھ جاتے ہیں کہ ایک دوسرے کو مدد اور سہارا دے سکیں۔"

میں سمجھتا ہوں کہ یہ بات بتلانے کے لیے میں نے کافی نقل کر دیا ہے کہ عدم تشدد کے خلاف یہ جو دلیل ہے کہ جدید منظم اور کل زندگی پر حاوی استبدادوں کی بے ضمیری اور سفاکی کے سامنے عدم تشدد نہیں چل سکتا اس میں بڑی خامی اس وجہ سے ہے کہ ہم چیزوں کو ان کے وسیع پس منظر کے ساتھ نہیں دیکھتے اور جماعتی مظاہر کے ان رجحانوں پر نظر نہیں رکھتے جو اپنا اثر ذرا زیادہ دلوں میں دکھاتے ہیں۔ لیکن شک کرنے والا یہ دلیل دے گا کہ چاہے ایک مکمل خیالی

دنیا میں عدم تشدد ٹھیک سہی اور رچا ہے آج بہتیرے لوگ "اٹلانٹک چارٹر" کے اس مجرد اعلان کی تصدیق کر دیں کہ "روحانی اور مادی دونوں وجوہ سے آخر کار تشدد کا ترک کرنا لازم ہے"۔ پھر بھی انسانی ارتقاء کا موجودہ جھکاؤ اس کے خلاف ہی جیساکہ ساری زندگی پر حاوی ڈکٹیٹروں کے عروج سے ظاہر ہوتا ہے۔ یہ دلیل تبدیلی و تغیر کے اس عمل کو یکسر نظر انداز کر دیتی ہی جس سے کسی صورت حال سے اس کو ضد پیدا ہوا کرتی ہے۔ قدرت کے مظاہر میں ہم صاف دیکھتے ہیں کہ جب قدرت کا کوئی میلان بڑھتے بڑھتے اپنے کمالوں کو پہنچ جاتا ہی تو پھر وہ اس کے لیے تیار ہو چکتا ہے کہ یکایک جیسے ایک چھلانگ مار کر خود کو اپنی ضد میں تبدیل کر دے۔ ہم نے اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھا ہی کہ جب اسلحہ کی طاقت اپنی انتہا کو پہنچ گئی تو اس نے اپنے کو ہیبت خیزی کے ڈراوے کی شکل میں بدل دیا یعنی "اگر تم یہ جتا سکتے ہو کہ تم میں قتل کرنے کی طاقت ہی تو پھر واقعی قتل کرنے کی کیا ضرورت ہی؟" اس جنگ میں اس نئی تدبیر کو کس مہلک تاثیر کے ساتھ کام میں لایا گیا ہی؟ اس تدبیر سے یہ ممکن ہو گیا ہے کہ قوموں کی قوموں کو دبا کر غلام بنا لیا جائے اور اسلحہ کے استعمال کی نوبت تک نہ آئے۔ فوجی اقتدار کی آہنی ایڑی تلے مظلوم آبادیاں جوں جوں بڑھتی جاتی ہی توں توں اس انکشاف کے لئے بھی زمین تیار ہوتی جاتی ہے کہ اگر مظلوم موت کی

طرف سے بے پروا ہو جائیں تو انھیں آزادی حاصل کرنے کے لیے غالباً مرنا نہ پڑے۔ بربادی کے آلات جس قدر تباہ کن ہو جاتے ہیں اسی قدر اس کا امکان بڑھتا جاتا ہے کہ دنیا ان کی طرف سے اپنا منھ پھیر لے اور ان کے مقابل میں ایک اور طاقت کو لا کھڑا کرے جو بالکل ہی دوسری قسم کی طاقت ہو اور جس کے خلاف یہ آلات محض بے بس ہیں یعنی "نہیں" کہنے کی صلاحیت۔ اسلحہ بس تباہ ہی تو کرسکتے ہیں، وہ تم سے اطاعت اور تعاون تو جبریہ حاصل نہیں کرسکتے بشرطیکہ تم میں "نہیں" کہنے کی طاقت ہو۔ اور یہی چیز یعنی تعاون، رضامندی کا ہو یا جبر کا، یہی چیز تو ظلم کو زندہ اور برقرار رکھ سکتی ہے اور اسلحہ کے استعمال کا بھی اصل مقصد تباہی و بربادی نہیں بلکہ اسی تعاون کا حاصل کرنا ہی۔

اس طاقت کی فتح کی سب سے پہلی اور شاید سب سے شاندار تاریخی مثال اس مقابلے میں ملتی ہے جو ٹیکسلا کے میدان میں سکندر اعظم اور ہندوستانی حکیم دامداتی میں ہوا تھا۔ یونانی وقائع نگار اس حکیم کے متعلق لکھتا ہے کہ "اگرچہ بوڑھا تھا اور برہنہ لیکن یہی ایک مدمقابل تھا جو قوموں کے فاتح سکندر کے لیے برابر سے زیادہ تھا" ناظرین اس واقعہ کے داخلی معنی پر ذرا غور کریں۔ اس کے اندر مشرق کا جواب مضمر ہے جو فتح سے تین سو سال پہلے اس مسلح قوت کو دیا گیا تھا جو مشرق پر حملہ آور ہوئی تھی۔ ہندوستان میں

یونانی قوت کی تاریخ سے اس طریق کار کی پوری تصدیق ہوتی ہے۔
آج پھر ہمیں اسی قسم کے چیلنج سے واسطہ ہے، بلکہ اس سے بھی
زیادہ سخت چیلنج کا۔ اور پھر لوگوں کا دھیان اس آلے کی طرف اور
قوت کے اس نہ ختم ہونے والے سوت کی طرف مڑ رہا ہے جو
ہندوستان کو خاص طور پر اپنے ماضی سے ورثہ میں ملا ہے اور
جس سے امید ہوتی ہے کہ وہ دنیا کی آنے والی ترقی میں ہندوستان
کی طرف سے ایک خاص اضافہ ہوگا۔ اس قوت کی جس کو ہندوستان
نے پھر سے دریافت کیا ہے ماہیت کیا ہے؟ یہ فرد میں کس طرح
پیدا ہو سکتی ہے اور عوام میں اسے کس طرح منظم کیا جا سکتا ہے؟
اس کے لیے کس قسم کے نظم کی ضرورت ہے؟ دوسرے نظاموں
سے جو تشدد پر مبنی ہوتے ہیں یہ نظم کس طرح مختلف ہے؟ آس پاس
کی دنیا سے اس عدم تشدد کے رویے کا کیا علاقہ ہونا چاہیے، اس لیے
کہ آس پاس کی دنیا یہی نہیں کہ بے میل اہنسا کی قائل نہیں بلکہ زیادہ تر
اس کی ضد پر یقین بھی رکھتی ہے اور عمل بھی کرتی ہے۔ اہنسا کے ماننے والے کے لئے یہ
چند سوالات ہیں جن کا جواب ان صفحات میں ملے گا۔

لیکن اگرچہ انفرادی طور پر اہنسا ماحول سے بے نیاز ہے اور
ہر جگہ اس پر عمل کیا جا سکتا ہے مگر اس پر اجتماعی پیمانے پر
عمل کرنے کے لیے ایک خاص قسم کا سماج درکار ہے۔ عدم تشدد کا
مطالبہ کرنے والے کے لئے دوسرا سوال قدرتی طور پر یہ پیدا ہوتا ہے

کہ جس سماج کی بنا عدم تشدد پر ہو اس کی صورت اور اس کی ذہنیت کیا ہو گی؟ اس "نئی دنیا" کی کچھ جھلک آپ کو ان مضامین میں ملے گی جو "ٹیکسلا" پر اس کتاب کے پہلے حصے کے آخر میں درج ہیں۔ وہ بڑی ہی دلفریب دنیا ہے، جو کبھی واقعی موجود بھی تھی، سادگی کی دنیا فطری زندگی کی آزادی والی دنیا، ایمان دار اور تن درست محنت کی دُنیا، ایک دنیا جس میں بہت کم قانون تھے مگر جس کا معاشرتی نظام نہایت ترقی یافتہ تھا، ایک دنیا جس میں جنگ و جدل کا خاتمہ ہو چکا تھا، اور رواداری، خصوصاً مذہبی رواداری کا دور دورہ تھا۔ یہ ساری بہار عدم تشدد کے رائی جیسے ننھے بیج سے پیدا ہوئی تھی۔

ان صفحات سے معلوم ہو گا کہ گاندھی جی اس ننھے سے بیج کو صوبۂ سرحد کے خدائی خدمت گاروں کے دل میں پھر بونے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ناظرین اس تصویر کے داخلی معنی اور اہمیت پر غور کریں اور خود فیصلہ کریں کہ یہ اس قابل ہیں کہ نہیں کہ اسی کے لئے جیا جائے اور اسی کے لیے مرا جائے؟

پیارے لال

پہلا باب

تضاد کا قانون

صوبۂ سرحد کو لوگوں نے "دھوپ چھاؤں کی، رنج و راحت کی، رومان اور حقیقت کی، محبت اور نفرت کی، ہم آہنگی اور بے آہنگی" غرض یہ کہ اضداد کی سرزمین کہا ہے۔ آب و ہوا کے لحاظ سے دیکھیے تو اس میں ڈیرہ جات کا جھلسا ہوا علاقہ بھی ہے جس میں قیامت کی گرمی پڑتی ہے اور ہزارہ کا صحت بخش خطہ بھی جس میں برف پوش پہاڑیاں پرا جمائے کھڑی ہیں۔ قدرتی مناظر میں بھی بڑی رنگا رنگی ہے۔ شمال کے خوش منظر پہاڑی علاقہ میں کہیں گھنے جنگل اور کھیتوں کے سلسلے ہیں جو سیڑھیوں کی طرح درجہ بدرجہ چڑھتے چلے گئے ہیں اور کہیں گنے اور غلے کے سبز کاہی کھیت اور میووں کے خوش نما باغ ہیں جو بہترین قسم کے رسیلے بیر، سیب خوبانی، ناشپاتی، انگور، سنترے اور انار سے لدے رہتے ہیں۔ نمک کے پہاڑ کے پار جنوب میں چکنی مٹی کا بنجر علاقہ اور لکی اور مروت کا چٹیل میدان ہے جس کی پشتہ بندی وزیرستان کی

طوفان زدہ، بے رونق، ویران پہاڑیاں گرتی ہیں۔ ایک طرف قدرتی دولت کی افراط ہے اور دوسری طرف وہاں کے رہنے والوں کا انتہائی افلاس۔

سرحدی صوبہ کی حدود مختلف اوقات میں بدلتی رہتی ہیں۔ آریوں کے ابتدائی زمانہ میں اس کی سرحد وادیٔ سندھ سے وسط ایشیا کے دور دراز خطے تک چلی گئی تھی اور اس میں افغانستان کے بڑے حصے اور موجودہ صوبۂ سرحد کے علاوہ دریائے سندھ کی جنوبی وادی جو صوبۂ سندھ میں ہے اور شاید بلوچستان بھی شامل تھا۔ چھٹی یا آٹھویں صدی قبل مسیح سے لے کر سنہ ۱۸۱۹ء تک وہ علاقہ جو اب صوبۂ سرحد کہلاتا ہے ایرانی، یونانی کشان، گپت، ترکی، غوری، مغل اور دُرّانی سلطنتوں کا ایک جُزو رہا۔ بیس سال تک سکھوں کی حکومت میں رہنے کے بعد اس حصے پر جو اب آئینی اضلاع کے نام سے موسوم ہے انگریزوں کا قبضہ ہوگیا۔

افغانستان سے گنڈمک کا صلح نامہ ہونے کے بعد جو سرحد مقرر ہوئی اس کی وجہ سے قندھار کے قدیم صوبہ کا آدھا حصہ بھی برطانوی ہند میں شامل ہوگیا۔ نئی حد جو ڈیورنڈ لائن کہلاتی ہے سنہ ۱۸۹۳ء میں اس طرح مقرر ہوئی کہ کوہ سلیمان کی سب سے اونچی پہاڑیوں کے برابر برابر چلی جائے۔ اس کے بعد وہ

سب قبائل جو خیبر، مہمند، تیرہ، قرم اور وزیرستان میں رہتے تھے انگریزوں کے حلقۂ اثر میں آگئے۔

اس کا عجیب و غریب نتیجہ یہ ہوا کہ صوبۂ سرحد کی دو حدیں قرار پائیں۔ ایک تو ڈیورنڈ لائن جو برطانوی ہند کو افغانستان سے جدا کرتی ہے اور دوسری انتظامی جہاں سے اصلی انگریزی علاقہ شروع ہوتا ہے۔ جو علاقہ ان دونوں کے درمیان واقع تھا اور قبائلی علاقہ کہلاتا تھا اس پر دراصل کسی کا قبضہ نہیں تھا۔ وہ "نقشے پر تو ہندوستان کا ایک حصہ تھا مگر دراصل برطانوی ہند میں شامل نہ تھا" اس کے باشندے براہِ راست تاج برطانیہ کی رعایا نہیں تھے اور انھوں نے اپنے علاقے کا الحاق نہیں ہونے دیا۔ وہاں شاہ برطانیہ کا حکم نہیں چلتا تھا لیکن انگریز اُسے اپنا "علاقہ زیر حمایت" کہتے تھے اور ان کا یہ دعویٰ تھا کہ وہ اس کے باشندوں میں "امن قائم کرنے کے لیے" ہوائی جہاز سے گولہ باری کرنے کا اخلاقی حق رکھتے ہیں۔

آجکل صوبۂ سرحد کا نقشہ یہ ہے کہ اس کی شمالی حد کوہ ہندوکش ہے، جنوبی حد بلوچستان اور پنجاب کا ضلع ڈیرہ غازی خاں ہے، مشرقی حد کشمیر اور پنجاب ہے اور مغربی حد افغانستان ہے۔ وسعت کے لحاظ سے وہ چیکوسلواکیہ سے تین ہزار مربع میل بڑا ہے یعنی اس کا مجموعی رقبہ اڑتیس ہزار مربع میل ہے۔ وہ تین جغرافی خطوں

پر مشتمل ہے (۱) ضلع ہزارہ کا وہ حصہ جو دریائے سندھ کے اُس پار واقع ہے۔ (۲) دریائے سندھ اور پہاڑوں کے درمیان کی پتلی پٹی جس میں پشاور، کوہاٹ، بنوں، مردان اور ڈیرہ اسمٰعیل خاں کے آئینی ضلعے شامل ہیں (۳) وہ ناہموار پہاڑی علاقہ جو ان ضلعوں کے اور افغانستان کی سرحد کے درمیان ہے۔ اس میں سے ایک تہائی سے کچھ زیادہ یعنی تیرہ ہزار ایک سو ترانوے میل کے علاقے میں چھ آئینی ضلعے پھیلے ہوئے ہیں۔ باقی دو تہائی یعنی تقریباً پچیس ہزار مربع میل میں قبائلی علاقے اور آزاد علاقے کے قبیلے بستے ہیں جنھوں نے کوئی سو سال تک انگریزوں کی مزاحمت کی اور ان کو اپنے دیس پر قبضہ نہیں کرنے دیا۔ موخرالذکر علاقہ (تقسیم ہند سے پہلے) پانچ پولیٹکل ایجنسیوں یعنی ملاکنڈ، قرم، خیبر، ٹوچی، وانا اور قسمتوں (۱) آئینی اضلاع (۲) قبائلی علاقہ (۳) آزاد علاقہ جسے سرحد پار کا علاقہ بھی کہتے ہیں اور (۴) چترال، دیر اور سوات کی ریاستوں پر مشتمل تھا۔

یہ صوبہ اب تک "اچھوتی زمین" ہے۔ وہ طرح طرح کی معدنیات سے مالا مال ہے جن سے اب تک فائدہ نہیں اٹھایا گیا۔ ان میں سے خاص خاص یہ ہیں۔ پہاڑی نمک، تیل، سیمنٹ، سنگ مرمر، گندھک، کوئلہ، اور رانگ۔ یہاں مزدوری بہت سستی ہے اور پانی کے بے انتہا خزانے موجود ہیں۔ جاڑوں کی خاص فصلیں

مکی اور جو اور موسم بہار کی گیہوں، جو اور چنا ہیں۔ چاول اور گنّا زیادہ تر ہزارہ، پشاور اور بنوں ضلعوں کی نہری زمین میں پیدا ہوتا ہی۔ پشاور ضلع کی چاہی اور نہری زمین میں اچھی قسم کی کپاس اور تمباکو بھی اُگتی ہے۔ سرحد پار کے علاقے میں سوات، قرم اور ٹوچی دریاؤں کی وادیوں میں دھان کثرت سے پیدا ہوتا ہی۔

جغرافیہ طبعی کے لحاظ سے اس صوبہ کا نقشہ حسب ذیل ہی:۔

ضلع ہزارہ ایک گاؤ دُم پٹی کی شکل میں شمال مشرق کی طرف، ہمالیہ کے بیرونی سلسلے تک چلا گیا ہے اور وادیٔ کگن کے سرے پر پتلا ہوتے ہوتے ایک نقطہ سا بن گیا ہے۔ اس میں تحصیل مانسہرہ اور ایبٹ آباد کا پہاڑی علاقہ بھی شامل ہی اور تحصیل ہری پور کا سیراب میدانی علاقہ بھی۔ یہی خطّہ تھا جہاں قدیم زمانے میں دریائے سندھ کے اس پار کی ریاست ٹکشا سیلا یا ٹیکسلا واقع تھی جسے سکندر اعظم نے فتح کیا تھا۔ پہاڑوں کے سلسلے جن کے درمیان کگن کی تنگ گھاٹی واقع ہے، جنوب کی طرف اس ضلع کی سرحد تک چلے گئے ہیں۔ جا بجا ان پہاڑوں کے درختوں سے ڈھکے ہوئے پتلے حصے آگے کو نکلے ہوئے ہیں۔ اس طرح یہ علاقہ بہت سی تنگ وادیوں میں بٹ گیا ہی۔ یہ ضلع ایک بہت اچھی صحت گاہ ہی جہاں بہترین قسم کے شیریں پھل، آڑو، آلو بخارا، سیب، ناشپاتی خوبانی، انگور، سنترے اور انار کثرت سے پیدا ہوتے ہیں اور

ایسے ایسے خوش نما مناظر ہیں کہ دُنیا میں بہت کم ہوں گے۔

دریائے سندھ اور پہاڑوں کے درمیان کا علاقہ تین میدانوں یعنی پشاور، بنوں اور ڈیرہ اسماعیل خاں پر مشتمل ہے جنھیں کوہاٹ کی نیچی پہاڑیاں اور نمک کے پہاڑوں کے آگے نکلے ہوئے حصّے ایک دوسرے سے الگ کرتے ہیں۔ پشاور کی وادی کا بہت بڑا حصہ سیراب اور درختوں سے ڈھکا ہوا ہے اور بہار خزاں کے موسم میں "ناہموار پہاڑیوں کے جھُرمٹ میں غلّے کی بالیوں سے لہلہاتے ہوئے کھیتوں اور میوے کے شگفتہ باغوں کی ایک دلکش تصویر پیش کرتا ہے"۔ پشاور سے بالکل ملا ہوا کوہاٹ کا ضلع ہے بس ایک جواکی پہاڑ بیچ میں ہے۔ یہ ضلع "ایک ناہموار پہاڑی علاقہ ہے جس کے بیچ بیچ میں تنگ گھاٹیاں واقع ہیں"...... کوہاٹ کی پہاڑیوں کے آگے کو نکلے ہوئے حصّے جنوب کی طرف رفتہ رفتہ نیچے ہوتے جاتے ہیں یہاں تک کہ بنوں کے میدان سے مل جاتے ہیں۔ یہ دریائے قرم سے سیراب ایک ایسا خطّہ ہے "جو زرخیزی میں آپ اپنی مثال ہے اور کوہاٹ کی بنجر پہاڑیوں کے مقابلے میں ایک عجیب متضاد منظر پیش کرتا ہے......" اس کے جنوب میں مروت کا وسیع چوڑس میدان ہے "جو کُنّی سے شیخ بودن پہاڑ کے دامن تک پھیلا ہوا ہے"۔ "ریتیلے پتھر اور جمے ہوئے ذرّات کے تودوں کا ایک سلسلہ جو بیچ بیچ میں ٹوٹ جاتا ہے بنوں کے

میدان کو ڈیرہ اسماعیل خاں کے دمن یا میدان سے الگ کرتا ہے
"اس کا بڑا حصہ ایک چکنی مٹی کا چٹیل میدان ہے۔ یہ ان سیلابوں
کی مٹی کے جمع ہونے سے بنا ہے جو مغرب کی طرف سے کوہ سلیمان سے
آتے رہے ہیں۔"

جو پہاڑی علاقہ آئینی اضلاع اور افغانستان کے درمیان واقع
ہے اس کے انتہائی شمال میں دیر، سوات اور چترال ایجنسیاں ہیں۔
چترال کے نیچے دیر اور باجوڑ کے "عمارتی لکڑی کے گھنے جنگل"
واقع ہیں......اس ایجنسی اور خیبر کے درمیان مہمند کی پہاڑیوں
کا ناہموار علاقہ ہے۔ خود خیبر" ایک چھوٹا تنگ اور تاریک درہ ہے جس
میں کھیتی برائے نام ہے" لیکن قلعوں، چوکیوں اور بارکوں کا جال
پھیلا ہوا ہے، خیبر کے مغرب اور شمال مغرب میں آفریدی اور
کزئی قبائل کے دیس ہیں۔ کرم کے جنوب میں "وزیری پہاڑیوں
کے بے ترتیب ٹیلے" ہیں شمال میں انھیں وادی ٹوچی اور وہ گھاٹیاں
کاٹتی ہیں جن سے گزر کر جنوب میں وانا کا میدان آتا ہے۔ یہ خشک
پہاڑیاں زیادہ تر بے آب و گیاہ ہیں۔ لیکن کہیں کہیں ان کے
درمیان زرخیز اور سیراب وادیاں ہیں مثلاً شوال کے گرد درویش
خیل کی چراگاہ جو گھنے جنگلوں سے پٹی پڑی ہے۔

سیاسی اعتبار سے تقسیم ہند سے پہلے یہ صوبہ چار حصوں میں
بٹا ہوا تھا (۱) چھ آئینی اضلاع یہ کم و بیش اس علاقے پر

مشتمل ہیں جو ۱۸۹۴ء میں انگریزوں نے سکھوں سے لے لیا تھا اس کی آبادی تقریباً پچیس لاکھ تھی۔ (۲) قبائلی علاقے کی پٹی جس کی آبادی کوئی تیرہ چودہ لاکھ تھی۔ یہ آئینی اضلاع کی سرحد سے لے کر آزاد علاقے کی سرحد تک چلی گئی تھی۔ یہ علاقہ آئینی اضلاع کے ڈپٹی کمشنروں کی سیاسی نگرانی میں تھا جہاں آزاد قبائل کے انتظام کے بارے میں حکومت ہند کے پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ کے سامنے جواب دہ تھے۔ (۳) شمالی ریاستیں جو ملاکنڈ ایجنسی کے حلقے میں تھیں یعنی چترال، دیر اور سوات۔ ان کی مجموعی آبادی ساڑھے نو لاکھ تھی۔ (۴) قبائلی پٹی اور ڈیورنڈ لائن کے درمیان کا علاقہ جسے آزاد علاقہ کہتے تھے۔ اس میں کوئی پانچ ساڑھے پانچ لاکھ پٹھان آباد تھے جن کی بڑی تعداد تیرہ اور وزیرستان میں رہتی تھی۔

صوبہ سرحد کے باشندوں کی بہت بڑی تعداد پٹھان ہے۔ لفظ پٹھان کا اطلاق ہر اس قبیلے پر ہوتا ہے جو پشتو (پختو) زبان بولتا ہے۔ اسے نسل سے کوئی تعلق نہیں۔ چنانچہ اس کا استعمال صوبہ سرحد کے ہندوؤں اور سکھوں کے لیے بھی ہو سکتا ہے اور خدائی خدمتگاروں کی تحریک شروع ہونے کے بعد اکثر ہوتا بھی تھا۔ سرحد پار کے قبائلی علاقے کے پٹھان اپنے ان بھائیوں سے جو آئینی اضلاع میں رہتے ہیں زیادہ جفاکش اور جنگ جو ہیں۔ ان کی قبائلی پٹی اصل صوبۂ سرحد اور ڈیورنڈ لائن کے درمیان کا پہاڑی علاقہ ہے۔ اس میں چار بڑے قبیلے یعنی آفریدی، مہمند، وزیری اور محسود آباد ہیں۔ ان

کے علاوہ اور قبائل یعنی کزئی، یوسف زئی، بھٹانی اور شنواری وغیرہ بھی ہیں۔

شمال سے چلیے تو بونیر اور پشاور کی گھاٹی سے آگے کے علاقے میں یوسف زئی رہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ بونیر کے یوسف زئی کفایت شعار پرہیزگار اور انتہا درجے کے مہمان نواز ہیں۔ چھوٹے سے چھوٹے گاؤں میں بھی ایک حجرہ یا مہمان خانہ ہوتا ہے۔ وہ بڑے محبِّ وطن ہیں اور انھیں اپنی شرافتِ نسب کا بڑا دعویٰ ہے (جس پر وہ ہمیشہ فخر کرتے ہیں)۔

پشاور کے شمال مغرب میں دریائے کابل اور دریائے سوات کے درمیان مہمند رہتے ہیں۔ ان کی خانگی زندگی یوسف زئیوں کی طرح ہے البتہ ان کے ہاں حجرے یا مہمان خانے نہیں ہوتے۔ خیبر کے اُدھر جنوب کی طرف بے چارے بدنام آفریدی رہتے ہیں جنھیں واقعات کے جبر نے "دُنیا بھر سے بدگمان کر دیا ہے" لیکن کہا جاتا ہے اگر یہ بدگمانی ایک بار دور ہو جائے تو آفریدی میں وفاداری کی اتنی صلاحیت ہے کہ وہ آپ کا بڑا پکّا دوست بن سکتا ہے۔ وہ چھریرے اور مضبوط جسم کا ہوتا ہے۔" اس کی عقاب جیسی تیز آنکھ، اس کا مغرورانہ انداز اور سُبک رفتار" اس کی

سلف شمالی مغربی سرحد کا مسئلہ از ڈاکٹر کالی ڈیویز۔

آزادی کی مظہر ہے جو پہاڑ کی کھلی گھاٹیوں کی پیداوار ہے۔ آفریدیوں نے ان دونوں لڑائیوں میں جو انگریزوں اور افغانوں میں ہوئی تھیں اور ۱۹۳۰ء کی سول نافرمانی کی تحریک میں بہت اہم حصّہ لیا تھا۔ پشاور اور آئینی اضلاع کے دوسرے حصّوں میں خدائی خدمت گاروں پر جو وحشیانہ مظالم کئے گئے تھے اس کی وجہ سے ان میں بڑی ہل چل مچ گئی تھی۔

گاندھی اروِن صلح کے زمانے میں آفریدیوں کے بارے میں ایک دلچسپ روایت مشہور تھی جس سے اُن کی سادہ دلی کا اندازہ ہوتا ہے کہا جاتا ہے کہ پولیٹیکل افسروں سے ان کی جو گفت و شنید ہوئی تھی اس میں ان کی طرف سے صلح کی یہ شرطیں کی گئی تھیں کہ حسبِ ذیل اشخاص کو رہا کر دیا جائے۔

(۱) بادشاہ خاں (عبدالغفار خاں)

(۲) ملنگ بابا (گاندھی جی)

(۳) انقلاب

اس زمانے میں انقلاب زندہ باد کا نعرہ بہت عام تھا۔ وہ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ یہ بھی کسی محب وطن کا نام ہے جسے برطانوی حکومت نے قید کر دیا ہے۔

تیرہ کے جنوبی دیہات میں مختلف قبائل رہتے ہیں جو مجموعی اورکزئی یا کھوئے قبائل کہلاتے ہیں۔ قرم اور گومل کے درمیان

وزیرستان واقع ہے جسے صوبہ سرحد کا سوئٹزرلینڈ کہنا چاہیئے۔ یہ پہاڑیوں اور وادیوں کی ایک بھول بھلیاں سی ہی جس میں وزیری رہتے ہیں۔ چونکہ وہ سخت اور ناہموار پہاڑیوں کے درمیان رہتے ہیں اس لیے ان کی سیرت میں بھی اپنے ماحول کی بے لوچ تندی اور سختی آگئی ہے۔ وزیریوں کی ایک شاخ محسود ہے جو "سرحد ڈیرہ جات کی بلا" کہلاتی ہے۔ یہ وزیرستان کے قلب میں رہتے ہیں۔ بھٹانی اس علاقے میں آباد ہیں جو وزیرستان کی مشرقی سرحد کے ساتھ ساتھ گومل سے مروت تک چلا گیا ہے۔ ان میں اور محسودوں میں پرانا "خونی بیر" چلا آتا ہی۔ بنوں سے لے کر کوہاٹ کے دوسرے سرے تک کھٹک قبائل کا دیس ہی۔ یہ لوگ بڑے محنتی اور جفاکش ہیں ان کا مشغلہ یا تو کھیتی ہی یا نمک کی تجارت۔ بنوں میں بنوچی اور مروت قبائل رہتے ہیں جو پٹھانوں میں سب سے زیادہ مخلوط النسل ہیں" ان میں ڈیرہ اسماعیل خاں کے ہموار اور چٹیل" میدان میں زیادہ تر جاٹ رہتے ہیں۔ پٹھانوں کی آبادی صرف ایک تہائی ہی۔ اسی طرح ہزارہ کے ضلع میں بھی زیادہ تر آبادی غیر پٹھانوں کی ہے جن میں پنجابی مسلمان، گکھر اور سید وغیرہ شامل ہیں۔

تھوڑے لوگوں کو چھوڑ کر باقی سب قبائلی پکے سنّی مسلمان ہیں یعنی وہ حضرت محمد کے سب خلفا کو تسلیم کرتے ہیں اور قرآن کے علاوہ

احادیث یعنی پیغمبر اسلام کے اقوال کو بھی بہت اہمیت دیتے ہیں۔
پٹھانوں میں بچپن کی سی سادگی اور خوش مزاجی پائی جاتی ہے۔ انھیں موسیقی، شاعری اور لوک ناچ کا بڑا شوق ہے اور جب مزے میں ہوتے ہیں تو اظہارِ مسرت کے لیے بندوقوں کے فیر کرتے ہیں۔ لوک ناچ میں عورتوں کے پارٹ ہمیشہ مرد ادا کرتے ہیں۔ ان کے پسندیدہ باجوں میں نقارہ، بانسری (سرنائے) اور ایک قسم کا بین ہے۔ لوک ناچ کی مختلف قسمیں ہیں جن میں غالباً کھٹک ناچ سب سے زیادہ دل کش ہے۔ ان ہی کھٹک رقاصوں کے متعلق آج ایک انگریز مصنف لکھتا ہے[1]: "وہ پیرٹیک رہے تھے اور کود رہے تھے۔ کبھی ہاتھی کی سی قوت سے اور کبھی غزالوں کی سی نزاکت سے۔" آگے چل کر اس نے کہا ہے "جو لڑکی" سب سے پیش پیش تھی کی خوش ادائی اور پھرتی میرے پروازِ خیال سے بڑھ کر تھی۔ پنکی، میسن، جوس اور دوسرے رقاص جن کا میں بہت قائل ہوں کیا جانیں کہ ایک دور دراز ملک میں ان کے مدِمقابل موجود ہیں۔"

پٹھانوں کی زبان پشتو یا پختو کہلاتی ہے۔ یہ سنسکرت سے نکلی ہے اور اس سے بہت مشابہ ہے۔ اس کا اچھا خاصا ترقی یافتہ

---

[1] ہندوستان میں تین دن از فیلڈنگ ہال۔

ادب موجود ہے اور اس نے متصوفانہ اور وطن پرستانہ شاعری کے بعض حیرت انگیز نمونے پیدا کئے ہیں۔ سب سے مشہور مصنفوں میں جنگ جُو شاعر خوشحال کھٹک (۱۶۳۰ء تا ۱۶۹۰ء) اور جید صوفی عبدالرحمٰن بابا گزرے ہیں۔ پٹھانوں کو اپنی زبان سے بڑی محبت ہے اور اگر کوئی اُن سے ان کی مادری زبان میں گفتگو کرے تو بہت خوش ہوتے ہیں۔

برطانوی عہد میں قبیلوں کا اندرونی انتظام جرگے کے اصول پر قبائلی سرداروں کی نگرانی میں ہوتا تھا جو مَلک کہلاتے تھے۔ جرگے کے معنی ہیں بڑے بوڑھوں کی پنچایت۔ جتنی زیادہ کسی قبیلے میں جمہوریت ہوتی اتنا ہی اس کا جرگہ بڑا ہوتا۔ چنانچہ جرگے میں کل بالغ مرد شامل ہوتے تھے۔ کسی نے کہا ہے کہ قبائلی جرگہ خصوصاً ایجنسی کے علاقوں میں نوجوان برطانوی افسروں کے لیے اعلیٰ درجے کے حکمت عملی کے مدرسے کا کام دیتا تھا۔

سرحد کی حفاظت کا جو طریقہ برطانوی حکومت نے اختیار کیا تھا وہ یہ تھا کہ وہ سرحد پار کی فوجی خدمات اور غیر اہم وادیوں کی چوکی داری خاصہ داروں یعنی مقامی سپاہیوں کے سپرد کرتے تھے اور قبائلیوں اور ان کے سرداروں کو امن قائم رکھنے کے لیے بڑے بڑے وظیفے دیتے تھے۔ یہ وظیفوں کا طریقہ دراصل وصولنی میں آکر وظیفے دینے یا رشوت دینے کا ایک خوش نما نام تھا اور اس کے حامیوں میں برطانوی سامراج کے علم بردار مثلاً

ڈیویز، بروس اور سرمائیکل اڈائر وغیرہ شامل ہیں۔

افغانستان، بلوچستان اور صوبۂ سرحد میں مسلمانوں کی آبادی کے درمیان ہندوؤں اور سکھوں کی بستیاں بھی موجود تھیں۔ آئینی اضلاع کی چوبیس پچیس لاکھ آبادی میں ان کی مجموعی تعداد دو لاکھ کہی جاتی تھی۔ لیکن ان کی اہمیت کا اندازہ ان کی تعداد سے نہیں ہو سکتا۔ ہندوستان کے سرحدی علاقہ کی قریب قریب ساری تجارت ان کے ہاتھ میں تھی۔ دراصل ان کا وجود ایک معاشی ضرورت تھا۔ یہ ساہوکارہ کرتے تھے، مال رہن رکھتے تھے اور سُنار کا کام کرتے تھے۔ ان کی ہر قسم کی دکانیں خصوصاً غلّے اور کپڑے کی، ہر جگہ پائی جاتی تھیں مجموعی طور پر ان کے تعلقات آزاد علاقے کے قبائل سے پُر امن تھے۔

سلہ "ان وظیفوں میں خرچ تو ضرور ہوتا ہے اور شاید خوردہ گیر انھیں دھونس میں آکر روپیہ دینا سمجھیں تاہم یہ تعزیری مہموں سے بہت بہتر ہیں جن پہ کہیں زیادہ روپیہ خرچ ہوتا ہے"
(شمال مغربی سرحد کا مسئلہ از ڈیویز صفحہ ۳۲)

دوسرا باب

تاریخی جائزہ

صوبہ سرحد کی دلکش کہانی

اپنے جغرافی محل وقوع کی وجہ سے صوبہ سرحد نے ہندوستان کی تاریخ میں اہم حصہ لیا ہے۔ اس صوبہ کی کوئی معیّن حدود نہیں ہیں۔ یہ پہاڑوں کا ایک منطقہ یا پٹی ہے جس کی چوڑائی مختلف ہے اور لمبائی بارہ سو میل ہے۔ یہ ایک سنگی دیوار ہے جس سے بیرونی حملہ آوروں کا گزرنا سوا خیبر، ترم، لوٹچی، گومل اور بولن کے درّوں کے قریب ناممکن ہے۔ یہی "شمالی مغربی پھاٹک" ہے جس سے بیرونی حملوں کی لہریں یکے بعد دیگرے ہندوستان پہنچیں اور انھوں نے اس صوبے کو "بدیسی جتھوں کا کارواں سرائے" یا دوسرے الفاظ میں بہت سی ایشیائی نسلوں کا عجائب خانہ بنادیا۔ یورپ کی بحری طاقتوں کے ہندوستانی ساحل پر پہنچنے کے

بعد بھی صوبۂ سرحد کی اہمیت کم نہیں ہوئی۔ تقریباً ایک صدی تک وہ ہندوستان میں برطانوی حکومت کی خارجی پالسی پر چھایا رہا۔ صوبۂ سرحد اور اس کے متصل قبائلی علاقے کو "ایک آتش گیر بارود کے ذخیرے" سے تشبیہ دی گئی ہے۔ برطانوی سامراج کے ماہرین حرب کے لیے آزاد علاقہ جس کے پیچھے دعویٔ آزادی کی تائید کے لیے کوئی طاقت نہیں تھی ایک "غیر مقبوضہ" علاقہ تھا۔ جس کو وہ اپنی فوجوں کی جنگی تربیت کے لیے تختۂ مشق کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ یہ مشق سرحدی لڑائیوں اور جنگی مہموں کے ذریعے کی جاتی تھی۔ فوج کے نوجوان حوصلہ مند افسر اُسے ایک بہترین "شکارگاہ" سمجھتے تھے جہاں بین الاقوامی ضابطوں کی رکاوٹ سے آزاد ہوکر وہ اپنے طور پر تھوڑا بہت قتل و غارت کرلیا کرتے تھے۔ تاکہ کچھ جنگی تجربہ حاصل ہوجائے۔ دراصل کسی نوجوان افسر کی ٹریننگ اس وقت تک نامکمل سمجھی جاتی تھی جب تک وہ صوبۂ سرحد میں کچھ دن تک جنگی خدمت انجام نہ دے چکا ہو۔ صوبۂ سرحد پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کا ایک طلسمی حصار تھا جس میں اس کی خاص برادری کے باہر کا کوئی شخص قدم نہیں رکھ سکتا تھا۔ یہ "امن کے زمانے میں جب کہ برطانوی افسروں کے لیے میدان جنگ میں جوہر دکھانے کا موقع نہیں ہوتا تھا، امتیاز حاصل کرنے کے لیے ایک اچھا میدان تھا۔"

اس سیاسی رازداری کی بدولت جو "پولیٹیکل اور فوجی افسروں

سے اس خلوت خانے" میں چھپائی ہوئی تھی، ہندوستان کے عام لوگوں کو کچھ دن پہلے تک اس کا کچھ علم نہ تھا کہ یہ علاقہ کیا ہے، اس کے رہنے والے کون لوگ ہیں، ان کی رسوم و روایات، ان کی امیدیں اور حوصلے کیا ہیں اور ان کی زندگی کی تشکیل کون سی قوتوں نے کی ہے۔ مغربی ملکوں کے عام لوگوں کے لئے صوبۂ سرحد محض اس سرزمین کا نام تھا جہاں "دنیا میں سب سے زیادہ قتل ہوتے ہیں"۔ ان کے نزدیک وہ جادوگرنی کا کڑھاؤ جس میں فتنہ و فساد کا حریرہ پکتا رہتا ہے اور اس میں بسنے والا پٹھان ایک لٹیرا جس کی "رگوں میں صدیوں کی مطلق العنانی کا خون" دوڑ رہا ہے۔ جس کا محبوب مشغلہ خون کا بدلہ لینا ہے اور جس کا خاص پیشہ اور آمدنی کا ذریعہ چھاپہ مارنا، اغوا کرنا اور قیدیوں کا زرِ رہائی وصول کرنا ہے۔ "پرلے سرے کا بدمعاش، دغاباز، بے رحم، کینہ پرور، خونخوار" یہ ہیں وہ الفاظ جو اس کے لیے استعمال کئے جاتے تھے۔ لیکن کسی نے یہ نہیں سوچا کہ اس کے ساتھ تقریباً ایک صدی سے کیا برتاؤ ہوتا رہا ہے۔ اس کو کس کس طرح ستایا گیا، دبایا گیا، اور دھوکا دیا گیا۔ اس سے بین الاقوامی سیاست کی بساط پر ایک مہرے کا کام لیا گیا۔ "اس کا مغرورانہ انداز اور اس کے مضبوط قدم، اس کی فوجی صلاحیت اور آزاد طبیعت، اس کے بے تکلف اور بے بناوٹ اطوار، اس کی غیروں کے تسلط سے نفرت، اس کی

حیرت انگیز جفاکشی" وہ صفات ہیں جن کا ڈیویزنے سے لے کر اب تک سب مصنفوں نے ذکر کیا ہے۔ لیکن مغربی ملکوں میں کتنے لوگ یہ جانتے ہیں کہ اس صوبے نے ہندوستان کی جنگ آزادی میں کتنا بڑا حصہ لیا، کس طرح سنہ ۱۹۲۰ء کے بعد عدم تشدد کی زبردست تحریک چلائی، اور یہ ثابت کر دیا کہ "بہادر پٹھان جو چھاپہ مار لڑائی میں بے نظیر ہے، پہاڑی جنگ میں سب سے اچھا فیصلہ کرنے والا ہے" سپاہیانہ جرأت، جسمانی طاقت اور برداشت، بے مثل نشانہ بازی اور سپہ گری کے کمال میں دنیا بھر میں مشہور ہے" مسکینوں اور خاکساروں کی صف میں بھی پیش پیش ہے اور اس بے تشدد شجاعت میں بھی کمال رکھتا ہو جو روحانی ہتھیار کے سوا اور کسی ہتھیار سے کام نہیں لیتی اور جسے کوئی مادی ہتھیار مغلوب نہیں کر سکتا۔

صوبہ سرحد ہندوستان کی طویل تاریخ سے بے شمار رشتوں سے وابستہ ہے۔ اشوک کی لافانی یادگاریں جو اس میں بکھری پڑی ہیں بودھ مت کی شوکت و عظمت کی شہادت دیتی ہیں جو کسی زمانہ میں اس علاقے میں پھیلی ہوئی تھی۔ پشاور، کنشک کی بودھ سلطنت کا جو وندھیاچل سے وسط ایشیا تک پھیلی ہوئی تھی، دارالسلطنت تھا۔ ٹیکسلا میں، جو اپنے زمانے میں مشرق کی سب سے بڑی یونیورسٹی تھی، دور مشرقی اور مغربی ملکوں سے یاتری اور طلبۂ علم اور ایمان

کی تلاش میں آیا کرتے تھے۔ آگے چل کر چوتھی صدی عیسوی میں جب بہار میں مشہور نالندہ یونی ورسٹی قائم ہوئی تھی تو وہاں اکثر طالب علم بدھ سلطنت کے اسی حصے سے جایا کرتے تھے جو تین بڑی تہذیبوں یعنی ہندوستانی، چینی اور یونانی رومی تہذیبوں کا سنگم تھا۔ اسی راستے سے ہندوستان نے اپنا مذہب اور آرٹ کا شاندار پیام دور مشرق کے ملکوں میں بھیجا تھا۔

اس علاقے کی جو آج کل صوبۂ سرحد کہلاتا ہے پہلی جھلک ہمیں آریوں کی اس ہجرت کے سلسلے میں نظر آتی ہے جو ہندوکش کے برف پوش پہاڑوں کی راہ سے ہندوستان میں ہوئی تھی۔ یہ لوگ دریائے جیحوں سے ہرات تک آئے اور وہاں سے ایک شاخ غزنی اور کابل سے ہوکر اور دوسری قندھار اور کوہِ سلیمان سے گزر کر اس علاقے میں پہنچی جسے دریائے سندھ سیراب کرتا ہے۔ مشہور اور معروف رزمیہ نظم مہابھارت میں جس کی تصنیف کا زمانہ ۳۰۰۰ ق م کے لگ بھگ سمجھا جاتا ہے، مشہور ہیروئن گندھاری، (گندھار یعنی پشاور کی رہنے والی) کا ذکر آتا ہے جو ہستناپور (جسے اب دہلی کہتے ہیں) کے حکمران کوروں کی ماں تھی۔ سنسکرت کا نامور نحوی پانینی جو غالباً دنیا کا سب سے بڑا عالمِ نحو تھا اسی علاقے میں پیدا ہوا اور پروان چڑھا۔ کہا جاتا ہے کہ پشاور کی بنیاد پرشورام یعنی اس زبردست برہمن سپہ سالار نے ڈالی تھی

جس کا ذکر ہندوستان کی دوسری رزمیہ نظم رامائن میں آیا ہے۔
پانچویں صدی ق۔م کے لگ بھگ ایران کے بادشاہ سائرس نے
اس علاقے پر فوج کشی کی جو اب افغانستان اور بلوچستان کہلاتا ہے
اور دارائے اوّل نے گندھارپر (جو اب پشاور اور راولپنڈی
کے ضلعوں پر مشتمل ہے) قبضہ کرلیا۔ زرکسیز نے جب یونان پر
حملہ کیا تو اس صوبے نے اس کے لیے فوج مہیا کی۔
۳۲۶ھ ق۔م میں یونانیوں نے سکندر اعظم کی سرکردگی میں
ہندوستان پر حملہ کیا اور وادئ پشاور کو فتح کرلیا۔ یہاں اس زمانے
میں ایک راجا کی حکومت تھی جس کی راج دھانی پشکروتی (موجودہ
چارسدہ) دریائے کابل کے کنارے تھی۔ سکندر نے اسے اپنی سلطنت
کا ایک صوبہ بنا کر ایک مقدونی افسر فلپ کو اس کا گورنر مقرر
کردیا۔ ٹیکسلا (جو اس زمانے میں بدھ علوم کا بہت بڑا مرکز تھا)
کے ہندو راجہ نے جس کی اپنے ہم سایہ راجہ پورس سے مخالفت تھی،
سکندر سے درخواست کی کہ وہ اس کے حریف پر حملہ کرے۔ پورس
کو لڑائی میں شکست ہوئی مگر سکندر اسے اُس کا راج واپس دے کر
آگے بڑھتا ہوا بیاس تک پہنچا۔ لیکن اس کی فوجوں نے مگدھ کے
زبردست راجا کے مقابلے کے لیے آگے بڑھنے سے انکار کردیا
اور سکندر کو واپس ہونا پڑا۔ اس کے مرنے کے بعد ۳۲۳ھ ق۔م
میں ٹیکسلا کے صوبہ دار امبھی اور پورس کو جنھیں یونانیوں کے حملے

نے کمزور کر دیا تھا، چندر گپت نے مغلوب کر لیا اور ان کے علاقے کو مگدھ کی موریا سلطنت میں شامل کر لیا۔ سارا افغانستان اور شمالی ہند کا سرحدی علاقہ جس میں کشمیر بھی شامل تھا، چندر گپت کے ترقی یافتہ ملکی اور فوجی نظام کے ماتحت ہو گیا۔ جس کی تفصیل چندر گپت کے مشہور عالم وزیر کوتلیہ نے ارتھ شاستر میں بیان کی ہو۔ چندر گپت کے عہد میں (۳۰۰ ق۔م) گندھارا (پشاور ضلع) اور پاکھلی (ہزارہ ضلع) میں بدھ مت کا عام رواج ہو گیا۔ مدریہ سلطنت کا نقطۂ عروج اشوک کا عہد تھا جو غالباً دنیا کا سب سے عالی قدر فرماں روا گزرا۔ اس نے بدھ مت کو سرکاری مذہب قرار دیا۔ ایک بار اس نے کلنگ کی فتح میں میدان جنگ میں ڈیڑھ لاکھ قیدی دیکھے اور جنگ کی تباہ کاریوں سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے لڑائی کو بالکل ترک کر دیا[۵]۔ اس کے بجائے جنگی مہمیں بھیجنے کی جگہ وہ امن کے پیام بر بھیجنے لگا کہ دنیا کی قوموں کو امن کا اور "دھرم" کا پیام پہنچائیں۔ اس کے زمانے میں ایک عظیم الشان نظام سلطنت نے جو خدا ترسی اور "دھرم" پر مبنی تھا نشو و نما پائی۔ یونانی مصنفوں نے تفصیل سے اس کا ذکر کیا ہے۔ اس کے فرمانوں اور کتبوں سے جو مانسہرہ کے قریب شہباز گڑھی میں پائے گئے ہیں

۵۔ اس واقعہ کا ذکر کلنگ کے مشہور تیرھویں فرمان میں ہے۔

ٹیکسلا کا نام اس کے ماتحت علاقے کی حیثیت سے آیا ہے۔ اشوک کی سرحدی پالیسی یہ تھی کہ اپنے ہمسایوں سے پُر امن تعلقات قائم رکھے۔ وہ فتوحات کے ذریعے سے اپنی سلطنت کی توسیع نہیں چاہتا تھا۔ کلنگ کے پہلے فرمان میں اس نے یہ اعلان کیا کہ غیر مفتوح سرحدی علاقے کے لوگوں کو مجھ سے ڈرنا نہیں چاہیئے۔ انھیں مجھ پر بھروسا کرنا چاہیئے اور مجھ سے رنج کی جگہ خوشی کی توقع رکھنی چاہیئے۔"

سنہ ۲۳۱ ق م میں اشوک دنیا سے رخصت ہو گیا اور اس کے بعد بدھ مت سرکاری مت نہیں رہا۔ دوسری صدی ق۔م کے وسط سے لے کر ۱۳۵ ق۔م تک باختر کے بادشاہ باختر، کابل، گندھارا اور ٹیکسلا پر حکومت کرتے رہے۔ اس کے بعد سیتھین قوم کی باری آئی (سنہ ۱۳۵ ق م) جسے شک بھی کہتے ہیں اور اس کے بعد کشن قبائل نے جنھیں ہنوں نے ان کے پہاڑی وطن سے نکال دیا تھا اس سارے علاقے کو جس پر یونانیوں، شکوں اور پہلویوں کی حکومت تھی، تاخت و تاراج کیا۔ سنہ ۶۰ء میں ہم انہیں ٹیکسلا پر حکمرانی کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ تیسرے کشن راجہ کنشک کی سلطنت سارے شمال مغربی ہند اور کشمیر میں پھیلی ہوئی تھی جس کی راجدھانی پرش پورہ (پشاور) میں تھی۔ کشن راجہ پانچویں صدی عیسوی میں ہنوں کے حملے تک اس شمال مغربی علاقے پر حکومت کرتے رہے۔ اس کے بعد وہ ہرش کی سلطنت میں شامل

ہوگیا۔ (ساتویں صدی عیسوی)

سنہ ۷۱۱ء میں مسلمان ہندوستان میں آئے۔ سبکتگین نے جو غزنی کے غلام بادشاہوں کے سلسلے کا تیسرا حکمران تھا وزیری اور آفریدی قبائل کے ساتھ پشاور اور دریائے سندھ کے مغرب کے میدان پر قبضہ کرلیا۔ اس کے بعد محمود غزنوی کے حملے شروع ہوئے لیکن محمود ہندوستان کو مستقل طور پر فتح کرنا نہیں چاہتا تھا۔ پھر بھی صوبۂ سرحد کا سارا علاقہ جو دریائے سندھ کے اس پار ہے اس کے ایک نائب کی حکومت میں تھا۔ سنہ ۱۱۸۰ء میں محمد غوری نے پشاور پر قبضہ کرلیا۔ اس کے بعد غلاموں، خلجیوں تغلقوں کے زمانے سے لے کر اکبر کے زمانے تک، جب کہ سلطنت مغلیہ مضبوطی سے قائم ہوئی، اس علاقے میں ابتری بدنظمی اور نراج کا دور دورہ رہا اور کبھی کبھی باہر سے حملے بھی ہوتے رہے۔ ان میں سب سے مشہور تیمور کا حملہ تھا جو اپنے دارالسلطنت سمرقند سے سواروں کی ایک بہت بڑی فوج کے ساتھ روانہ ہوا اور کابل سے اور درۂ خیبر سے گزرتا ہوا دلی تک پہنچا جسے اس نے پانچ دن تک لوٹا اور ایک لاکھ ہندو قیدیوں کو قتل کرکے اُن کے سروں کا ایک مینار بنایا۔ اس نے اپنے حملہ کی وجہ یہ ظاہر کی کہ ایک کٹر مسلمان کی حیثیت سے اُسے وہ رواداری بہت گراں گزری جو دلی کے مسلمان بادشاہ

ہندو مذہب کے ساتھ برتتے تھے۔

اکبر کے زمانے میں جب خوش انتظامی اور رواداری کا زمانہ تھا اس کی شمالی قلم رو میں بلوچستان اور قندھار کا زبردست قلعہ جو پہلے ایران کے ماتحت تھا شامل کر لیا گیا اور اورنگ زیب کی وفات کے بعد تک سلطنت مغلیہ کا ایک جزو رہا۔ اورنگ زیب کے زمانے میں یوسف زئی اور خٹک قبائل نے شورش کی اور ان کی سرکوبی کے لئے تعزیری فوجیں بھیجی گئیں۔ پہلے خٹک اور آفریدی نے مل کر مغلوں کو شکست دی اور "قندھار سے اٹک تک" عام بغاوت ہو گئی۔ اس پر خود شہنشاہ نے اُس مہم کی کمان جو یوسف زئی قبیلے کے خلاف بھیجی گئی تھی خود اپنے ہاتھ میں لے لی (۱۶۷۴ء) اور حکمتِ عملی صورتِ حال پر قابو پا لیا۔" اسکی پالیسی جس کی بعد میں برطانوی حکومت نے تقلید کی، یہ تھی کہ" ایک قبیلے کو دوسرے سے لڑائے اور ان کے سرداروں کو وظیفے دے کر ان کے ذریعے سے سرحد میں امن قائم رکھے۔ اس لیے کہ یہاں فوجی چوکیوں کا رکھنا زیادہ کامیاب نہیں ہوا تھا۔"

نادر شاہ دُرّانی نے ۱۷۳۹ء میں دریائے سندھ کو عبور کر کے بالکل اُسی طرح جیسے تیمور لنگ نے ۱۳۹۸ء میں کیا تھا اس علاقہ کو تاخت و تاراج کیا۔ اس کے قتل کے بعد احمد شاہ ابدالی نے (۱۷۴۳ء تا ۱۷۷۳ء) قندھار، کابل اور غزنی کے ساتھ ساتھ

پشاور، ڈیرہ جات، ہزارہ، سندھ، کشمیر اور ملتان کو ملا کر ایک جداگانہ درّانی ریاست قائم کی۔

"درّانی سلطنت کے زوال کے بعد سکھوں کی حکومت قائم ہونے تک مرکزی حکومت کی" اس علاقے پر جسے سرحد کہتے تھے ایک بے قاعدہ اور غیر مسلسل حکمرانی تھی۔" پنجاب کے سکھ حکمراں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے صوبہ سرحد سے نو آباد افغانیوں کو نکال دیا ۱۸۲۰ء تک پشاور، بنوں، کوہاٹ اور ڈیرہ جات کے کچھ حصے پر ان کا قبضہ ہو گیا تھا۔ اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے افغانوں کو دریائے سندھ کے پار پہاڑوں میں بھگا کر موجودہ صوبۂ سرحد کی بنا ڈالی۔ مگر سکھوں کی حکومت صوبہ سرحد پر (۱۸۳۴ء تا ۱۸۴۸ء) محض تلوار کی حکومت تھی۔ ڈکیتیوں اور انتقامی لڑائیوں کا زور تھا اور اُن سے بھی زیادہ تباہی اس وقت ہوتی تھی جب سکھ مال گزاری وصول کرنے کے لیے آتے تھے۔ ایسے موقعوں پر عورتوں اور بچوں کے جھُنڈ اپنے گھروں سے ڈر کر بھاگ جاتے تھے اور اس علاقے کی حالت مہاجروں کی نو آبادی کی سی ہو جاتی تھی۔" (میجر جیمس)

مہاراجہ رنجیت سنگھ کے مرنے کے بعد ان کی سلطنت میں ابتری پھیل گئی۔ سکھوں اور انگریزوں کی پہلی لڑائی کے بعد بدامنی اور انتشار کا دور شروع ہوا۔ سکھوں کی طاقت ٹکڑے ٹکڑے ہو کر رہ گئی۔ لیکن اس خطرے نے کہ کہیں افغان فوجیں سرحد سے گزر کر

دریائے سندھ کے اس پار نہ پہنچ جائیں، برطانوی حکومت کو اس پر مجبور کر دیا کہ وہ پنجاب کے الحاق کا سوال چھوڑ دے اور نابالغ مہاراجہ دلیپ سنگھ کو اس صوبے کا حکمران تسلیم کر لے۔ ۱۶ر دسمبر ۱۸۴۶ء کے معاہدے کی رو سے نظم و نسق ایک ریجنسی کاؤنسل کے سپرد کیا گیا جو برطانوی ریذیڈنٹ کے ماتحت تھی۔ ۱۶ر دسمبر کے معاہدے میں یہ شرط بھی تھی کہ " ایک برطانوی افسر اور اس کے ساتھ ایک بڑا عملہ گورنر جنرل کی طرف سے لاہور تعینات کیا جائے گا اس افسر کو پورا اختیار ہو گا کہ ریاست کے ہر محکمے کی نگرانی کرے "۔ سر ہنری لارنس لاہور میں برطانوی ایجنٹ مقرر ہوئے۔ جان نکلسن اور ہربرٹ ایڈورڈس کو حکم دیا گیا کہ بنوچیوں یعنی بنوں کے باشندوں کے مال گزاری نہ ادا کرنے کی سزا میں " بنوں کی سرکش وادی کو قابو میں لانے کے لئے خالصہ دیوان کی طرف سے فوج کشی کرے "۔ اس وادی کو دو دریا سیراب کرتے تھے "۔ یہاں کبھی ایسا نہ ہوتا تھا کہ فصل اچھی نہ ہو۔ زمین اس قدر زرخیز تھی کہ بغیر کسی خاص محنت کے قریب قریب سب اناج جو ہندوستان میں ہوتے تھے، افراط سے پیدا ہوتے تھے "۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا اس کا نقشہ میجر ہربرٹ ایڈورڈس نے اپنی کتاب سرحد پنجاب میں ایک سال " میں کھینچا ہے۔ دراصل یہ ایک خلاصہ ہے ہندوستان میں برطانوی حکومت کی انیسویں صدی

کے نصف آخر کی تاریخ کا "اس وادی پر قبضہ بندوق یا توپ سے نہیں کیا گیا بلکہ محض دو نسلوں اور دو مذہبوں کو ایک دوسرے کے مقابلے میں کھڑا کرنے سے۔ سکھ فوج کے خوف سے دو جنگجو اور آزاد مسلم قبائل نے میرے اشارے پر چار سو قلعے جن پر ان کے دیس کی ساری طاقت منحصر تھی، مسمار کر دیے" اور انھیں مسلم قبائل کے خوف سے سکھ فوج نے میرے حکم پر برطانوی حکومت کے لیے ایک قلعہ تعمیر کیا جس کے ذریعے سے اس وادی پر پورا تسلط ہو گیا اس طرح ایک وحشی قوم پُر امن طریقے سے تہذیب کے دائرے میں آگئی اور ایک نیک نیت انگریز نے تین مہینے کے اندر بغیر لڑائی کے وہ فتح حاصل کر لی جو مذہبی دیوانے سکھ تلوار کے زور سے پچیس برس سے حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

تیسرا باب

سڑکیں اور حملے

۱۸۴۹ء میں جب لارڈ ڈلہوزی نے پنجاب کا باقاعدہ الحاق کر لیا تو صوبہ سرحد ایسٹ انڈیا کمپنی کے ماتحت آگیا، اس طرح برطانوی ہند کو پٹھانوں کے کئی آزاد اور جنگ جو قبائل سے براہ راست سابقہ پڑا جو نام نہاد قبائلی علاقے میں رہتے تھے اور سرحدی پالیسی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ ہندوستان اور افغانستان کے تعلقات مختلف زمانوں میں مختلف رنگ اختیار کرتے رہے۔ لیکن ان سب میں دراصل ایک ہی پالیسی مدنظر تھی کہ "حکمراں خاندان کی آزادی کو اس وقت تک برقرار رکھا جائے جب تک وہ انگلستان کا دوست رہے اور اس کی حریف طاقتوں کے مضر اثرات سے محفوظ رہے"۔ حریف طاقتوں سے خاص طور پر روس مراد ہے جس کی وسط ایشیا میں پیش قدمیاں پچھلی صدی کے وسط سے برابر برطانیہ کے لئے پریشانی کا

باعث رہی ہیں۔ پہلے تو "خطرے کی پیش بندی" کی پالیسی اختیار کی گئی اور ۱۸۰۹ء میں مانسٹوارٹ ایلفنسٹن "کابل کے مشن" پر بھیجا گیا۔ اس کے بعد ۱۸۳۲ء میں دست اندازی کی پالیسی" شروع ہوئی جب اے برنس "تجارتی مشن" پر گئے اور ۱۸۳۸ء میں جنرل کین نے افغانستان پہنچ کر ہر دل عزیز بارک زئی سردار دوست محمد کو معزول کرکے اپنے دوست شاہ شجاع کو تخت پر بٹھایا۔ یہیں سے پہلی جنگِ افغان (۱۸۳۹ء تا ۱۸۴۲ء) شروع ہوئی۔ اس کے پہلے دور میں برطانوی حکومت کو شکست ہوئی برطانوی سفیر سر ولیم میک ناٹن اور سر ولیم برنس پولیٹیکل ایجنٹ مارے گئے اور ایک سپاہی کے سوا کابل کی ساری برطانوی فوج کام آئی اس کا بدلہ لینے کے لئے ایک اور فوج بھیجی گئی وہ مار دھاڑ کرتی کابل تک پہنچی اور اس نے شہر کے بڑے بازار کو بارود سے اڑا دیا جو بقول جنرل رابرٹس کے ایک ناقابل معافی وحشیانہ فعل تھا اس طرح برطانیہ کا رعب دوبارہ قائم کرکے یہ فوج ہندوستان واپس آئی اور افغانستان کو اس کے حال پر چھوڑ دیا گیا۔ اس کے بعد سر جان لارنس کی عالمانہ عدم مداخلت کی پالیسی شروع ہوئی۔ ۱۸۶۳ء میں امیر دوست محمد خاں کے مرنے کے بعد جب ان کے دونوں بیٹوں میں تخت کے لئے جنگ شروع ہوئی تو سر جان لارنس نے کسی کا ساتھ نہیں دیا۔ لیکن جب شیر علی اس جنگ میں غالب آیا تو ہندوستان

کی حکومت نے افغانستان سے رشتہ جوڑ لیا اور واکسرائے نے شیر علی کو امیر تسلیم کر لیا۔

۱۸۶۴ء میں روس نے خیوا کی طرف پیش قدمی کی۔ ۱۸۶۵ء میں یارقند پر قبضہ کر لیا۔ ۱۸۶۸ء میں بخارا کو اور ۱۸۷۳ء میں خیوا کو اپنی "باجگذار" ریاست بنا لیا۔ ان سب باتوں کو برطانوی حکومت اپنے مشرقی مقبوضات کے لئے کھلا ہوا خطرہ سمجھتی تھی۔ اس پر طرہ یہ کہ جب لارڈ لٹن نے ایک برطانوی مشن بھیجا کہ کابل کے حکمراں سے دوستی کا باضابطہ معاہدہ کرے تو امیر شیر علی نے اُسے رد کر دیا۔ اس حرکت کو "برطانیہ کے مقاصد سے حقارت آمیز بے پروائی" سمجھا گیا۔ اور جب امیر نے روسی سفیر کی پذیرائی کی تو اُسے ہندوستان کی برطانوی حکومت کے خلاف جنگ کا اقدام" قرار دیا گیا"۔

۱۸۷۶ء میں اس پالیسی کی جگہ سرحد پر قدم جما کر ہندوستان کو بیرونی حملوں سے بچایا جائے "پیش قدمی کی پالیسی" اختیار کی گئی اور وہ یہ تھی کہ برطانیہ کی طرف سے افغانستان یا اس کے ایک حصے پر مستقل قبضہ رکھا جائے یہ پالیسی اس قسم کی تھی جیسے نیپیر کا "پیکادلی" (جابرانہ) طرز عمل سندھ کے امیروں کے ساتھ۔ چنانچہ گلگت میں ایک برطانوی ایجنسی قائم کی گئی اور اس کے بعد اعلان جنگ کر کے کابل پر تین مختلف سمتوں سے حملہ کیا گیا (دوسری

جنگ افغان) کوئٹے پر قبضہ کر لیا گیا۔ اس لیے کہ " اس سے قندھار کا روستہ کھل جائے گا اور دشمن کو جو شمالی دروں سے ہندوستان پر حملہ کرنا چاہیے آگے بڑھ کر گھیر لینے کا موقع ملے گا۔" صلح نامہ گنڈمک (سنہ ۱۸۷۹ء) کی رو سے امیر کابل اس پر راضی ہو گئے کہ کابل میں ایک برطانوی ریزی ڈنٹ کو رکھیں اور شمالی دروں کے علاوہ قندھار کے پرانے صوبوں کا مشرقی حصہ انگریزوں کے حوالے کر دیں۔

سنہ ۱۸۹۳ء میں نیا سرحدی خط "ڈیورنڈ لائن کہلاتا ہے کوہ سلیمان کی سب سے اونچی پہاڑیوں کے ساتھ ساتھ کھینچا گیا جس کی وجہ سے خیبر، مہمند، تیراہ، کرم اور وزیرستان کے قبائل انگریزوں کے حلقۂ اثر میں آ گئے۔ پشاور، نوشہرہ، رسال پور، لنڈی کوتل اور کرم میں مضبوط فوجی چوکیاں قائم کی گئیں تاکہ برطانوی حکومت دروں کو پوری طرح قابو میں رکھ سکے اور آہستہ آہستہ آگے بڑھ کر قبائلی علاقے کو "کھولا گیا" یعنی مزید فوجی چوکیاں محسود علاقے کے قلب میں رزمک، رزمک اور بیراشاہ میں قائم کی گئیں اور ان کو قوت پہنچانے کے لیے موٹر کی فوجی سڑکوں کا ایک جال بچھایا گیا اور جا بجا چھوٹی چھوٹی چوکیاں، مورچے اور قلعے بنائے گئے

سنہ ۱۹۰۱ء میں لارڈ کرزن نے دریائے سندھ کے پار کے پانچ آئینی اضلاع یعنی ہزارہ، پشاور، کوہاٹ، بنوں، ڈیرہ اسمٰعیل خاں اور پانچ ایجنسیوں کو پنجاب سے الگ کر کے

ایک جدا گانہ صوبہ بنا دیا۔ اسی سال لارڈ کرزن نے آئینی ضلاع
میں ایک چیف کمشنر اور اس کی مدد کے لئے ایک جوڈیشنل اور
ایک ریونیو کمشنر مقرر کیا اور انجینیو نیں چیف کمشنر کو ایجنٹ گورنر
جنرل کی حیثیت دی جو براہ راست مرکزی حکومت کے ماتحت
تھا۔ تاکہ پنجاب کی سرحد پر رہنے والے قبائل کے ساتھ بیرونی
تعلقات پر برطانوی حکومت کی نگرانی پہلے سے زیادہ ہو جائے
صوبہ سرحد کو ان سیاسی اصلاحات سے جو ۱۹۱۹ء کی مانٹفرڈ
اسکیم کے ماتحت نافذ کی گئی تھیں الگ رکھا گیا۔

اس کا فوری نتیجہ یہ ہوا کہ سرحد پار کے پانچ ترقی یافتہ
اور آئینی اضلاع میں نظم و نسق کا معیار گر گیا۔ سارے ہندوستان
میں تو اصلاحات کا نفاذ ہوا لیکن صوبہ سرحد چیف کمشنر کی
استبدادی حکومت کے ماتحت رہا۔ اور اوپر سے اس پر ۱۹۰۱ء
کے ضابطۂ جرائم نمبر ۳ کا بوجھ ڈال دیا گیا جس نے شہریوں کو
عدالتی چارہ جوئی کے بنیادی حق سے بھی محروم کر دیا۔ یہ تضاد
اتنا نمایاں تھا کہ ہندو اور مسلمان نیشنلسٹ حلقوں میں سخت بے
چینی پھیل گئی۔ اور انھوں نے یہ مطالبہ کیا کہ اس صوبے کو دوبارہ
پنجاب سے ملا دیا جائے۔ ایک حد تک اسی ایجی ٹیشن کی وجہ سے
۱۹۳۰ء کی دوسری گول میز کانفرنس کے بعد صوبہ سرحد کو ایک
گورنر کے صوبے کا درجہ دے دیا گیا اور اس میں بھی وہی آئین

نافذ کیا گیا جو ہندوستان کے دوسرے صوبوں میں تھا، اس کے علاوہ پانچ ایجنسی اضلاع کو بجٹ کا خسارہ پورا کرنے کے لئے مرکز کی طرف سے ایک ایک کروڑ سالانہ کی امداد ملنے لگی۔

پنجاب کے الحاق سے جو ۱۸۴۹ء میں ہوا تھا ناگوار نتائج پیدا ہوئے جن کی وجہ سے صوبہ سرحد میں امن قائم نہ ہوسکا۔ لارڈ لٹن کے آنے تک (۱۸۷۶ء) بقول ڈیویز کے پنجاب کی سرحد کے بارے میں "عدم مداخلت کا اور اس کے ساتھ کبھی کبھی فوجی مہم بھیجنے کا" طریقہ اختیار کیا گیا مگر در اصل عدم مداخلت کا محض نام ہی نام تھا۔ پنجاب کے الحاق اور ۱۸۵۷ء کے غدر کے درمیانی عرصے میں سب ملا کر سترہ فوجی مہمیں بھیجی گئیں، اسی طرح دوسری جنگ افغان اور ۱۸۹۷ء کی پٹھانوں کی بغاوت کے درمیان سرحدی قبائل پر سولہ بار چڑھائی کی گئی، جولائی ۱۸۹۷ء میں سرحد میں ایک عام شورش برپا ہو گئی۔ قبائلیوں کے بڑے لشکر نے مجنون ملا کی سرکردگی میں جس نے برطانیہ کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیا تھا ملاکنڈ کی پہاڑیوں پر حملہ کر دیا۔ اسی کے ساتھ دریائے کابل کے پار پشاور کی وادی پر بھی قبائلیوں کے ایک ملے جلے لشکر کا حملہ ہوا جس میں خیبر کے آفریدی بھی شامل تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مہمند کے علاقے میں تیرہ کی مہم بھیجی گئی، تاکہ آفریدیوں کو "سزا" دی جائے۔ ان مہموں کے تجربے سے اس خیال کو روز بروز تقویت ہو رہی تھی کہ افغانستان کو

فتح کرنے اور اس پر قبضہ رکھنے میں روپے کا اور جانوں کا بے حد نقصان ہوتا ہے۔ "معقول تدبیر" یہ ہے کہ یہ خرچ دشمن پر ڈالا جائے، چنانچہ پیش قدمی کی پالسی رفتہ رفتہ ترک کردی گئی اور اس کی جگہ پر یہ پالسی اختیار کی گئی کہ افغانستان کی ایک آزاد، مضبوط اور پائدار حکومت کے ساتھ جو سرحد کے آزاد قبائل کی نگرانی برطانوی حکومت کے سپرد کرنے پر تیار ہو، دوستانہ تعلقات قائم کئے جائیں۔ اس پالسی کے مطابق امیر عبدالرحیم کو کابل کے تخت پر بٹھایا گیا اور وہ برطانوی فوج کی مدد سے بہت عرصے تک حکومت کرتا رہا۔ اس درمیان میں اُسے اپنے ملک کی حفاظت کے لئے ایک معقول رقم وظیفے کے طور پر ملتی رہی۔ یہ طریقہ اس کے جانشین امیر حبیب اللہ خاں کے زمانے میں بھی جاری رہا جو ۱۹۱۹ء میں قتل کر دیا گیا۔ لیکن اس "سائنٹیفک" سرحد کی وجہ سے برطانوی حکومت کو سرحد پار کے قبائل سے براہ راست سابقہ پڑا جس سے دوسری قسم کی پیچیدگیاں پیدا ہو گئیں۔ افغانستان کے حکمران فائدے میں رہے کہ ان کے حریف برطانوی حکومت کے سر پڑ گئے۔ عہد نامہ گنڈمک جو افغانستان سے ہوا تھا اور وہ سیاسی مفاہمت جو سرحدی قبائل سے کی گئی تھی اُن کی رو سے برطانوی حکومت نے دروں پر اپنا تسلط قائم کر لیا تھا، اور ہندوستان سے کابل تک دو فوجی سڑکیں اس کے قبضے میں آگئی تھیں اور جن میں سے ایک خیبر سے اور دوسری

ترم سے گذرتی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ برطانوی حکومت کا دخل قبائلی علاقے میں ہوتا گیا جس کی بدولت وہاں پکی سڑکوں اور فوجی ریلوے کی "برکتیں" پہنچ گئیں۔ ان چیزوں میں اور اس علاقے کی سیاسی اور معاشی پستی میں ایک عجیب تضاد محسوس ہوتا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ ان سڑکوں پر مغرب کا ہر مہذب ملک رشک کر سکتا تھا اور فوجی ریلیں خصوصاً وہ جو آئینی اضلاع سے پرے پہاڑوں کے گرد چکر کھاتی اور پہاڑوں کے بیچ سے گذرتی چلی جاتی تھیں فن انجینیری کے کمال کی نشانیاں تھیں۔ لیکن آزاد قبائل ان سے کچھ زیادہ خوش نہیں ہوئے۔ وہ جاہل تو تھے، مگر بے وقوف نہیں تھے۔ وہ ان سڑکوں اور بارکوں کو اپنی غلامی کی نشانیاں اور زنجیریں سمجھتے تھے اور انھیں، برطانوی حکومت کا فوجی مقصد کے ماتحت ایک ایک انچ زمین پر قبضہ کرنا بھی جارحانہ پیش قدمی کی حیثیت سے شاق گذرتا تھا۔ اس کا نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہیے تھا۔ قبائلیوں کی طرف سے حملے ہوتے رہے، اور برطانوی حکومت کی طرف سے تعزیری مہمیں بھیجی جاتی رہیں۔ اس طرح دونوں میں ایک مسلسل اور مستقل "جنگ" شروع ہو گئی۔ بقول میجر راس کیپل قبائل کے تمام مرد، عورت اور بچے اُن لوگوں کو غازی سمجھتے تھے۔ جو بنّوں اور کوہاٹ پر حملے کرتے اور ڈاکے ڈالتے تھے۔ وہ قوم کے مجاہد تصور کیے جاتے تھے۔ ان کو دعائے خیر کے ساتھ رخصت کیا جاتا

تھا اور جب وہ کامیاب و کامران واپس آتے تھے تو بڑی خوشیاں منائی جاتی تھیں۔

اس کی ایک مثال یہ ہے کہ ۱۸۹۳ء تک اور آزاد علاقے کی طرح وزیرستان بھی برطانوی حلقہ اثر سے باہر تھا اور افغانستان کا ایک حصہ سمجھا جاتا تھا۔ ڈیورنڈ معاہدے کی رو سے امیر عبدالرحمٰن خاں اس سے دست کش ہو گئے۔ ۱۸۹۰ء سے پہلے قبائلیوں کی طرف سے حملے بہت ہی کم ہوتے تھے لیکن ڈیورنڈ لائن کی حد بندی کے دوران میں وانا کے مقام پر ایک برطانوی دستے پر حملہ کیا گیا، اور اس کی وجہ سے جنگ شروع ہو گئی۔ (۱۸۹۴ء تا ۱۸۹۵ء) ۱۹۱۲ء سے قبل وزیرستان کے علاقے میں ایک سڑک بھی مکمل نہیں ہوئی تھی۔ ۱۹۱۳ء کی انتظامی رپورٹ کے ساتھ جو نقشہ شائع ہوا اس میں پہلی بار تھال سے اِدک تک جو ٹوچی علاقے میں تھا ایک سڑک دکھائی گئی۔ وزیرستان میں جنگی سڑکوں کی اسکیم عمل میں آ رہی تھی کہ محسود قبیلے نے بغاوت کر دی اور ان کے خلاف فوجی کارروائی کرنی پڑی۔ ۱۹۱۷ء سے ۱۹۲۴ء تک وہ دور تھا جب محسود قبیلے کے خلاف مہم بھیجی گئی اور اس کے علاقے پر قبضہ کیا گیا۔ اسی کے ساتھ سڑکوں کی تعمیر بڑے زور شور سے شروع ہوئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سرحد پار سے سال بھر میں جتنے حملے ہوا کرتے تھے اُن کی تعداد بہت

بڑھ گئی، ذیل کے نقشے سے معلوم ہوگا کہ سڑکوں اور حملوں میں باہم کیا تعلق تھا۔

سنہ ء	حملوں کی تعداد
سنہ ۱۹۱۱-۱۲ء	۷۱
سنہ ۱۹۱۲-۱۳ء	۷۷
سنہ ۱۹۱۳-۱۴ء	۹۳
سنہ ۱۹۱۴-۱۵ء	۱۶۵
سنہ ۱۹۱۵-۱۶ء	۳۴۵
سنہ ۱۹۱۶-۱۷ء	۲۹۲
سنہ ۱۹۱۷-۱۸ء	۲۲۳
سنہ ۱۹۱۸-۱۹ء	۱۸۹
سنہ ۱۹۱۹-۲۰ء	۶۱۱
سنہ ۱۹۲۰-۲۱ء	۳۹۱
سنہ ۱۹۲۱-۲۲ء	۱۹۴
سنہ ۱۹۲۲-۲۳ء	۱۳۱
سنہ ۱۹۲۳-۲۴ء	۶۹

ہندوستان کی برطانوی حکومت کے فوجی محکمے کے لئے یہ صورت حال کچھ زیادہ ناخوش گوار نہیں تھی۔ ہندوستان میں اس بات کے

خلاف عام احتجاج تھا کہ ملک کی آمدنی کا بہت بڑا حصہ یعنی ساٹھ فیصدی تک "فوجی مصارف" میں کھپ جاتا تھا، اس لئے کبھی کبھی جھڑپیں ہو جانے سے اور قبائلی علاقوں میں فوجی مہم بھیجنے سے ان مصارف کے لئے حکومت کو ایک معقول عذر ہاتھ آجاتا تھا۔ لیکن ان حملوں کی زد خاص طور پر صوبہ سرحد کی برطانوی رعایا پر پڑتی تھی، قبائلی برطانوی حکومت میں اور برطانوی ہند کی رعایا میں کوئی فرق نہیں کرتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ یہی لوگ ہمارے دیس پر حملہ کرنے کے لئے اور ہمارے بھائیوں کا خون بہانے کے لئے روپیہ اور آدمی مہیا کرتے ہیں۔ اس لئے وہ انھیں قتل کرنے، لوٹنے اور فدیہ وصول کرنے کے لئے اپنا جائز شکار سمجھتے تھے۔ یہاں مشرقی ملکوں کی یہ مثل صادق آتی ہے۔ "جب فوجیں لڑتی ہیں تو گھاس بچاری مفت میں کچل جاتی ہے"۔

اس سلسلے میں شری بھولا بھائی ڈیسائی نے ۱۹۳۵ء میں مرکزی اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے ایک دفعہ کہا تھا "مہمیں تو فوج رکھنے کا ایک بہانہ ہیں۔ ان کے بغیر چار کروڑ پونڈ کا خرچ حق بجانب ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ جہاں فوج ہو وہاں ہمیشہ اس کے استعمال کا میلان —— بلکہ یوں سمجھئے جواز —— بھی ہوتا ہے جب ہم اپنی حد میں ہوتے ہیں تو اس سے تجاوز کرنا چاہتے ہیں اور جب ایک حصے پر قابض ہو جاتے ہیں تو آگے بڑھ کر کچھ اور لینا چاہتے ہیں

اور یہ سلسلہ یوں ہی چلتا رہتا ہے۔ اصل میں سرحد کی جنگ کو پچھلے تیس، اکتیس سال سے اسلحہ کا ذخیرہ جمع کرنے کا بہانہ بنایا گیا ہے اور اس طرح ہمارے ملک کی غریب جنتا کا خون چوسا گیا ہے۔"

موقع پرست لوگ، رشوتوں، تعزیری مہموں اور دس میل ریل یا سڑک بنانے میں اس سے کہیں زیادہ روپیہ صرف کر دیتے تھے، جتنا اسکول، ڈاک خانے، اسپتال اور دوسری آسائشوں کے مہیا کرنے میں صرف ہوتا جن کی سرحد پار کے لوگوں کو سخت ضرورت تھی اور جنھیں وہ دوستی کی نشانی سمجھ کر خوشی اور احسان مندی کے ساتھ قبول کرتے۔ ۱۸۴۹ء سے ۱۸۹۱ء تک فوجی مہموں کے بھیجنے پر تیرہ کروڑ روپیہ صرف ہوا۔ مرکز کی سرحدی پالیسی کی وجہ سے جو مستقل مالی ذمہ داریاں اٹھانی پڑتی تھیں۔ ان میں ذیل کی رقمیں شامل تھیں۔

(۱) ایک کروڑ چوّن لاکھ روپیہ ہر سال محکمۂ خارجہ کے ذریعے سے صرف ہوتا تھا۔

(۲) فوجی ریلوے کو دو کروڑ سالانہ کا خسارہ ہوتا تھا۔

(۳) اس علاقے میں فوج کو رکھنے اور مورچہ بندی کرنے کا خرچ دس گیارہ کروڑ کے قریب تھا۔

(۴) تعزیری مہموں کے خوفناک فوجی کھیل پر جو قریب قریب ہر سال کھیلا جاتا تھا یا بڑی اور چھوٹی لڑائیوں پر جو جنگ چترال

کے بعد چالیس سال کے اندر ہوئیں، اوسط خرچ دو کروڑ سالانہ سے کم نہ تھا۔ ایک بیان کے مطابق جو ہندوستان کی مرکزی اسمبلی میں دیا گیا تھا اس وقت سے جب برطانوی حکومت نے پنجاب کو سکھوں سے چھینا، نوے سال کے اندر (۱۸۹۹ء تا ۱۹۳۸ء) کل خرچ چار ارب کے قریب ہوا۔

یہ سلسلہ ستر سال سے زیادہ جاری رہا۔ ان بے شمار مہموں کا جنہیں سر مائیکل اوڈوائر نے "آتش زنی اور غارت گری کے واقعات" کہا ہے، نتیجہ قریب قریب صفر تھا۔ ایک اور موقع پر سر مائیکل نے کہا تھا "ان سے قبائلی کچھ عرصہ کے لئے دب جاتے تھے لیکن پھر وہی پہلی سی بدامنی کی حالت پیدا ہو جاتی تھی"۔

چوتھا باب

ایک عجیب و غریب منظر

سنہ ۲۰-۱۹۱۹ء میں ہندوستان کی تاریخ میں ایک نئے باب کا آغاز ہوا۔ ستیہ گرہ کی تحریک بہت بڑے پیمانے پر شروع ہوئی۔ پہلی عالمگیر جنگ میں ہندوستان نے اپنے بدیسی حکمرانوں کی پریشانی سے فائدہ اٹھانے کے بجائے ان کے ساتھ جنگ میں تعاون کرنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن جنگ کے ختم ہونے کے بعد اس کے حصے میں آزادی کے بجائے رولٹ ایکٹ آیا جس کا مقصد بظاہر یہ تھا کہ باغیانہ جرائم کا انسداد کرے مگر اصل میں یہ شہری حقوق کو بے دردی سے کچلنے کی ایک ایسی تدبیر تھی جو ہندوستان میں اس سے پہلے کبھی دیکھنے میں نہ آئی تھی۔ اس کی بدولت گاندھی جی جنھیں اب تک برطانوی سلطنت کی "نہایت وفادار رعایا" ہونے پر فخر تھا اقراری باغی اور ہندوستان کی برطانوی حکومت کے کھلے ہوئے باغی بن گئے۔ انھوں نے اس کے خلاف سارے ملک میں ستیہ گرہ کی تحریک شروع کر دی۔ حکومت نے اس کے جواب میں پنجاب میں مارشل لا نافذ کر دیا جس کی تان امرت سر

میں جنرل ڈائر کے ہاتھوں ہندوستانیوں کے قتل عام پر لوٹی۔ اس لئے وہ تحریک جو رولٹ ایکٹ کے خلاف شروع ہوئی تھی کچھ دن بعد زیادہ وسیع ہو کر بے تشدد ترک موالات کی تحریک بن گئی۔ یہ تحریک گاندھی جی کی قیادت میں ان وحشیانہ مظالم کی دادخواہی کے لیے جو پنجاب میں مارشل لا کے سلسلے میں ہوئے تھے اور اس بے انصافی کی تلافی کے لیے جو خلافت کو ختم کرکے اور ہندوستان کو اس کے پیدائشی حق یعنی سوراج سے محروم کرکے کی گئی تھی، شروع ہوئی۔ اس وقت ایک عجیب معجزہ دیکھنے میں آیا ہندو اور مسلمان جنھیں برطانوی حکومت کی "لڑاؤ اور حکومت کرو" کی پالسی نے ایک مدت تک الگ کر رکھا تھا، اس پر تل گئے کہ آپس کے جھگڑوں کو بھول کر ایک ہو جائیں ظاہر ہے کہ اس سے برطانوی سامراجی جن کو دن رات یہ فکر رہتی تھی کہ ان دونوں کو ٹکرا کر ہندوستان کو دائمی طور پر "برطانوی حکومت کے لیے محفوظ" بنا دیں۔ اب تک ان کی یہ پالسی رہی تھی کہ صوبۂ سرحد کو روسی خطرے کے خلاف ایک مورچہ بنائیں۔ مگر اب انھوں نے یہ سوچا کہ اسے ہندوستان کی اندرونی اور بیرونی مصلحتوں کے نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ مسلمان کی اکثریت کے صوبے کی حیثیت سے ترقی دیں تاکہ ہندو اکثریت کے صوبوں کا توڑ ہو سکے اور ہندوستانی قومیت کے سیلاب کے لئے پشتے کا کام دے سکے۔ اس مقصد کو سامنے رکھ کر چیف کمشنر

اور پولیٹیکل سروس کے کل ذمہ دار افسروں کو ہدایت کی گئی کہ ان اضلاع کے باشندوں کے مقابلے میں جن پر براہِ راست حکومت کی جاتی تھی۔ قبائلیوں کی دل جوئی کو ترجیح دی جائے۔

۲۰-۱۹۱۹ء میں ترک موالات کی تحریک سارے ہندوستان کی طرح صوبہ سرحد میں بھی پھیل گئی۔ اس کے بعد وہ دور آیا کہ فرقہ وارانہ فسادات بہت بڑے پیمانے پر اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس کا کافی ثبوت ملتا ہے کہ بعض صورتوں میں حکام نے اور ان کے ایجنٹوں یعنی مقامی افسروں نے اگر قصداً نہیں کرائے تو انھیں شہ ضرور دی۔ صوبہ سرحد کے سب سے بڑے فساد ۱۹۲۴ء میں کوہاٹ اور ۱۹۲۷ء میں ڈیرہ اسماعیل خاں میں ہوئے۔ لیکن باوجود فرقہ واریت کے زہر کے جو برطانوی حکومت کی پالیسی نے پھیلایا تھا ۱۹۳۰ء میں سرحد میں عوام کی ایک بہت بڑی تحریک اٹھ کھڑی ہوئی۔ اب ایک عجیب و غریب منظر نمودار ہوا یعنی بے تشدد پٹھان۔

۱۹۳۰ء میں نمک کی ستیہ گرہ کے سلسلے میں صوبۂ سرحد کے پٹھانوں نے ہزاروں کی تعداد میں عدالتوں اور بدیسی کپڑے اور شراب کی دوکانوں کی پُر امن پکٹینگ کی۔ سرحد کے حکام نے جو اپنے مقاصد کے لیے بے تشدد پٹھان کو مسلح پٹھان سے کہیں زیادہ خطرناک سمجھتے تھے اس تحریک کو کچلنے میں کسی قسم کی سختی اٹھا نہیں رکھی ۲۳ر اپریل کو لیڈروں کی گرفتاری کے بعد پشاور میں پٹھانوں کے

ایک پُر امن مجمع پر جس میں ہندو اور سکھ بھی شامل تھے، گولی چلائی۔ اس الم ناک واقعہ کی تفصیل کے لیے شری وی۔ جے۔ پٹیل کی پشاور فائرنگ کی تحقیقاتی رپورٹ (۱۹۳۰ء[1]) کو پڑھنا چاہیئے جسے برطانوی حکومت نے اس زمانے میں ممنوع قرار دیا تھا۔

---

[1] ذیل میں ایک رپورٹ کے کچھ اقتباسات نقل کئے جاتے ہیں یہ رپورٹ پنجاب کے ایک ذمہ دار مسلم لیڈر نے بھیجی تھی اور اسی زمانے میں ینگ انڈیا میں شائع ہوئی تھی :-

"انگریز سپاہیوں کا ایک دستہ..... پشاور پہنچا اور اس نے بغیر پہلے سے متنبہ کئے ہوئے مجمع پر جس میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے فیر کرنا شروع کر دیا..... جب اگلی صف والے گر گئے تو پیچھے والے سینہ کھولے ہوئے گولی کھانے کو تیار آگے بڑھ گئے...... بعض کے اکیس اکیس گولیاں لگیں ...... سب کے قدم جمے رہے۔ گھبراہٹ اور بھگدڑ کا نام تک نہ تھا۔ ایک کم سن سکھ لڑکا ایک گورے کے سامنے آکر کہنے لگا کہ مجھے گولی ماردو۔ گورے نے بے تامل فیر کر دیا اور لڑکا وہیں ڈھیر ہو گیا۔ ایک بوڑھی عورت نے اپنے عزیزوں اور دوستوں کو زخمی ہوتے ہوئے دیکھا تو آگے بڑھی اور گولی کھا کر گر گئی۔ ایک پیر مرد جس کے کندھے پر چار سال کا ایک بچہ سوار تھا اس وحشیانہ قتل عام کو برداشت نہ کرسکا اور آگے بڑھ کر گوروں سے التجا کرنے لگا کہ مجھے بھی اڑا دو۔ اس کی فرمائش پوری ہوئی اور وہ بھی گولی کا نشانہ بنایا گیا.... لوگ

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ہے)

ہر شخص جسے پٹھان سے ذرا سی بھی واقفیت تھی حیرت میں رہ گیا۔ رائل گڑھوال رائفلز کے جنگ آزمودہ گڑھوالی سپاہیوں کی دو پلٹنیں اس نظارے سے اس قدر متاثر ہوئیں کہ انھوں نے گولی چلانے کے حکم کی تعمیل سے انکار کر دیا۔ ان کو کورٹ مارشل کر کے دس سے چودہ سال تک قید کی سزائیں دی گئیں۔ جب گاندھی اروِن معاہدہ ہوا تو عام معافی کی دفعہ ان پر عائد نہیں کی گئی اور انھیں اپنی پوری سزائیں بھگتنی پڑیں ان میں سے ایک اپنی میعاد ختم ہونے کے بعد گاندھی جی کے پاس آیا اور کچھ عرصے تک ان کے آشرم کے ایک کُن کی

(صفحہ ۷۶ کا بقیہ حاشیہ)

ایک ایک کر کے آگے بڑھ رہے تھے اور گولیوں کی باڑھ کا سامنا کر رہے تھے۔ جب وہ زخمی ہو کر گر تے تھے تو انھیں پیچھے گھسیٹ لیا جاتا تھا اور دوسرے ان کی جگہ لے لیتے تھے ......"

ایک خاصے سینیر افسر نے اس واقعہ کا ذکر انڈین ڈیلی میل کے کالموں میں جس کا ایڈیٹر انگریز تھا ان الفاظ میں کیا ہے :-

"میں دعوے سے کہتا ہوں کہ اخباروں میں جتنی دیر گولی چلنے کا ذکر کیا گیا ہے اس سے کہیں زیادہ دیر تک چلتی رہی۔ ہم نے ان کم بختوں کو ایسا سبق دیا کہ یاد ہی تو کریں گے ...... ہمارے آدمی کھڑے دناد ن گولیاں چلا رہے تھے اور شورش پسندوں اور ان کے لیڈروں کو جن کی طرف پولس اشارہ کرتی تھی مار کر گرا رہے تھے۔ محض چند گولیاں نہیں چلیں بلکہ مسلسل گولی باری کی گئی؟

حیثیت سے رہا۔

وہ جس نے پٹھانوں میں یہ حیرت انگیز کایا پلٹ کردی خان عبدالغفار خاں تھا جو اپنے صوبے میں بادشاہ خان کے نام سے مشہور تھا۔ خان عبدالغفار خاں اور ان کے بڑے بھائی ڈاکٹر خاں صاحب نے ۳۰-۱۹۲۹ء میں خدائی خدمت گار تحریک شروع کی تھی۔ چارلی اینڈریوز کے الفاظ میں "وہ اپنے مزاج اور چال ڈھال کے لحاظ سے سچ مچ بادشاہ ہے۔ وہ خود اہنسا کا پابند ہے اپنے پیرؤوں کو بھی اس کی تاکید کرتا ہے اور مہاتما گاندھی کی ہدایتوں پر حرف بہ حرف عمل کرتا ہے"۔ ان کی زندگی کی روداد ایک کہانی یا رومان معلوم ہوتی ہے وہ سنہ ۱۸۹۰ء میں محمد زئی قبیلے کے دولت مند خوانین کے خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد بہرام خاں تحصیل چارسدہ ضلع پشاور کے ایک گاؤں اُتمان زئی کے سب سے بڑے خان تھے۔ عبدالغفار خاں نے ایڈورڈ مشن ہائی اسکول میں تعلیم پائی لیکن وہ میٹرک کے امتحان میں فیل ہوگئے اور گھر پر رہنے لگے بخلاف اس کے ان کے بڑے بھائی ڈاکٹر خاں صاحب طب کی اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلستان گئے اور پہلی جنگ عظیم میں طبی خدمات انجام دینے کے بعد آئی۔ ایم۔ ایس کے رکن ہوکر ہندوستان واپس آئے۔ بادشاہ خاں کو بھی کچھ عرصے تک یہ شوق رہا کہ فوج میں داخل ہوکر ایک سپاہی کی حیثیت سے امتیاز حاصل کریں لیکن قدرت نے انھیں اس سے محفوظ رکھا۔ اس لئے کہ

جب وہ اپنے ایک دوست سے جو فوج میں افسر تھے، ملنے کے لیے گئے تو ان کی آنکھوں نے یہ ناگوار منظر دیکھا کہ ایک کم تر درجے کے برطانوی افسر نے ان کے دوست کی سخت توہین کی۔ کچھ عرصے کے بعد وہ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں داخل ہوئے لیکن ان کے والد نے انھیں واپس بلا لیا اور انھیں انجنیری کی تعلیم کے لیے انگلستان بھیجنا چاہا سارے انتظامات ہو چکے تھے یہاں تک کہ بی اینڈ ریو کے ایک جہاز میں ان کا ٹکٹ بھی خرید لیا گیا تھا۔ مگر ماں کی محبت انجنیری کے شوق پر غالب آگئی۔ جب وہ رخصت ہونے کے لیے گئے تو وہ سسکیاں لے کر کہنے لگیں "میرا ایک بیٹا تو پہلے ہی مجھ سے جدا ہو چکا ہے اگر تم بھی چلے گئے تو میں کیا کروں گی"۔ بیٹے کا دل ہل گیا اور اس نے یورپ جا کر تعلیم پانے کا خیال چھوڑ دیا۔ گاندھی جی کو تو ماں کی محبت نے تین چیزوں یعنی شراب، عورت اور گوشت سے پرہیز کرنے کا عہد لے کر عمر بھر کی تپسیا کی راہ پر ڈال دیا تھا مگر بادشاہ خان سے جنھیں ان کے دوست پیار سے سرحدی گاندھی کہتے ہیں دنیاوی جاہ پسندی چھڑا دی اور انھیں بقول سرحد کے عوام کے ایک فقیر بنا دیا۔ جس نے اپنی زندگی ایثار، قربانی اور خلق خدا خصوصاً غریبوں کی خدمت کے لئے وقف کر دی۔ دونوں نے جس راہ میں قدم رکھا تھا اُس سے کبھی پیچھے نہیں ہٹے۔ دونوں سینہ تانے ہوئے اپنے اپنے انداز میں اس منزل کی طرف بڑھتے چلے گئے جو تقدیر نے ان کے لئے معین کی تھی۔

۱۹۱۱ء میں حاجی صاحب ترنگ زئی کے ساتھ جنھیں اپنے حب وطن کی بدولت گھر چھوڑ کر قبائلی علاقے میں جلا وطنی کی زندگی بسر کرنی پڑی، بادشاہ خاں نے اپنے صوبے میں کئی نیشنل اسکول قائم کیے۔ اس زمانے میں راسخ العقیدہ مُلّا سرکاری اسکولوں کے خلاف ایجی ٹیشن کر رہے تھے لیکن وہ تعلیم کی کوئی دوسری راہ نہیں بتاتے تھے۔ بادشاہ خاں نے اس ایجی ٹیشن کو تخریبی رنگ کے بجائے تعمیری رنگ دے دیا۔ ان کے اپنے پرانے ایڈورڈ مشن کے پرنسپل پادری وگرام کی مثال نے ان کے دل میں یہ حوصلہ پیدا کیا کہ اپنے آپ کو قوم کی خدمت کے لیے وقف کر دیں۔

بادشاہ خاں نے اپنے قول کے مطابق دین داری کا جذبہ اپنی ماں سے ورثے میں پایا تھا اور اپنے باپ سے انھیں عدم تشدد کا فطری رجحان ملا تھا۔ دونوں ان پڑھ تھے اور انھیں جسمانی دنیا سے زیادہ روحانی دنیا سے لگاؤ تھا۔ "میری والدہ اکثر نماز کے بعد خاموش مراقبے میں بیٹھی رہتی تھیں۔ میرے والد کے دوست تو بہت تھے مگر ساری عمر ان کی کسی سے دشمنی نہیں ہوئی ...... ان میں انتقام کا مادہ بالکل نہیں تھا اور ان کا خیال تھا کہ دھوکا کھانا کوئی شرم کی بات نہیں البتہ دھوکا دینا ضرور شرمناک ہے۔ وہ اپنی بات کے پکے تھے اور ان کی سچائی کا یہ حال تھا کہ دشمن بھی ان پر شبہ کرنے یا ان کی تردید کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے" سرحد کے لوگ ان کے قول کو

دستاویز سے کم نہیں سمجھتے تھے۔ بادشاہ خاں بیان کرتے ہیں کہ دیگر دہ در گروہ آکر اپنا پس انداز کیا ہوا روپیہ ان کے پاس امانت رکھاتے تھے اور رسید تک نہیں مانگتے تھے۔ وہ حکام کی درباداری کے قائل نہیں تھے، اس کے باوجود بڑے بڑے برطانوی حکام انھیں چھاتے تھے، اور انھیں ناراض کرنے کی جرأت نہیں کرتے تھے۔"

حاجی ترنگ زئی کے چلے جانے کے بعد بادشاہ خاں نے ہمند اور باجوڑ کے علاقے کا دورہ کیا۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ وہ قبائلیوں میں رہ کر اپنا مشن پورا کر سکتے ہیں یا نہیں۔ وہ کئی دن تک روزہ رکھتے رہے اور دعائیں مانگتے رہے لیکن کوئی فیصلہ نہ کر سکے آخر انھوں نے پھر عوام کی تعلیم اور ترقی کا پرانا شغل شروع کر دیا۔ جب رولٹ ایکٹ کے خلاف ایجی ٹیشن شروع ہوا تو بادشاہ خاں دل وجان سے اس میں شریک ہو گئے وہ فوراً گرفتار کر لیے گئے۔ ۶ اپریل ۱۹۱۹ء کو اتمان زئی میں ایک لاکھ آدمیوں کا جلسہ ہوا جس میں بادشاہ خاں کے بوڑھے باپ بھی شریک تھے بادشاہ خاں کی گرفتاری کے بعد پولیس کا افسر ایک جرگے کے ساتھ ان کے والد کے پاس آیا اور انھیں یہ دھمکی دی کہ بادشاہ خاں کو گولی مار دی جائے گی۔ پھر اس نے ان کو بھی گرفتار کر لیا۔ جب بادشاہ خاں جرگے کے سامنے پیش ہوئے تو ان سے پوچھا گیا کہ کیا تم پٹھانوں کے

بادشاہ خاں نے کہا "میں نے کہا یہ تو میں نہیں جانتا مگر میں اتنا جانتا ہوں کہ میں قوم کا خادم ہوں اور اس قانون درولٹ ایکٹ، کو چپ چاپ برداشت نہیں کر سکتا .... پھر مقدمے کی کارروائی شروع ہوئی .... ججوں نے طرح طرح کی دھمکیاں دیں اور جھوٹی دلیلوں سے کام لیا .... مگر مجھ پر کچھ اثر نہ ہوا"

اس طرح باپ بیٹے دونوں کی سیاسی گرہ کی بسم اللہ ہوئی۔ مجھے ہتھکڑیاں پہنا کر جیل لے گئے۔ اور جب تک میں قید رہا میرے پاؤں میں بیڑیاں پڑی رہیں۔ ان دنوں میرا جسم اب سے دگنا تھا اور میرا وزن دو سو چھ پونڈ تھا .... کوئی بیڑیاں میرے پاؤں میں نہیں آتی تھیں .... بیڑیوں کے تلاش کرنے میں بڑی مشکل پیش آئی اور جب وہ مجھے پہنائی گئیں تو ٹخنوں کے اوپر کا حصہ چھل گیا، اور بہت سا خون بہا .... افسروں نے اس کی کوئی پروا نہیں کی اور یہ کہا کہ تھوڑے دن میں تمھیں اس کی عادت ہو جائے گی۔

خان بہرام خاں تین مہینے بعد چھوٹ گئے اور بادشاہ خاں بھی چھ مہینے سے زیادہ قید نہیں رہے۔ اس لئے کہ اس زمانے کے چیف کمشنر سر روس کیپل کی یہ پالیسی تھی کہ پٹھانوں کی "تالیف قلوب" کی جائے۔

اس اثنا میں بڑے بھائی ڈاکٹر خان صاحب نے سنٹ ٹامس ہاسپٹل سے ایم آر سی ایس (لندن) کی ڈگری لی اور جنگی خدمت کے لیے فرانس چلے گئے۔ انھیں کچھ خبر نہ تھی کہ اُن کے چھوٹے بھائی اور والد پر کیا گزر رہی ہے۔ ہندوستان سے کوئی خط ان تک نہیں پہنچنے دیا گیا۔ سن ۱۹۲۰ء میں جب وہ ہندوستان واپس آئے تو انھوں نے اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔

بادشاہ خاں سن ۱۹۲۰ء میں کانگریس کے اجلاس ناگ پور میں شریک ہوئے، اور انھوں نے خلافت کی تحریک میں نمایاں حصہ لیا۔ اُن کی سرکردگی میں مہاجرین کی ایک بڑی جماعت تحریک خلافت کے سلسلے میں احتجاج کے طور پر ہجرت کرکے کابل کی طرف روانہ ہوئی۔ ان غریبوں کو آتے جاتے بڑی سخت مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ بوڑھے بہرام خاں بھی جن کی عمر اب نوّے سال کے قریب تھی، جانے پر تیار تھے مگر انھیں بڑی مشکل سے سمجھا بجھا کر روکا گیا۔

۱۹۲۱ء میں برطانوی حکام نے بادشاہ خاں کو محض قومی اسکول کھولنے کے جرم میں گرفتار کرلیا۔ "آزاد مدرسے" اس قدر مقبول تھے کہ ملا کنڈ، باجوڑ اور سوات کے علاقوں سے بھی قبائلی اپنے بچوں کو ان میں پڑھنے کے لئے بھیجتے تھے، اور یہ حکام کی نظر میں بڑی خطرناک چیز تھی۔

سر جان میفی چیف کمشنر نے بادشاہ خاں کے والد کے

کہا تمھارے بیٹے کو کیا ضرورت ہے کہ وہ مدرسہ کھولے جب کہ کسی اور شخص کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ باپ نے بیٹے کو سمجھانے کی کوشش کی۔ بیٹے نے جواب دیا "ابا جان فرض کیجیے کہ دوسرے لوگوں کو نماز سے دلچسپی نہ رہے تو کیا آپ یہ کہیں گے کہ تم نماز ترک کر دو یا کہیں گے کہ چاہے جو ہو تم اپنا فرض پورا کرتے رہو۔"

باپ نے کہا "ہرگز نہیں، دوسرے کچھ بھی کریں، میں یہ کبھی نہ چاہوں گا کہ تم اپنے مذہبی فرض کو چھوڑ دو۔"

"تو پھر ابا جان قومی تعلیم کا کام بھی اسی قسم کا ہے، اگر میں نماز چھوڑ دوں تو مدرسے کو بھی چھوڑ سکتا ہوں۔"

باپ نے جواب دیا "اچھا میں سمجھ گیا تم حق بجانب ہو۔"

اس بار بادشاہ خاں کو تین سال قید سخت کی سزا دی گئی اور انھیں جیل کی ساری کڑیاں جھیلنی پڑیں ——— قید تنہائی، بھدے لباس، بیڑیاں پہننا، چکی پیسنا وغیرہ۔ ان کا وزن پچیس پونڈ کم ہو گیا، اور جیل کی سختیوں کی وجہ سے انھیں فاسد خون اور کمر کے درد اور دوسری طرح طرح کی شکایتیں نازل ہو گئیں۔ اس کے باوجود ان کا طرز عمل ایک مثالی قیدی کا سا رہا۔ وہ ہنسی خوشی جیل کے ضابطوں کی پابندی کرتے تھے۔ کبھی کوئی رعایت نہیں چاہتے تھے مگر کبھی اپنے اصول سے نہیں ہٹتے تھے۔ جیل کے افسروں تک

پر اس با اصول نامور قیدی کی تکلیفیں دیکھ کر بہت اثر ہوا۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ قاعدے کے مطابق جو سختیاں ہونی چاہئیں انھیں ڈھیلا کر دیں مگر بادشاہ خاں نے یہ درخواست کی کہ انھیں ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ انھوں نے جیل کی بد عنوانیوں کے خلاف جہاد شروع کر دیا۔ ان کے افسر سے ایک کانسٹبل نے یہ کہہ کر استعفیٰ دے دیا کہ وہ بغیر رشوت لیے ہوئے اپنا گذارہ نہیں کر سکتا۔ جیل کے افسر گھبرائے اور انھوں نے بادشاہ خاں کو یہاں سے منتقل کر کے پنجاب کے گجرات جیل میں بھیج دیا۔ یہاں اُن کی دیانت داری اور جیل کے ضابطوں کی پابندی دوسرے قیدیوں کے لیے ایک مصیبت ہو گئی۔ مگر وہ چٹان کی طرح اپنی جگہ پر قائم رہے۔ اس لئے کہ وہ ایک اور مشہور قیدی ٹام کلارک کی طرح اس کے قائل تھے کہ "اگر آدمی اپنے اصول سے ہٹے تو نہ صرف حق کی بلکہ اپنی خودداری کی توہین کرتا ہے"۔ جو سول نافرمانی کرنے والے کی سب سے بیش بہا دولت ہے۔

گجرات کے جیل میں منتقل ہونے کے بعد انھیں ایک زیادہ وسیع حلقے میں رہنے اور دوسرے مذہبوں کی مقدس کتابوں کے مطالعے کا موقع ملا۔ خصوصاً بھگوت گیتا اور سکھوں کی گرنتھ صاحب کے مطالعے کا۔ باہمی مفاہمت کی غرض سے انھوں نے اپنے ہندو ساتھیوں کے مشورے سے یہ تجویز پیش کی کہ گیتا اور قرآن کے

سبق ہوا کریں۔ یہ سبق کچھ دن تک ہوتے رہے لیکن آخر میں انھیں بند کرنا پڑا" اس لیے کہ گیتا کے سبق میں میرے سوا اور کوئی شریک نہیں ہوتا تھا اور اسی طرح قرآن کے سبق میں بھی صرف ایک ہی طالب علم تھا "

بہ خلاف ڈاکٹر خاں صاحب کے جو اکثر مذاق میں یہ کہا کرتے تھے کہ میرا بھائی میرے بدلے کی نماز بھی پڑھ لیتا ہے " بادشاہ خاں نے کبھی نماز یا روزہ قضا نہیں کیا۔ مگر اسی کے ساتھ ان کی نظر میں بڑی وسعت تھی۔ انھوں نے ایک بار مہا دیو ڈیسائی سے کہا تھا " میں کسی مذہب کی قوت کا اندازہ اس کے پیرووں کی تعداد سے نہیں لگاتا ہوں اس لئے کہ عقیدہ بجائے خود کوئی چیز نہیں۔ جب تک وہ انسان کی زندگی میں نہ ظاہر ہو۔ میرا یہ ایمان ہے کہ اسلام عمل، یقین اور محبت کا نام ہے اور ان صفات کے بغیر مسلمان کا لفظ محض باجے کی ایک جھنکار ہے جس کے کوئی معنی نہیں۔ قرآن شریف میں صاف صاف آیا ہے کہ خدا کو وحدہٗ لاشریک ماننا اور نیک عمل کرنا انسان کی نجات کے لئے کافی ہے "

ایک اور موقع پر انھوں نے کہا تھا " میرے خیال میں ہمارے جھگڑوں کی جڑ یہ ہے کہ ہم اس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ ہر مذہب میں اس کے پیرووں کے لئے کافی ہدایت موجود ہے۔ قرآن میں صریحی طور پر کہا گیا ہے کہ خدا نے سب قوموں کے لئے ہدایت

کرنے والے بھیجے اور وہی ان کے پیمبر ہیں۔ در اصل سب اہل کتاب ہیں .... بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ سب مذہبوں کی بنیادی اصول ایک ہی ہیں۔ اگرچہ ان کی فروعات میں فرق ہوگیا ہے اس لیے کہ ہر مذہب اس زمین کے رنگ میں رنگ گیا جہاں وہ پیدا ہوا تھا۔"

سنہ ۱۹۲۴ء اور سنہ ۱۹۲۹ء کے بیچ کا زمانہ تحریک آزادی کے لیے بڑی کش مکش کا وقت تھا۔ فرقہ وارانہ جذبات بھڑکے ہوئے تھے اور بہت سے لوگوں نے اپنا ذہنی توازن کھو دیا تھا۔ لیکن خان بھائی اس رو میں نہیں بہے اور ان کے قدموں کو کبھی لرزش نہیں ہوئی۔ بادشاہ خان ان تھک کوشش کرتے رہے اور انھوں نے پا پیادہ بڑے لمبے اور کٹھن سفر کرکے دیہات اور پہاڑی قلعوں میں قبائلیوں کو حق اور عدم تشدد کا پیام پہنچایا، اور بے ہتھیاروں کی لڑائی کا طریقہ، جو گاندھی جی نے پیش کیا تھا، سکھایا۔ اس کے بعد جب سنہ ۱۹۳۰ء کی کش مکش شروع ہوئی تو وہ اپنے بھائی کے ساتھ میدان میں اُتر آئے لیکن تعجب یہ ہے کہ اب تک اُن کی گاندھی جی سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ سنہ ۱۹۳۱ء کے اجلاس کراچی میں وہ اور اُن کے خدائی خدمت گاروں کی شہرت پہلے ہی دور دور پہنچ چکی تھی۔ پہلے پہل گاندھی جی سے اور ان کے ساتھیوں سے جو ہندوستان کے دوسرے حصوں میں کام کر رہے تھے، ملے۔

خدائی خدمت گاروں کی تحریک اصل میں ایک معاشرتی اصلاح کی تحریک تھی، اور اس کا مقصد یہ تھا کہ پٹھانوں کی اور بے آئینی لوٹ مار کی عادت چھڑائی جائے۔ ان کو محنت، کفایت شعاری اور خود اعتمادی کا سبق پڑھایا جائے۔ انھیں باقاعدہ تعلیم دی جائے اپنی عزت کرنا اور خدا سے ڈرنا "جو غرور کو دل سے دور کر دیتا ہے" سکھایا جائے۔ آگے چل کر ۱۹۳۱ء میں بادشاہ خان نے یہ فیصلہ کیا کہ اپنے والنٹروں کی چھوٹی سی جماعت کو ایک باضابطہ سیاسی جماعت بنا دیں تاکہ وہ کانگریس کے پورے پروگرام پر عمل کرے خدائی خدمت گاروں کا نصب العین، جیسا کہ ان کے نام سے ظاہر خلق خدا کی خدمت کے ذریعے سے خدا کی خدمت کرنا تھا۔ ان کو باقاعدہ ڈرل کرائی جاتی تھی اور فوجی طرز سے لمبے لمبے مارچ کرائے جاتے تھے۔ ان کے پاس کوئی ہتھیار یہاں تک کہ لاٹھی اور چھڑی تک نہ ہوتی تھی۔ وہ خدا کی ملت اور وطن کی وفاداری کا حلف اٹھاتے تھے۔ وہ سب کے سب اس کے پابند تھے کہ خیال، قول اور عمل میں عدم تشدد سے کام لیں گے، اور اپنے ہم جنسوں کی بغیر کسی ذاتی صلے کی توقع کے خدمت کریں گے۔ انھوں نے یہ عہد کیا تھا کہ پاک بازی کی زندگی بسر کریں گے اور فرقہ پرستی سے دور رہیں گے۔ سرخ رنگ کے کرتے پہننا انھوں نے اس غرض سے اختیار کیا تھا کہ کھادی کے سفید کرتے بہت جلدی میلے ہو جاتے تھے

اور صوفیانہ سرخ رنگ پشاور کے آس پاس آسانی سے دستیاب ہوتا تھا (اپریل ۱۹۳۰ء تک خدائی خدمت گاروں کی تعداد پانسو سے زیادہ نہیں تھی۔ ۱۹۳۸ء میں یہ تعداد ایک لاکھ سے بڑھ گئی!)

گاندھی ارون معاہدے کے نتیجے کے طور پر جنوری ۱۹۳۱ء میں خان بھائی رہا کر دیئے گئے لیکن انھیں زیادہ دن تک آزاد رہنا نصیب نہ ہوا۔ خدائی خدمت گاروں کی یہ خصوصیت ہے کہ انھوں نے گاندھی ارون صلح کو اپنی فتح نہیں سمجھا۔ ڈاکٹر خان صاحب نے شری مہادیو ڈیسائی سے ذکر کیا تھا کہ ایک بار کرنٹ کے مشہور سر رابرٹ سینڈیمن کے بیٹے کرنل سینڈیمن اپنے گارڈ دستے کے ساتھ پشاور آئے اور ان کے انداز سے یہ ظاہر ہوا کہ وہ اس صلح سے بہت ناخوش ہیں اور دوسرے برطانوی افسروں کا بھی یہی خیال ہے۔ ڈاکٹر خان صاحب جو پیدائشی اسپورٹس مین ہیں اور اپنے کالج میں کرکٹ کے کپتان تھے، کرکٹ کی روایات کو کبھی نہیں بھولے انھوں نے اُن کی تسکین دیتے ہوئے کہا "نہیں کرنل سینڈیمن آپ اس خیال کو دل سے بالکل نکال دیجئے کہ آپ کو شکست ہوئی ہے۔ سیاسی زندگی ایک کھیل ہے جس میں غالب اور مغلوب کو اسی طرح تپاک سے ہاتھ ملانا چاہیئے جیسے کرکٹ یا فٹ بال میں۔ اور ہمارے آپ کے معاملے میں تو فتح شکست کا کوئی سوال ہی نہیں کشتی برابر کی چھوٹی ہے۔ نہ کوئی غالب ہے اور نہ مغلوب جب دونوں ایک

دوسرے سے رخصت ہونے لگے تو کرنل نے کہا "خیر ہمارے آپ کے پرانے تعلقات ہیں مجھے امید ہے کہ میرے گائیڈ دستے کو چارسدہ میں کوئی ناز یبا کارروائی نہیں کرنی پڑے گی۔" انگریز افسر اس معاہدے کو اپنی ذاتی شکست سمجھتے تھے، اور اس کی تلافی کرنا چاہتے تھے۔ وہ بار بار معاہدے کی خلاف ورزی کرتے تھے اور خدائی خدمت گاروں کو چین نہیں لینے دیتے تھے۔ ۲۳ دسمبر کو چیف کمشنر نے انھیں دربار میں شریک ہونے کی دعوت دی مگر انھوں نے اس وجہ سے کہ عام خدائی خدمت گاروں پر ابھی تک سختیاں جاری تھیں احتجاج کے طور پر دربار میں شریک ہونے سے انکار کر دیا۔ ۲۴ دسمبر کی رات کو وہ قریب قریب اپنے سارے خاندان کے ساتھ ایک آرڈیننس کے ماتحت گرفتار کر لئے گئے اور صوبہ سرحد کے باہر لے جا کر ایک غیر معین مدت کے لئے بند کر دئے گئے۔ یہ واقعہ عین اس وقت ہوا جب گاندھی جی دوسری گول میز کانفرنس سے واپس آ رہے تھے۔

سنہ ۱۹۳۰ء اور سنہ ۱۹۳۲ء کے درمیان سول نافرمانی کی دونوں تحریکوں کے دوران میں صوبہ سرحد میں نادر شاہی حکومت تھی۔ سول نافرمانی کرنے والوں کی کھیتیاں جلا دی گئیں۔ غلّے کے ذخیروں پر تیل چھڑک کر انھیں آگ لگا دی گئی، اور ان کے گھر بھی خاکستر کر دئے گئے۔ مارشل لا کا زور تھا۔ لاٹھی اور گولی چل رہی

تھی اور لڑکیوں کے ساتھ ایسا ذلت آمیز اور وحشیانہ برتاؤ کیا جاتا تھا جو بیان سے باہر ہے ۔" سرخ پوشوں کو گولی سے مارنا صوبہ سرحد میں برطانوی فوجوں کے لئے شکار اور تفریح سمجھا جاتا تھا ۔" وہ ننگے کرکے برطانوی سپاہیوں کی صفوں کے بیچ میں دوڑائے جاتے تھے اور یہ انھیں ٹھوکریں لگاتے تھے اور سنگینوں اور رائفلوں کی نوکیں چبھوتے تھے ۔ وہ مکانوں کی چھتوں سے گرائے جاتے تھے ۔ گندے تالابوں میں ڈھکیلے جاتے تھے اور ان کے ساتھ ایسی ناشائستہ حرکتیں ہوتی تھیں کہ بعض عمر بھر کے لئے اپاہج ہو کر رہ گئے ۔

پٹھان ایک خود دار اور حساس قوم ہے جو ذلت پر موت کو ترجیح دیتی ہے ۔ خان بھائیوں کے ایک رشتے کے بھائی کو بعض خاندانی حالات سے مجبور ہو کر اپنی رہائی کے لئے ضمانت دینی پڑی ، اپنی اس کمزوری پر اس قدر نادم ہوئے کہ اس کی تلافی کے لئے انھوں نے خودکشی کرلی ۔ ان کے دوستوں اور عزیزوں نے ہر چند سمجھایا کہ تم قانون کی خلاف ورزی کرکے پھر جیل خانے جاسکتے ہو مگر کچھ اثر نہ ہوا ، وہ یہ لکھ کر چھوڑ گئے کہ ان کی وجہ سے خاندان کی جو بے عزتی ہوئی اس کی تلافی صرف ان کی موت ہی کرسکتی ہے ۔

ایک اور ممتاز سیاسی کارکن سید عبدالودود پاشا جو ملاکنڈ کے قبائلی علاقے کے معزز مذہبی پیشوا اور زمیندار تھے ،

تین سال سے قید تھے۔ اُن کے بوڑھے باپ نے جو مرنے کے قریب تھے، ان کی طرف سے ضمانت داخل کردی تاکہ دنیا سے رخصت ہونے سے پہلے اپنے بیٹے کی صورت دیکھ لیں۔ بیٹے نے جیل سے چھوٹ کر شرم کے مارے اپنے آپ کو گولی مار کر جان دے دی۔

ہر شخص جانتا ہے کہ پٹھان کتنے غصہ ور ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود اس سارے زمانے میں ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ہوا جس سے خدائی خدمت گاروں پر تشدد کا الزام آسکے۔ ان میں سے بعض نے یہ دیکھ کر اب اُن کے لئے عدم تشدد کو نبھانا مشکل ہے خودکشی کرلی۔

۱۹۳۴ء میں خان بھائی پھر رہا ہو گئے۔ لیکن صوبہ سرحد میں اُن کا داخلہ بند کر دیا گیا۔ بادشاہ خاں وردھا میں گاندھی جی کے پاس آگئے۔ اُنھوں نے اپنی بیٹی کو (جو تعلیم کی غرض سے انگلستان میں تھیں) بلا کر وردھا کے مہلا آشرم میں، میرا بہن (یعنی ایڈمرل سلیڈ کی بیٹی مس سلیڈ) کی نگرانی میں داخل کر دیا جو گاندھی جی کے طرز زندگی سے متاثر ہو کر اُن کی وفادار رفیق بن گئی تھیں۔ یہ نومبر کے آخری ہفتے کا ذکر ہے۔ ۷ دسمبر کو بادشاہ خاں بمبئی گورنمنٹ کے ایک وارنٹ کے ماتحت ایک تقریر کی وجہ سے جو انھوں نے بمبئی میں عیسائی نوجوانوں کی انجمن کی دعوت پر کی تھی، پھر گرفتار کر لئے گئے اور تین سال قید سخت کی سزا دی گئی۔

۱۹۳۶ء میں جیل سے رہا ہونے کے بعد وہ پھر گاندھی جی کے پاس پہنچے۔ اس سال وہ وردھا میں سیٹھ جمنا لال بجاج کے مہمان تھے۔ لیکن اپنے وقت کا زیادہ حصہ گاندھی جی کے ساتھ سیواگرام آشرم میں بسر کرتے تھے۔ اب یہی اُن کا گھر بن گیا تھا اور جب تک انھیں اپنے صوبے میں واپس جانے کی اجازت نہیں ملی ہمیں یہیے یہ دونوں کے لیے بہت اچھا اور قابل قدر موقع تھا۔ دونوں کو ایک دوسرے سے اچھی طرح واقف ہونے کا موقع ملا اور ان میں دوستی کا رشتہ قائم ہوگیا۔ اور یہ دوستی روز بروز زیادہ گہری ہوتی ہوگئی۔ اس طویل رفاقت کے زمانے میں ان دونوں کا گھل مل کر باتیں کرنا، ایک دوسرے کے ساتھ انتہائی قدر و عزت کا برتاؤ کرنا اور اپنی اپنی واردات قلب ایک دوسرے سے بیان کرنا۔ یہ ایسے منظر تھے کہ حافظ اب تک اُن سے لطف اُٹھاتا ہے۔ گاندھی جی جنھیں فرقہ وارانہ اتحاد سے عشق تھا۔ بادشاہ خاں کو سارے مسلم جماعت کا نمونہ سمجھتے تھے۔ بادشاہ خاں سے بڑھ کر سچا مسلمان اس سے زیادہ متقی، دین دار، صاف دل، مخلص اور روادار آدمی کہاں مل سکتا تھا۔ اور بادشاہ خاں کو جو چیز گاندھی جی کی طرف کھینچتی تھی وہ ان کی شہرت یا ان کی سیاسی خدمات نہ تھیں۔ اس محبت اور عقیدت کا راز جو انھیں گاندھی جی سے تھی یہ تھا کہ وہ اُن کے روحانی ہم مشرب تھے۔ خدا پرست اور عبادت گذار، پاک باز

اور مرتاض تھا، سدا حق سے لو لگانے والے اور چھوٹے سے چھوٹے کام میں اس کی مرضی پر چلنے والے۔

ایک بار بادشاہ خاں نے کہا "اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ ایک مسلمان یا پٹھان میری طرح عدم تشدد کا قائل ہو۔ یہ کوئی نیا عقیدہ نہیں ہے۔ اب سے چودہ سو سال پہلے پیغمبر اسلام نے اپنی ساری مکّی زندگی میں اس پر عمل کیا اور ان کے بعد سب لوگ جو کسی ظالم کے ظلم سے نجات پانا چاہتے تھے اس پر عمل کرتے تھے لیکن ہم اسے ایسے بھولے کہ جب گاندھی جی نے ہمارے سامنے پیش کیا تو ہم یہ سمجھے کہ وہ کسی انوکھے عقیدے کی تلقین کر رہے ہیں...... ان کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے سب سے پہلے ہمیں یہ بھولا ہوا سبق یاد دلایا اور اسے قوم کے سامنے رکھا کہ وہ اسے اپنی مشکلات کی چارہ جوئی کے لیے استعمال کرے"

انھوں نے فرمایا "جب گاندھی جی کی زندگی میں کوئی معرکے کا وقت آتا ہے اور وہ کوئی اہم فیصلہ کرتے ہیں، تو میں اپنے دل میں کہتا ہوں۔ یہ اس شخص کا فیصلہ ہے جس نے اپنے آپ کو خدا کی مرضی پر چھوڑ دیا ہے۔ اور خدا کبھی کسی کو گمراہ نہیں کرتا"

ایک اور موقع پر کہا "میرے لئے یہ آسان نہیں کہ ان کے فیصلے میں چون و چرا کروں، اس لئے کہ وہ ہر معاملے میں خدا سے ہدایت چاہتے ہیں۔ اور ہمیشہ اس کے حکم پر چلتے ہیں۔ میرے پاس

تو ایک ہی پیمانہ ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان نے اپنے آپ کو خدا کی مرضی کے تابع کر دیا ہے۔"

۱۹۳۷ء میں کانگریس نے فیصلہ کیا کہ ۱۹۳۵ء کے انڈیا ایکٹ کے ماتحت ان وعدوں کی بنا پر جو وائسرائے نے کئے تھے صوبوں میں وزارتیں قبول کرے۔ خان بھائی اپنے ہاں انتخابات میں حصہ نہیں لے سکے اس لئے کہ وہ حکم جس کی رو سے انھیں صوبہ سرحد میں داخل ہونے کی ممانعت تھی اب تک نافذ تھا پنڈت جواہر لال نہرو کو بھی انتخابات کی مہم کے سلسلے میں اس صوبے میں قدم رکھنے دیا گیا حالانکہ مسلم لیگ والوں کو جو ہندوستان کے دوسرے صوبوں سے آئے تھے ہر طرح کی سہولتیں بہم پہنچائی گئیں سرکاری افسروں نے کھلم کھلا خان بھائیوں اور کانگریس کے خلاف کام کیا۔ اس کے باوجود ڈاکٹر خان صاحب کو بڑی اکثریت حاصل ہوئی اور وہ اپنی عدم موجودگی میں صوبے کی کونسل کے ممبر منتخب ہوگئے۔ ستمبر ۱۹۳۷ء میں انھوں نے وزیر اعظم کی حیثیت سے صوبہ سرحد میں کانگریسی وزارت بنائی اور وہ لوگ جو کل تک راندۂ قانون تھے، اپنے وطن کے حاکم بن گئے۔

فقیر منش بادشاہ خان نہ تو الکشن کے لئے کھڑے ہوئے اور نہ اپنے بھائی کی وزارت میں شریک ہوئے۔ اس کے بجائے انھوں نے خدمت کی کٹھن راہ اختیار کی۔ ان کو یہ یقین ہوگیا

تھا کہ سوا اس عدم تشدد کے جس کی گاندھی جی نے تعلیم دی ہے اور کسی چیز کے ذریعے سے ان کی قوم پوری اخلاقی ترقی نہیں کر سکتی۔ اس میں خدمت کا جذبہ اور عدم تشدد کا عقیدہ کتنا گہرا تھا۔ اس کا اندازہ ان کے اس بیان سے ہو گا جو ینگ انڈیا میں شائع ہوا تھا۔

"عدم تشدد قریب قریب میرا عقیدہ بن گیا ہے۔ میں مہاتما گاندھی کی اہنسا کو پہلے ہی مانتا تھا۔ لیکن میرے صوبے میں جو بے نظیر کامیابی اس تجربے میں ہوئی اس کی وجہ سے میں عدم تشدد کا دل سے قائل ہو گیا ہوں۔

"مجھے یقین ہے کہ انشاء اللہ میرا صوبہ پھر کبھی تشدد کی راہ پر نہیں چلے گا۔ ہم اس بے خونی بیر کی وجہ سے جس کے لئے ہم بدنام ہیں، عدم تشدد کے تلخ نتائج اچھی طرح جانتے ہیں۔ ہمارے ہاں محبت میں بھی تشدد رہا ہے۔ عدم تشدد کی تربیت حاصل کرنے میں خود ہمارا ہی فائدہ ہے۔ اس کے علاوہ پٹھان صرف محبت سے اور معقول بات سے خوش ہوتا ہے۔ اگر آپ اس کا دل ہاتھ میں لے لیں تو وہ آپ کے ساتھ جہنم میں چلا جائے گا۔ لیکن زبردستی آپ اُسے جنت میں بھی نہیں لے جا سکتے۔ محبت سے پٹھان قابو میں آجاتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ پٹھان دوسروں کے ساتھ وہی سلوک کریں جو وہ چاہتے ہیں کہ دوسرے ان کے ساتھ کریں۔ ممکن ہے

کہ میں ناکام رہوں اور میرے صوبے میں تشدد کی ایک لہر دوڑ جائے میں قسمت کے فیصلے کا سامنا کرنے کے لیئے تیار ہوں، لیکن اس سے میرے عدم تشدد کے عقیدے میں ذرا بھی تزلزل نہیں ہوگا۔ اس چیز کی میری قوم کو اور سب لوگوں سے زیادہ ضرورت ہے۔"

پندرہ برس تک بادشاہ خاں انگریزوں سے لڑتے رہے تھے۔ اس پر بھی ان کے دل میں تلخی کا شائبہ تک نہ تھا۔ انھوں نے ۱۹۳۱ء کی صلح کے دوران میں رابرٹ برنیز سے ایک انٹرویو کے دوران میں کہا تھا " اگرچہ انگریزوں نے مجھے قید کیا تھا لیکن میں اُن سے نفرت نہیں کرتا۔ میری تحریک صرف سیاسی نہیں بلکہ سماجی بھی ہے۔ میں سُرخ پوشوں کو یہ تعلیم دیتا ہوں کہ اپنے ہمسایوں سے محبت کریں اور سچ بولیں۔ مسلمان ایک جنگ جو قوم ہے وہ عدم تشدد کے عقیدے کو آسانی سے ماننے والے نہیں ہیں میں انھیں اس کے سکھانے کی اپنی سی کوشش کر رہا ہوں۔"

اس رات کو "ننگے فقیر" کے مصنف نے اپنی ڈائری میں عبدالغفار خاں کے متعلق یہ رائے لکھی تھی:-

"عبدالغفار خاں ایک نیک دل، حلیم اور قابلِ محبت آدمی ہیں۔ ان کو ایک خطرناک انقلابی سمجھنا ایسا ہی ہے جیسے بوڑھے جارج لینس بری کو۔"

اگلے سال ۱۹۳۸ء میں بادشاہ خاں نے گاندھی جی کو دعوت دی کہ وہ اُن کے صوبے کا دورہ کریں اور خدائی خدمت گار تحریک کی رہنمائی فرمائیں۔ کانگریس وزارت کے قائم ہونے سے صوبہ سرحد میں ایک عجیب صورت حال پیدا ہوگئی تھی۔ اس صوبے میں برطانوی افسروں خصوصاً پولیٹکل ڈیپارٹمنٹ کو کانگریسی حکومت کا قائم ہونا بہت ناگوار تھا۔ وہ قبائلیوں کے ذریعے سے کانگریسی وزارت پر دباؤ ڈالنا چاہتے تھے۔ اس میں انھیں اس دوعملی کی وجہ سے جو صوبہ سرحد میں تھی بہت مدد ملی مثلاً گورنر بحیثیت صوبائی حکومت کے صدر کے تو آئین کی رو سے اس کا پابند تھا کہ وزیروں کے مشورے کے مطابق کام کرے لیکن قبائلی علاقوں کے معاملے میں وہ صرف وائسرائے کے ماتحت تھا، اور اس سے براہ راست تعلق رکھتا تھا۔ اس کے علاوہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ضلع کے کاموں میں تو وزارت کے ماتحت تھے لیکن قبائلی علاقے کے منتظم کی حیثیت سے براہ راست پولیٹکل ڈیپارٹمنٹ کے سامنے ذمہ دار تھے۔ اور بغیر مجلس قانون ساز یا وزارت کی منظوری اور علم کے بالا بالا جو چاہیں کر سکتے تھے۔ وزارت کے تعلقات پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ اور فوج سے بگڑے ہوئے تھے اور اس کی وجہ سے سرکاری ملازموں کے کام میں اور ضبط میں ڈھیل پائی جاتی تھی، اور جرائم بڑھ گئے تھے۔ سنہ ۱۹۳۶ء کے

آخر میں جب برطانوی کیبنٹ کے ۱۵ رمئی کے اعلان کے مطابق مرکز میں عارضی حکومت قائم ہوئی اور پنڈت جواہر لال نہرو اس کے وائس پریسیڈنٹ کی حیثیت سے صوبہ سرحد میں ملاکنڈ ایجنسی کے دورے کے لیے گئے تو ان کی موٹر کار پر قبائلیوں نے کمین گاہ سے جو حملہ کیا اس کے بارے میں یہ شبہہ تھا کہ اس میں سرکاری افسروں کا ہاتھ ہے اور متعلقہ پولیٹیکل افسر کو اپنے فرض میں غفلت کرنے کی بنا پر سزا دی گئی۔ اس مخالفت کی ایک مخصوص علامت بنوں کا چھاپہ اور ڈیرہ اسمٰعیل خاں کا فساد تھا۔ سنہ ۱۹۱۹ء سے سنہ ۱۹۳۶ء تک کی سرکاری انتظامی رپورٹوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ صوبے کے افسر سیاسی شورش کا علاج فرقہ وارانہ فساد کو سمجھتے تھے مثلاً سنہ ۱۹۱۹ء کی صوبہ سرحد کی رپورٹ کو لیجیے:-

"ستمبر کے ابتدائی دنوں میں صوبہ سرحد کی سیاسی جارحانہ جدوجہد سرد پڑ گئی جس کی بڑی وجہ غالباً یہ تھی کہ عبدالغفار خاں یہاں موجود نہ تھے۔ وہ مسٹر گاندھی سے ملنے شملے گئے تھے، اور کچھ دن پنجاب میں ٹھیرنے کے بعد سیدھے ڈیرہ اسمٰعیل خاں پہنچے جہاں انھوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں میں صلح کرانے کی ناکام کوشش میں ایک ہفتہ صرف کیا" اور آگے چل کر یہ عبارت ہے:-

"اس عرصے میں ضلع میں سیاسی حیثیت سے بہت سکون رہا"

اس وقت کی وزارت کے اور پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ اور فوج کے آپس کے تعلقات بگڑ جانے کا یہ اثر ظاہر ہو رہا تھا کہ سرکاری ملازم احکام کی تعمیل نہیں کرتے تھے اور یہ بدامنی بڑھ گئی تھی۔ ۱۹۴۶ء کی تیسری سہ ماہی میں پنڈت نہرو (اس عارضی حکومت کے نائب صدر کی حیثیت سے جو ۱۵ مئی کے اعلان کے مطابق قائم ہوئی تھی، صوبہ سرحد میں تشریف لائے) اس موقع پر خدائی خدمت گاروں نے ان کا شاندار استقبال کیا۔ دس میل لمبے راستے کے دونوں طرف تھوڑی تھوڑی دور کے فاصلے پر ان کی قطار اس سرے سے اس سرے تک چلی گئی تھی۔ لیکن ملاکنڈ ایجنسی میں بعض قبائلیوں نے ان کی کار پر کمین گاہ سے حملہ کیا۔ شبہ یہ تھا کہ اس معاملے میں سرکاری ملازموں کا ہاتھ ہے، اور متعلقہ پولیٹیکل افسر کے خلاف ادائے فرض میں غفلت کا الزام لگا کہ اُسے سزا دی گئی۔ اب سوال یہ تھا کہ کانگریس کی عوامی حکومت ایسی صورت میں کیا کرے؟ قبائلیوں کو زبردستی دبانے کی کوشش پہلے کئی بار ہو چکی تھی اور ناکام رہی تھی۔ برطانوی حکومت نے ان پر گولہ باری بھی کی تھی جس سے ساری مہذب دنیا کو سخت دھچکا لگا، لیکن اس سے بھی قبائلیوں کو دبانے میں کامیابی نہیں ہوئی۔

جینوا میں ۱۹۳۳ء میں جو کانفرنس ہوائی ترک اسلحہ کے لئے ہوئی تھی۔ اس میں مسٹر اینٹنی ایڈن نے برطانیہ کی طرف سے یہ

درخواست کی تھی کہ "بعض دور دراز علاقوں میں قیام امن کے لئے جو بم باری کی جاتی ہے اس کو ممانعت سے مستثنیٰ کر دیا جائے ان کی دلیل یہ تھی کہ اس کے سوا اور کوئی صورت ہے تو صرف یہ ہے کہ خشکی کی فوج سے کام لیا جائے جس میں زیادہ خون ریزی کا اندیشہ ہے" فوجی مہم کے بھیجنے سے جان کا اور صحت کا بڑا نقصان ہوتا ہے" اور ہوائی بم باری میں عام طور پر محض دھمکی کافی ہوتی ہے اور اس کا امکان ہے کہ کسی کے مرنے یا زخمی ہونے کی نوبت نہ آئے" امریکہ کے نمائندے مسٹر ولسن نے اس کی مخالفت کی اور اس بات پر اصرار کیا کہ ہوائی بم باری کا ترک "قطعی غیر مشروط اور عالم گیر" ہونا چاہیئے۔

لفٹنٹ جنرل میک مین نے صوبہ سرحد پر جو کتاب لکھی ہے اس کے صفحہ ۲۷۳، ۲۷۴ میں ہوائی بم باری کے مقابلتہً غیر مؤثر ہونے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"عہد جدید کی مایوسیوں میں سے ایک یہ ہے کہ ہوائی فوج اس مسئلے سے نبٹنے میں ناکام رہی۔ اُمید تھی کہ شاید اس سے مسئلہ حل ہو جائے گا۔ مگر بہت جلد معلوم ہو گیا کہ قبائلی حملہ آوروں اور گل چلوں پر ہوائی بم باری کا کوئی خاص اثر نہیں ہوتا...... تعزیری بم باری بھی بے کار ثابت ہوئی۔ بغیر پہلے سے آگاہ کیے ہوئے بم باری کی جائے تو خاندان کے خاندان تباہ ہو جاتے ہیں اور جو

پہلے سے آگاہ کر دیا جائے تو بم باری کرنے کے کوئی معنی نہیں۔

اب رہا یہ عذر کہ قبائلی بم باری سے ہلاک نہیں ہوتے، اس لئے کہ انھیں پہلے سے آگاہ کر دیا جاتا ہے تو اس خدا ترس انگریز چارلی اینڈریوز کا قول سنئے:۔

"پہلی آگاہی انھیں پہلے بم سے ہوتی ہے جو ہوائی جہاز سے اُن پر گرایا جاتا ہے۔"

(صوبہ سرحد کا چیلنج ص ۹۴)

ایک تجربہ کار کے مشہور افسر رابرٹ سین ڈیمن نے کیا تھا کہ قبائلی علاقے میں پر امن طریقے سے داخل ہو کر قبائل کے سرداروں کی ہمت افزائی کی جائے اور اخلاقی اور مادی فائدے پہنچا کر انھیں اندر سے قابو میں لایا جائے۔ مگر یہ بھی کوئی اچھی بات نہ تھی۔ قطع نظر اس سے کہ اس کی وجہ سے فرسودہ جاگیر داری نظام کو تقویت پہنچی تھی۔ یہ بجائے خود سامراج کا ایک پہلو تھا آخر یہی طریقہ تو تھا جس سے برطانوی حکومت نے آہستہ آہستہ اور غیر محسوس طور پر اس سارے علاقے کا الحاق کر لیا جو اب بلوچستان کا صوبہ کہلاتا ہے اور درہ گومل تک راستہ صاف کر دیا حالانکہ پنجاب کے پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ والے مدت سے وزیرستان کے پہاڑوں کے سامنے پڑے ہوئے تھے اور آگے نہیں بڑھ سکے تھے۔ ڈیورنڈ کے وقت سے ہر مصنف نے پٹھان قبائلیوں کے

جمہوری طریق زندگی اور اُن کے آزادی کے جذبے کا اعتراف کیا تھا۔ تو پھر کیا تعجب ہے کہ وہ سین ڈیمن کی پالیسی کو اپنی آزادی کے لئے جو انھیں دل سے عزیز تھی، خطرناک سمجھتے تھے۔

بنوں مشن کے ڈاکٹر پینل نے کچھ اور ہی طریقہ اختیار کیا تھا۔ وہ پٹھانوں کے درمیان جا کر بس گئے اور محبت اور بے نفسی کے ساتھ ان کی خدمت کر کے انھیں عیسائیت کی طرف راغب کرتے تھے۔ وہ ان کے ساتھ اُٹھتے بیٹھتے تھے، ان کا سا لباس پہنتے تھے، اُن کی زبان بڑی بے تکلفی سے بولتے تھے اور آخر انھوں نے اُن ہی لوگوں کی خدمت کرتے کرتے جان دی۔ وہ ہمیشہ بڑے سے بڑے سرکش پہاڑوں کے درمیان نہتے پھرتے تھے۔ اور ایک بار جب ایک فوجی افسر نے اس پر اصرار کیا کہ وہ اپنے ساتھ ایک محافظ دستہ لے جائیں تو انھوں نے کہا کہ اس طرح تو لوگ یقیناً کمین گاہ سے گولی چلا کر مجھے مار ڈالیں گے۔ اُن کے متعلق یہ کہا جاتا تھا کہ اکیلے پینل "دو فوجی رجمنٹوں کے برابر ہیں"۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ امن کے اس علمبردار کا کتنا زیادہ اثر تھا۔

لیکن ڈاکٹر پینل کی یہ مہم محض ایک انفرادی کوشش تھی اور اس میں بھی ان کو عیسائی بنانے کی غرض پوشیدہ تھی۔ اس سے بھی اس اہم ترین سوال کا، جو اس ولی صفت انگریز ایبٹ ریورٹی نے

کہا تھا، جواب نہیں ملتا" کیا ان تشدد کے طریقوں کے مقابلے میں جو آج تہذیب کو تباہ کر رہے ہیں، اخلاقی مزاحمت کی کوئی گنجائش ہے؟ کیا چینیوں کے لیے کوریا، منچوریا یا شمالی چین میں اس طریقے سے جاپان کے تسلط کو روکنا ممکن تھا؟ کیا اس سے اطالوی کی جارحانہ پیش قدمی روکی جا سکتی تھی؟ کیا اسپین سے کام لیا جا سکتا تھا؟ وہ کون سا طریقہ ہے جس سے دنیا کے ضمیر کو جارحانہ اقدام کرنے والے کے خلاف اس طرح ابھارا جائے کہ اس کی کامیابی اخلاقی شکست بن جائے۔ کیا اخلاقی دنیا میں کوئی ایسی تدبیر ہے جس کی تاثیر جسمانی قوت پر منحصر نہ ہو، کیا یہ ممکن ہے کہ اس اخلاقی تدبیر سے کام لے کر ہندوستان کی شمال مغربی سرحد پر قبائلیوں میں امن قائم کیا جا سکے"۔

بادشاہ خاں اور ان کی خدائی خدمت گار تحریک نے اس سوال کا جواب ایک حد تک دے دیا تھا۔ اب گاندھی جی وہاں جا کر یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ سرے سے یہ سوال ہی باقی نہ رہے۔

پانچواں باب

دہلی سے ایک خط

کشمکش

اپنے ہونے والے میزبان خان عبدالغفار خاں صاحب سے ایک عرصے تک خط و کتابت کرنے کے بعد آخر ستمبر ۱۹۳۸ء میں گاندھی جی سیواگرام سے اس ارادے سے روانہ ہوئے کہ صوبہ سرحد کے خدائی خدمت گاروں کے درمیان ایک مہینہ گذاریں۔ یہ اس وعدے کا ایفا تھا جو گاندھی جی نے خاں صاحب سے کیا تھا۔

اس امید پر کہ گاندھی جی راستے میں دہلی ٹھیریں گے، وہاں کانگریس ورکنگ کمیٹی اور دو اور کمیٹیوں یعنی آل انڈیا چرخا سنگھ اور جلیانوالا باغ یادگار کمیٹی کے جلسوں کا انتظام کیا گیا تھا۔ گاندھی جی کے دوستوں کو بڑی فکر تھی کہ کہیں ان جلسوں میں شریک ہونے سے اُن کی صحت پر زیادہ بوجھ نہ پڑے۔ ورکنگ کمیٹی کا یہ جلسہ ایسے وقت میں ہو رہا تھا جب یورپ کے آسمان

پر جنگ کی گھٹا چھائی ہوئی تھی، اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب برسا ہی چاہتی ہے اس اہم ترین مسئلے پر بڑے زور شور سے بحث ہوتی رہی۔ لیکن ابھی کوئی قطعی فیصلہ نہیں ہونے پایا تھا کہ دم بھر میں بادل چھٹ گیا اور مطلع صاف ہو گیا۔ کانگریس میں بعض لوگ اس خیال کے بھی تھے کہ انگلستان کی مشکلات سے فائدہ اٹھا کر اچھے سے اچھا سودا کر لینا چاہیئے۔ مدتوں کے انتظار کے بعد ایسا موقع آیا ہے۔ لیکن گاندھی جی کے لیے یہ سخت روحانی کشمکش کا وقت تھا۔ خود ان کے لیئے اور ہندوستان کے لیئے آزمائش کی گھڑی تھی۔ اگر اس سودے میں ہندوستان سب کچھ پا جائے مگر اپنا ضمیر کھو بیٹھے تو کیا فائدہ؟ کوئی چوتھائی صدی سے گاندھی جی ملک کو اہنسا کا سبق پڑھا رہے تھے۔ اب ان کی عمر بھر کی تعلیم کا نتیجہ نکلنے والا تھا۔ دیکھنا یہ تھا کہ کانگریس اس نازک وقت میں کیا کرتی ہے؟ آیا اس میں اتنی ہمت اور طاقت ہے کہ جنگ یورپ کے پر آشوب دور میں اپنے خالص اہنسا کے عقیدے پر عمل کر کے دکھا دے؟ گاندھی جی نے ایک دوست سے کہا "اگر کانگریس اس موقع پر اپنے اہنسا کے عقیدے پر پورا پورا عمل کرے تو ہندوستان کا نام امر ہو جائے گا۔ اس کا یہ کارنامہ دنیا کی تاریخ میں یادگار رہے گا۔ مگر میں جانتا ہوں کہ ابھی تک یہ محض میرا ایک خواب ہے۔"

ایک یادگار موقع پر انھوں نے لکھا تھا "اگر ہندوستان نے تلوار اٹھا لی تو یہ وہ ہندوستان نہیں رہے گا جس کا میں خواب دیکھتا ہوں اور مجھے یہی کرنا پڑے گا کہ اپنے دکھے ہوئے دل کو سکون دینے کے لئے ہمالیہ کی راہ لوں"۔ دہلی میں کچھ دوست گاندھی جی سے ملنے کے لئے آئے۔ اُن سے گفتگو کے دوران میں انھوں نے فرمایا "کچھ بھی ہو جائے ہم حکومت کے آگے جھکنے کے نہیں۔ اگر حکومت سارے اختیارات کانگریس کے سپرد کر دے تب بھی میں تو لڑائی سے الگ ہی رہوں گا، چاہے اور کوئی میرا ساتھ نہ دے"۔ ایک اور دوست نے یہ شبہہ ظاہر کیا کہ خطرے کے وقت آپ کی خالص اہنسا کی پکار پر شاید ہی کوئی کان دھرے۔ اُن کے جواب میں گاندھی جی نے فرمایا "پچاس سال پہلے کون کہہ سکتا تھا کہ ہوائی جہاز سچ مچ اُڑنے لگیں گے؟ تیس سال پہلے اس ملک میں کون کہہ سکتا تھا کہ ہزارہا بے گناہ مرد عورت اور بچے ہنستے کھیلتے جیل جانے پر تیار ہو جائیں گے؟ اہنسا سے ہتھیار کا کام لینے کے لئے فوق البشر ہستیوں کی ضرورت نہیں یہی معمولی مٹی کے پتلے اس ہتھیار کو چلا سکتے ہیں اور چلا چکے ہیں، بہر حال ورکنگ کمیٹی کے پندرہ ممبر اہنسا کا امتحان دینے کو تیار ہیں۔ مجھے تو اس کی بھی اُمید نہ تھی"۔ فی الحال یہ نازک وقت ٹل گیا ہے۔ مگر اس نے گاندھی جی کو چونکا دیا ہے۔ وہ اب اس

مسئلے پر گہرا غور کر رہے ہیں۔ انھوں نے اہنسا کا سبق یورپ کو بھی دینا شروع کر دیا ہے۔ چنانچہ وہ ایک مضمون میں فرماتے ہیں :-

" اگر میں چیکوسلواکیہ کا رہنے والا ہوتا تو ان دونوں قوموں (فرانسیسیوں اور انگریزوں) کو اپنے ملک کی حفاظت کی ذمہ داری سے آزاد کر دیتا۔ مجھے کسی قوم یا جماعت کا دست نگر ہو کر رہنا گوارا نہ ہوتا، میں تو کامل آزادی حاصل کرتا یا فنا ہو جاتا۔ ہتھیاروں سے مقابلہ کر کے جیتنے کی کوشش کرنا تو محض اجڈپن ہے۔ ہاں یہ ایک دوسری چیز ہے کہ جو لوگ میری آزادی چھیننا چاہتے ہیں ان کی طاقت کو خاطر میں نہ لا کر میں اُن کی مرضی کے آگے سر جھکانے سے انکار کر دوں اور اس کشمکش میں نہتا مارا جاؤں۔ اس طرح میں اپنا جسم قربان کر دوں گا لیکن اپنی روح یعنی اپنی عزت کو بچا لوں گا۔ اب تک ہٹلر اور اس جیسے لوگوں کی اُمیدیں اس تجربے پر مبنی ہیں کہ لوگ ہمیشہ طاقت سے دب جاتے ہیں۔ نہتے مردوں، عورتوں اور بچوں کا بغیر تشدد اور بغیر نفرت کے مزاحمت کرنا اُن کے لئے ایک انوکھا تجربہ ہوگا۔ کون یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہے؟ کہ بہتر اور پاکیزہ ترقوتوں سے متاثر ہونا ان کی فطرت ہی میں نہیں ہے آخر اُن کے جسم میں بھی وہی روح ہے جو میرے جسم میں ہے۔ (۳۸-۱۰-۸)

ایک اور مہربان فرماتے ہیں "تم جو کچھ کہتے ہو، وہ تمھارے لئے تو ٹھیک ہے مگر تم یہ توقع کیسے کرسکتے ہو کہ تمھاری قوم اس انوکھی دعوت پر لبیک کہے گی۔ ان لوگوں نے تو لڑنے کی تربیت پائی ہے............

میں اس کا یہ جواب دیتا ہوں ــــ "شاید ایسا ہی ہو، مگر مجھے تو اس دعوت پر لبیک کہنا ہی ہے۔ جب میں نے جنوبی افریقہ میں پہلی بار ستیہ گرہ کی تحریک شروع کی تو میرا کوئی رفیق نہ تھا .... لیکن قوم کی عزت بچ گئی، جنوبی افریقہ کی ستیہ گرہ نے تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ اس سے زیادہ موزوں مثال عبدالغفار خاں صاحب کی ہے، جو اپنے آپ کو خدائی خدمت گار کہتے ہیں۔ اور جنھیں پٹھان فخر افغان کہہ کر خوش ہوتے ہیں۔ اس وقت جب میں یہ لکھ رہا ہوں، وہ میرے سامنے بیٹھے ہوئے ہیں۔ ان کے کہنے سے ہزاروں پٹھانوں نے اپنے ہتھیار پھینک دئے۔ خان صاحب کا خیال ہے کہ انھوں نے عدم تشدد کے نظریے کو جذب کرلیا ہے، مگر اپنے ساتھیوں کے بارے میں انھیں ابھی تک یقین نہیں۔ یہاں اس حلف کے الفاظ نقل کرتا ہوں جو یہ امن کے سپاہی اُٹھاتے ہیں:-

(۱) میں یہ حلف اُٹھاکر خلوص اور دیانت داری سے اپنے آپ کو خدائی خدمت گاروں میں بھرتی ہونے کے لئے پیش کرتا ہوں۔

(۲) میں ہمیشہ قوم کی خدمت، اور ملک کی آزادی کی خاطر تن من دھن قربان کر دینے کو تیار رہوں گا۔

(۳) میں کسی فرقہ بندی میں شریک نہ ہوں گا۔ نہ کسی سے جھگڑا کروں گا، اور نہ دشمنی رکھوں گا۔ میں ہمیشہ مظلوم کو ظالم کے جور و ستم سے بچاؤں گا۔

(۴) میں کسی دوسری جماعت میں شریک نہیں ہوں گا اور عدم تشدد کی لڑائی کے دوران میں نہ کبھی ضمانت داخل کروں گا، نہ معافی مانگوں گا۔

(۵) میں ہمیشہ اپنے افسروں کے ہر جائز حکم کی تعمیل کروں گا۔

(۶) میں ہمیشہ عدم تشدد کے اصولوں کے مطابق زندگی بسر کرنے کی کوشش کروں گا۔

(۷) میں ساری نوع انسانی کی یکساں خدمت کروں گا۔ میری زندگی کا سب سے بڑا مقصد یہ ہوگا کہ ملک کو کامل خود مختاری اور سب کو مذہبی آزادی حاصل ہو۔

(۸) میں اپنے ہر عمل میں سچائی اور پاک بازی کو ملحوظ رکھوں گا۔

(۹) میں اپنی خدمات کے لئے کسی صلے کی توقع نہیں رکھوں گا۔

(۱۰) میری ساری خدمات خدا کی راہ میں ہوں گی۔ ان کا مقصد جاہ و منصب یا نمود و نمائش نہیں ہوگا۔

میں صوبہ سرحد میں اس لئے آیا ہوں بلکہ یوں کہنا چاہئے

کہ خان عبدالغفار خاں صاحب مجھے اس لئے یہاں لائے ہیں کہ جو کچھ اُن کے آدمی کر رہے ہیں اُسے میں اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں، اتنا تو میں ابھی سے کہہ سکتا ہوں کہ ان لوگوں میں عدم تشدّد بس واجبی ہی واجبی ہے، اُن کے پاس تو لے دے کے ایک ہی دولت ہے یعنی وہ عقیدہ جو اپنے رہنما پر رکھتے ہیں۔ یہ نہ سمجھئے گا کہ میں امن کے ان سپاہیوں کو مکمل مثال کے طور پر پیش کر رہا ہوں۔ میں ان کا ذکر اس سلسلے میں کر رہا ہوں کہ ایک سپاہی دوسرے سپاہیوں کو امن کی راہ دکھلانے کی سچے دل سے کوشش کر رہا ہے۔ اس کی میں تصدیق کر سکتا ہوں کہ یہ ایک پرخلوص کوشش ہے اور خواہ اس میں کامیابی ہو یا ناکامی اس سے آنے والے زمانے کے ستیہ گرہی سبق لیں گے۔ اس وقت تو میرا مقصد صرف یہ ہے کہ اُن کے دل میں یہ بات اُتر جائے کہ اگر عدم تشدد ان کے اندر اس سے زیادہ بہادری کا احساس نہ پیدا کر سکے جتنا ہتھیاروں اور ان کے استعمال کی طاقت رکھنے سے ہوتا ہے تو انھیں اپنے عدم تشدد کو خیرباد کہہ دینا چاہیئے اس لئے کہ پھر وہ عدم تشدد نہیں بلکہ بزدلی ہے، پھر تو انھیں اپنے ہتھیار دوبارہ سنبھال لینا چاہیئے........ اور ظاہر ہے کہ اس سے ان کو خود ان کے ارادے کے سوا اور کوئی اور چیز روکنے والی نہیں........ سب سے بڑی

بہادری یہ ہے کہ انسان دنیا کی ہر طاقت کے سامنے خواہ وہ کتنی ہی زبردست کیوں نہ ہو جھکنے سے انکار کر دے۔ اور اس انکار میں تلخی نہ ہو بلکہ وہ اس عقیدے میں ڈوبا ہوا ہو کہ زندگی صرف روح کو حاصل ہے، اور کسی چیز کو نہیں۔

چھٹا باب

سرحدی گاندھی
کے
گاؤں میں

خان عبدالغفار خاں اور اُن کے بھائی ڈاکٹر خاں صاحب کی مہمان نوازی کا کرشمہ ہے کہ گاندھی جی کی صحت کے بارے میں جو اندیشے تھے ان کے برعکس انھیں صوبہ سرحد کی آب و ہوا سے بہت فائدہ پہنچ رہا ہے۔ ابھی تک سردی بہت زیادہ نہیں ہے، ہوا میں خوش گوار خنکی ہے۔ ان کے میزبان اُنھیں زیادہ سے زیادہ آرام لینے کا موقع دے رہے ہیں۔ ان سے زیادہ ہمدرد اور دلسوز "جیلر" گاندھی جی کو آج تک نصیب نہیں ہوا تھا۔ اُنھوں نے گاندھی جی کو پوری آزادی دے رکھی تھی۔ کہ اپنا مسلسل خاموشی کا نسخہ استعمال کریں، جس طرح جی چاہے اپنا وقت گذاریں نہ کوئی عام جلسے ہوتے ہیں اور نہ ملاقاتیں، گفتگو بھی قریب قریب

بند ہے یہاں تک کہ پڑھے لکھ کر بھی اظہار خیال نہیں کرتے۔ ایمرسن کی بابت کہا جاتا ہے کہ جب وہ انگلستان میں چیلسی کے حکیم کارلائل سے ملنے کو گیا تو دونوں میں سے کسی نے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ اس خاموش ملاقات کے بعد ایمرسن نے چلتے وقت کہا "جناب ہماری گفتگو خوب رہی" اس کے جواب میں کارلائل نے جو خاموشی کی برکتوں کا دل سے قائل تھا، صرف اتنا کہا "جی ہاں اور کتنی فصیح و بلیغ" مجھے یقین ہے کہ اگر گاندھی جی چاہتے تو بادشاہ خاں اس کے لئے تیار ہو جاتے کہ انھیں ایسا "دورہ" کرائیں جس میں ذرا بھی نقل و حرکت نہ ہو۔ ان کا ایسا پروگرام بنائیں جس میں کوئی مصروفیت نہ ہو، اور آخر میں اُن سے یہ کہلائیں "جناب ہمارا دورہ خوب رہا"

جب تک بادشاہ خاں کے چاروں طرف اُن کے وطن کے جانے پہچانے مناظر نہ ہوں، اور وہ اپنے علاقے کی تازہ ہوا اور آزاد فضا میں سانس نہ لے سکیں۔ ان کی طبیعت شگفتہ نہیں ہوتی۔ صرف بادشاہ خاں ہی کی نہیں، ہر پٹھان کی یہی فطرت ہے بڑے شہروں کی آبادی، جذبات پرست، ریاکار اور خود غرض ہوتی ہے، اور بادشاہ خاں کو ان چیزوں سے چڑ ہے۔ اسی لئے وہ گاندھی جی کو چار روز کے قیام کے بعد ۹ اکتوبر ۱۹۳۸ء کو پشاور سے اپنے اتمان زئی کے مکان میں لے آئے۔

نہایت خوش نما مرغزار کے درمیان دریائے سوات کے کنارے

امان زئی کا چھوٹا سا گاؤں خاص دل کشی رکھتا ہے۔ آس پاس میلوں تک مکئی، گنے، دال کی پھلیوں اور کپاس کے ہرے بھرے کھیت چلے گئے ہیں۔ اور ان کے بیچ میں پھل دار درختوں کے باغ ہیں جن میں طرح طرح کے بہترین پھل۔ سُرخ ملٹے، آڑو، آلوچے، انگور، خوبانی اور سیب پھلتے ہیں۔ زمین زرخیز ہے اور پانی افراط سے ہے اس لئے کہ دریائے سوات سارے علاقے کو سیراب کرتا ہے اور اس کے بے شمار چھوٹے چھوٹے آبشاروں کی سُریلی آواز دن رات فضا میں گونجتی رہتی ہے۔ گاؤں کے ایک سرے پر ایک چھوٹی سی خوش نما پن چکی ہے۔ یہاں قدامت کی ایک عجیب فضا نظر آتی ہے جس پر زمانے کی تبدیلی کا کوئی اثر نہیں۔ گاؤں کے غریبوں، امیروں۔ سب کے مکانات عام طور پر کچے ہیں۔ اُن کی دیواریں چوڑی اور چھتیں موٹی موٹی لکڑیوں سے بنی ہوئی ہیں جس کی وجہ سے وہ گرمی میں ٹھنڈے اور جاڑوں میں گرم رہتے ہیں۔ بعض مکان اب بھی پرانے پٹھان طرز کے بنائے جاتے ہیں جن میں آگے ایک حجرہ اس کے بعد ایک اصطبل اور سب سے پیچھے رہنے کا مکان ہوتا ہے۔ حجرے میں آج کل نوکر رہتے ہیں لیکن پرانے زمانے میں یہ گاؤں کے کلب کا کام دیتا تھا جہاں مرد جمع ہو کر گپ شپ کرتے تھے اور حقہ پیتے تھے کنوارے نوجوان اپنے گھر کے بجائے یہاں سونا زیادہ پسند

کرتے تھے مجھے بتایا گیا کہ پرانے زمانے میں جب بدامنی کا دور دورہ تھا۔ اصطبل میں دن رات گھوڑے کسے کسائے تیار رہتے تھے۔ تاکہ ضرورت کے وقت خان دم بھر میں سوار ہو کر روانہ ہو جائے۔ آج کل اعلیٰ درجے کی پکی سڑکوں کی وجہ سے جن کا صوبہ سرحد میں جال بچھا ہوا ہے اور آمدورفت کی روز افزوں آسانیوں کی بدولت قریب قریب سب اصطبل خالی نظر آتے ہیں۔ ہاں کہیں کہیں کوئی گھوڑوں کا شائق اب بھی پرانی روایات کو قائم رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ سڑکیں صوبۂ سرحد پر برطانوی سامراج کی فوجی مصلحتوں کی وجہ سے بطور تحفے کے نازل ہوئی ہیں اور اُن کا خرچ مفت میں غریب ہندوستانی رعایا کے سر پر آن پڑا ہے۔ سول نافرمانی کے زمانے میں پکی سڑکیں جرم بغاوت کے انعام اور سزا دونوں کا کام دیتی تھیں۔ جو گاؤں عدم تشدد کی جنگ میں زیادہ سرگرمی دکھاتا وہاں تک ایک پکی سڑک بنائی جاتی تاکہ گاؤں والوں کی آسانی سے گوشمالی کی جاسکے۔ گاؤں میں نہ باقاعدہ نالیاں ہیں، نہ بند رو اور نہ ہی میونسپلٹی کی طرف سے گندے پانی کے نکالنے کا کوئی بندوبست۔ گلیوں کے بیچ میں ایک چوڑا سا نالہ آہستہ آہستہ بہتا چلا جاتا ہے بیچ بیچ میں کہیں کہیں اس کا پانی پھیل جاتا ہے اور سیاہ بدبودار

کیچڑ کے چھڑے سے لگ جاتے ہیں۔ تھوڑی دور جاکر وہ بالکل رک جاتا ہے اور ہوا کو معطر کرتا ہے۔ لوگ ابھی تک صفائی کی قدر قیمت سے واقف نہیں۔ ان سب باتوں کا گاندھی جی کے دل پر بہت اثر ہوا اور آگے چل کر انھوں نے پشاور میں خدائی خدمت گاروں سے جو گفتگو کی وہ اس موضوع پر تھی۔

گاندھی جی کے قیام میں اتمان زئی کے بارے میں ایک چھوٹی سی بات غلط مشہور ہو گئی ہے اور اس نے کئی دوستوں کو پریشانی میں ڈال دیا ہے۔ یہاں اس کو صاف کر دینا ضروری ہے۔ چونکہ بادشاہ خاں کو گاندھی جی کی حفاظت کی بہت زیادہ فکر تھی اس لئے اُن کے قیام اُتمان زئی کے دوران میں بادشاہ خاں اپنے مکان کی چھت پر راتوں کو خدمت گاروں کا پہرہ لگا دیتے تھے۔ اس سے پہلے بادشاہ خاں نے گاندھی جی سے اس کے متعلق گفتگو کی تھی، مگر اپنی تجویز انھیں نہیں بتائی تھی۔ انھوں نے صرف یہ پوچھا تھا کہ کیا آپ کو پہرہ لگانے پر کچھ اعتراض ہے۔ گاندھی کا خاموشی کا دن تھا۔ انھوں نے بغیر یہ جانے ہوئے کہ ان پر کتنی بڑی ذمہ داری عائد ہونے والی ہے اشارے سے کہا کہ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے بادشاہ خاں نے اس کے معنی یہ سمجھے کہ وہ اس پر راضی ہیں کہ رات کو مسلح پہرہ لگا دیا جائے مگر جب گاندھی جی کو معلوم ہوا

کہ مسلح گارڈ تعینات کیا گیا ہے تو انھوں نے اس پر اعتراض کیا اور کہا کہ میں دوسروں کے لئے چوکی پہرے کے خلاف نہیں ہوں مگر یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ میری حفاظت کے لئے مسلح گارڈ سے کام لیا جائے۔ یہ تو میرے عمر بھر کے اصولوں کے خلاف ہوگا۔ بادشاہ خاں نے یہ سوال سوچا تھا کہ چونکہ ہتھیار صرف ان لوگوں کو دھمکانے کے لئے ہیں جن سے نقصان پہنچنے کا خطرہ ہے اور اُن سے کام لینا مقصود نہیں ہے اس لئے غالباً گاندھی جی کو ان کے رکھنے پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ اس مسئلے پر دونوں میں بڑی دلچسپ گفتگو ہوئی۔

گاندھی جی نے کہا "خان صاحب یہ بات جو آپ نے کی اس پر مجھے ایک حکایت یاد آتی ہے۔ ایک دفعہ سانپ اللہ میاں کے پاس گیا۔ اللہ میاں نے کہا میں تیرا زہر نکال لیتا ہوں۔ سانپ نے کہا۔ چاہے زہر نکال لے، مگر پھنکار میرے پاس رہنے دے۔ اللہ میاں نے کہا۔ اگر پھنکار رکھنی ہے تو زہر بھی رکھ مگر آدم کی اولاد تجھے مار ڈالے گی۔ سو آپ نے بھی پھنکار باقی رکھی تو پھر بات ہی کیا ہوئی۔ پھر اگر رکھنا پڑے تو بے شک رکھو مگر بندوق کو تو چھوڑنا ہی پڑے گا۔ کچھ دن ہوئے سیواگرام میں بھی ایک ایسا ہی قصہ ہو گیا تھا مگر میں نے کہہ دیا تھا کہ مجھے پولس کی حفاظت کی ضرورت نہیں، مرنا تو ایک روز ہے ہی

تو پھر چاہے کوئی ہاتھ سے مار ڈالے یا بیماری سے مرجائے اس میں فرق کون سا ہوا؟"

بادشاہ خان:- "ہم صرف ایک آپ کی ذات کی حفاظت نہیں کیا کرتے ہیں۔ آپ کی حفاظت میں تو ہندوستان کی حفاظت آ جاتی ہے۔ ہمارے صوبے کی آبرو کی حفاظت آ جاتی ہے۔ اگر آپ کو کچھ نقصان پہنچا تو ہمارے صوبے کو ہمیشہ کے لئے بٹہ لگ جائے گا۔"

گاندھی جی کے نزدیک یہ چھوٹا سا واقعہ ایک اور بڑے مسئلہ پر روشنی ڈالتا ہے جو ہمیں درپیش ہے۔ جس طرح سے ایک ستیہ گرہی اپنی ذات کی حفاظت میں ہتھیار سے کام نہیں لیتا۔ اسی طرح ہندوستان تشدد سے پاک سوراج حاصل کرنے کے لئے اس قابل ہونا چاہیئے کہ سرحد پار کے قبائل کے حملوں سے اپنے آپ کو بغیر پولیس اور فوج کی مدد کے محفوظ رکھ سکے۔ کہا جاتا ہے کہ یہاں صوبہ سرحد میں ایک لاکھ خدائی خدمت گار ہیں جنھوں نے عدم تشدد کا حلف اٹھایا ہے۔ گاندھی جی نے کہا کہ اگر ان لوگوں کا عدم تشدد محض وقتی مصلحت یا زبانی جمع خرچ نہیں ہے بلکہ بہادروں کا سچا عدم تشدد ہے تو ان کو اس قابل ہونا چاہیئے کہ سرحد پار کے حملہ آوروں کو محبت اور خدمت کے ذریعے اپنا دوست بنا لیں اور ان کی غارت گری کی عادت چھڑا دیں۔ اگر ایسا ہوا تو وہ ہندوستان کو آزاد کرا لیں گے اور ساری دنیا کے لئے نمونہ بن جائیں گے۔

گاندھی جی نے بادشاہ خاں سے گفتگو کے دوران میں اپنے دل کی بات بتائی۔ انھوں نے کہا کہ "اگر کانگریس کی وزارت بغیر پولیس اور فوج کی مدد کے ان حملوں کی روک تھام نہ کر سکے تو ڈاکٹر خان صاحب کو وزارت سے استعفیٰ دے دینا چاہیئے۔ اگر ہمارا یہی رویہ رہا تو ہم دن بدن کمزور ہوتے جائیں گے اور آخر میں شکست کھائیں گے۔ عقل مند آدمی شکست کا انتظار نہیں کرتا۔ اس سے پہلے ہی سمجھ جاتا ہے کہ یہاں میری دال نہیں گلے گی، اور رخصت ہو جاتا ہے برسوں سے جب کہ میری آپ سے جان پہچان بھی نہ تھی، میری یہ آرزو تھی کہ قبائلی علاقے میں جاؤں، کابل تک پہنچوں اور ان ڈاکوؤں کے ساتھ جا کر رہوں اور ان سے پوچھوں کہ کیوں آپ لوگ ایسے کام کرتے ہیں۔ یہ میرا ایک پرانا خواب ہے۔ آئیے ہم اور آپ یہ کیوں نہ کریں کہ اُن کے پاس چلیں، اُن کی ذہنیت کو سمجھیں اپنا نقطۂ نظر اُن کے سامنے پیش کریں اور اُن سے دوستی اور ہمدردی کا زندہ رشتہ قائم کریں۔ امن قائم کرنے کی اصلی تدبیر یہی ہے اگر ہم ایسا کر سکیں، تبھی سُرخ پوشوں کا جو یہ اتنا بڑا لشکر ہم نے بنا رکھا ہے کسی کام کا ہے ورنہ بیکار ہے۔" پھر سُرخ پوشوں کے سالاروں کو مخاطب کر کے اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے گاندھی جی نے کہا "میرے یہاں آنے کا سب سے بڑا مقصد یہی ہے کہ میں یہ سمجھنے کی کوشش کروں کہ خدائی خدمت گار کیا ہیں۔ اگر اس میں

چھ مہینے بھی صرف ہو جائیں تو مجھے اس کی پروا نہیں کیوں کہ میں چاہتا ہوں کہ جس راستے پر مجھے چلنا ہے وہ صاف نظر آجائے پھر جو کچھ بھی کر سکتا ہوں اسی صورت میں۔ جنوبی افریقہ میں مجھے کچھ معلوم نہ تھا کہ کون میرا ساتھ دے گا اور کیا نتیجہ ہوگا مگر مجھے اس کی کچھ پروا ہی نہ تھی کیونکہ میں جانتا تھا کہ یہ کام مجھے کرنا ہے اور اگر اس میں میری جان بھی جائے تو کچھ حرج نہیں۔ کیونکہ مجھے راستہ صاف نظر آرہا تھا۔ بس میں اللہ کا نام لے کر میدان میں آگیا، اور اس کا نتیجہ بھی اچھا نکلا۔ اس سے پہلے چینی وہاں سے نکالے جا چکے تھے۔ ہماری تعداد چینیوں سے کہیں کم تھی اور ہم گولی سے اڑائے جا سکتے تھے۔ اور جنرل سمٹس نے جد و جہد کے شروع میں اعلان بھی کیا تھا کہ میں ان لوگوں کو یہاں سے نکالے بغیر نہ رہوں گا۔ مگر آخر کار اسی جنرل سمٹس کو کہنا پڑا کہ "ان لوگوں پر کتنا بھی تشدد کروں یہ عداوت کا جواب عداوت سے نہیں دیتے مارنے پر بھی جواب میں ہاتھ نہیں اٹھاتے۔ اگر وہ گالی کا جواب گالی سے دیں تو میری تشدد کرنے کی طاقت بڑھتی ہے مگر یہاں تو مجھے سمجھوتا کئے بغیر کوئی چارہ ہی نہیں۔"

یہاں تو بادشاہ خاں جیسی ایمان دار اور خدا پرست ہستی ہمارے ساتھ ہے۔ انھوں نے ہزاروں پٹھانوں سے ہتھیار چھڑا دیے۔ آگے چل کر کیا ہوگا، یہ میں نہیں جانتا، ہو سکتا ہے کہ ان

خدائی خدمت گاروں میں سب کے سب خدا کی خدمت کرنے والے نہ ہوں۔ پھر بھی جتنا کچھ ہے وہی بہت ہے۔ کیا اگر ان میں سے کسی کو ابلتے ہوئے تیل کے کڑھاؤ میں جھونک دیا جائے تو وہ خدا کا نام لیتا ہوا بغیر کسی قسم کے ڈر کے یا بدلہ لینے کے خیال کے جان دے دے گا؟ یہ تو بڑا اونچا درجہ ہے۔ تلوار سے لڑنے میں بھی بے شک بہادری ہے۔ مگر مارنے سے زیادہ بہادری مر جانے میں ہے جو بغیر ڈر کے دشمن کو ایذا پہنچائے بغیر مرتا ہے، وہی سچا بہادر ہے اور وہی میرے نزدیک سچا شہید ہے۔ مار کر مرنے والا نہیں۔ اگر ہمارا گرا ہوا ملک اتنا کر دکھائے تو یورپ کی تو بات ہی کیا ہے۔ ان کے پاس تو اتنا ساز و سامان ہے۔ اگر وہ لوگ اس بات کو سمجھ لیں کہ تھوڑی تعداد میں ہوتے ہوئے ہتھیار لے کر نکلنے میں تو بہادری ہے ہی۔ مگر اس سے کہیں زیادہ بہادری بغیر ہتھیار کے نکلنے میں ہے تو وہ لوگ خود بھی بچ سکتے ہیں اور دنیا کو بھی ایک بڑا سبق سکھا سکتے ہیں۔

انھوں نے خان صاحب سے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں خدائی خدمت گاروں سے دل کھول کر بات چیت کروں تاکہ میں ان سے اور وہ مجھ سے اچھی طرح واقف ہو جائیں۔ چنانچہ وہ اتمان زئی کی چارسدہ تحصیل میں تیرہ سالاروں سے، گیارہ اور بارہ تاریخ کو ملے اور پشاور میں پندرہ تاریخ کو

ایک اور جماعت سے۔ دونوں جگہ ان لوگوں نے گاندھی جی کے سوالات کے جواب میں انھیں یقین دلایا کہ وہ عدم تشدد کے اصول کو دل سے مانتے ہیں اور پوری طرح سے مانتے ہیں یہاں تک کہ جب گاندھی جی نے اُن سے پوچھا کہ بہ فرضِ محال اگر بادشاہ خاں عدمِ تشدد کی راہ سے قدم ہٹالیں تو تم کیا کروگے؟ تو انھوں نے صاف کہہ دیا کہ ہم کسی حال میں عدم تشدد کو نہیں چھوڑیں گے۔

خدائی خدمت گاروں کے افسروں کے ساتھ تبادلۂ خیالات کرتے ہوئے گاندھی جی نے جو کچھ کہا اس کا خلاصہ یہ ہے:-

میں یہاں آپ سے ملنے کے لئے اور یہ دیکھنے کے لئے آیا ہوں کہ آپ عدم تشدد میں کہاں تک پکے ہیں۔ بادشاہ خاں سے آپ کو عقیدت ہے۔ اُن کے کہنے سے آپ نے لاٹھی بندوق چھوڑ دی ہے۔ خدا ان کو بہت دنوں تک سلامت رکھے۔ لیکن آخر کار ہم سب کو ایک نہ ایک دن اس دنیا سے جانا ہوگا اور بادشاہ خاں کو بھی یہ دن پیش آئے گا۔ سوال یہ ہے کہ ان کے بعد آپ کیا کریں گے۔

ابھی سے اخباروں میں لوگ بادشاہ خاں کو گالیاں دینے لگے ہیں۔ مجھے ان سے بھی زیادہ گالیاں دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ میں یہاں آپ لوگوں کی طاقت چھیننے کے لئے آیا ہوں۔ صوبہ سرحد ہی ایک ایسا صوبہ ہے جسے ہندوستان میں اسلام کی حفاظت کی دیوار کہا جاسکتا ہے۔ یہاں کے لوگ بہادر ہیں، لاٹھی اور بندوق

رکھتے ہیں۔ میں ہتھیار چھین کر انھیں بزدل بنادوں گا نکما بنادوں گا اور اسلام کی اس دیوار کو گرادوں گا۔ ایک حد تک میں ان کی بات تسلیم کرنے کو تیار ہوں، لیکن اگر آپ عدم تشدد کی طاقت کو سمجھ گئے ہیں تو بندوق اور لاٹھی چھوڑنے پر آپ اپنے اندر پہلے سے بھی کچھ زیادہ طاقت محسوس کریں گے۔ یہ طاقت روحانی ہوگی اس کے ذریعے سے آپ صرف اسلام ہی کو نہیں بلکہ باقی سب مذہبوں کی بھی حفاظت کر سکیں گے لیکن اگر آپ اس کو پوری طرح نہیں سمجھے اور ہتھیار چھوڑ کر اپنے کو پہلے سے زیادہ طاقت ور نہیں بلکہ کمزور محسوس کرتے ہیں تو آپ اس اصول کو چھوڑ دیں۔ میرے اثر میں اگر ایک بھی پٹھان بزدل یا نکما بنے۔ اس کو میں کبھی گوارا نہیں کروں گا۔ اس سے تو مجھے یہ اچھا لگے گا کہ آپ ایک کے بجائے دو بندوق رکھیں آج سکھ کہتے ہیں کہ اگر ہماری کرپان چھن گئی تو ہمارا سب کچھ چھن گیا وہ سمجھتے ہیں کہ کرپان ہی ان کا مذہب ہے۔ کرپان چھوڑ دیں گے تو بزدل بن جائیں گے۔ میں اُن سے کہتا ہوں کہ ان کا یہ خیال غلط ہے اور یہی بات میں مسلمانوں سے بھی کہتا ہوں، آپ نے قرآن شریف پڑھا ہے، اور میں نے بھی پڑھا ہے، اتنی ہی عقیدت کے ساتھ جیسی عقیدت سے گیتا پڑھتا ہوں۔ اس کے علاوہ انگریزی اردو زبان میں اسلام پر اور بھی اچھی اچھی کتابیں ہیں، وہ بھی پڑھی ہیں میرے دل میں اسلام کی اور دوسرے مذہبوں کی اتنی ہی عزت

ہے جتنی اپنے مذہب کی ۔ میں آپ سے پھر روز الفاظ میں یہ کہنا
چاہتا ہوں کہ گو اسلام میں خوں ریزی تو بہت ہوئی ہے اور
دین کے نام پر ہوئی ہے ۔ مگر اسلام نہ تو تلوار کے ذریعے آیا ہے
نہ تلوار کے زور سے پھیلا ہے ۔ اسی طرح عیسائیت کے لیے بھی بہت
تلوار چلی ہے ، لیکن عیسائی مذہب تلوار کے زور سے نہیں پھیلا ۔ ہاں
تلوار ہاتھ میں لے کر ان لوگوں نے مذہب کے نام کو بٹہ ضرور لگایا
ہے ۔ آج یورپ میں کروڑوں آدمی اپنے آپ کو عیسائی کہنے اور
حضرت عیسیٰ کی محبت کا دم بھرنے کے باوجود آپس میں لڑتے اور ایک
دوسرے کا گلا کاٹتے ہیں یہ حضرت عیسیٰ کا بتایا ہوا راستہ نہیں
بلکہ ان کی تعلیم کا مضحکہ ہے ۔ جو چیزیں میں نے بتائیں اگر آپ مضحض
سمجھ گئے ہیں تو آپ یورپ کو بھی راستہ دکھا سکتے ہیں وہاں کے
لوگوں پر بھی اپنا اثر ڈال سکتے ہیں ۔ آج سترہ ہزار انگریزوں کا
لشکر ہمارے اوپر حکمراں ہے ، کیونکہ ان کے پیچھے انگریزی سلطنت
کی طاقت ہے ۔ اگر ہمارے سرخ پوش پکے خدائی خدمت گار
ہیں ، تلوار ، بندوق کو چھوڑ کر ان میں جو روحانی طاقت آگئی ہے
اُسے محسوس کرنے لگے ہیں اُسے پہچان گئے ہیں ۔ تو ایسے صرف
دس ہزار سپاہی ہماری آزادی کے لیے کافی ہیں ، کیونکہ ان کی پیٹھ
پر خدا کی طاقت ہوگی ۔ لیکن اگر ایک لاکھ کیا دس لاکھ بھی زبان سے
عدم تشدد کا دعوےٰ کریں اور دل میں تشدد موجود ہو تو وہ نکمے

ثابت ہوں گے۔ ہمیں اگر تلوار چھوڑنی ہے تو اس لئے کہ وہ ہمیں بزدل بناتی ہے، سچا بہادر نہیں بناتی، لیکن اگر تلوار چھوڑنے کے بعد بھی جو چھوڑنے کی چیز تھی وہ ہم نے نہ چھوڑی اور ہمارے دل میں تشدد ہی بھرا رہا تو اس صورت میں صرف ہاتھ سے تلوار چھوڑ دینا نہ صرف بےسود بلکہ خطرناک بھی ہے۔

دل سے تشدد نکال دینے کے آخر کیا معنی ہیں؟ اگر دل میں ڈاکو کی طرف سے غصہ اور ڈر موجود ہے تو سمجھو کہ ابھی دل سے تشدد دور نہیں ہوا۔ عدم تشدد کو پہچاننے کے معنی ہیں کہ ہم اس کی طاقت کو پہچانیں۔ روحانی قوت کو پہچانیں، اور خدا کو پہچانیں۔ خدا کو پہچاننے والے کے دل میں غصہ آ ہی نہیں سکتا۔ ڈر رہ ہی نہیں سکتا۔ خواہ اشتعال اور ڈر کا سبب کتنا ہی بڑا ہو۔ آپ میری لڑکی کو چھیننا چاہتے ہیں تو میں کیا کروں؟ بندوق سے مقابلہ تو کر سکتا ہوں، مگر دل میں یہ سوچوں گا کہ میری یا کسی اور انسان کی طاقت کیا۔ اصل طاقت تو خدا کی ہے اور آخر میں وہی بچاتا ہے میں لڑوں گا نہیں بلکہ میں ڈاکو سے کہوں گا کہ میں نے تیرا کچھ نہیں بگاڑا، اور نہ میری لڑکی نے کچھ بگاڑا ہے۔ اگر اس کے باوجود بھی تو اسے چھین کر لے جانا چاہتا ہے تو میرے جیتے جی ایسا نہیں کر سکتا پہلے مجھے مار ڈال پیچھے شاید لے جا سکے۔ میں سوچوں گا کہ اگر میں لڑا اور دو ایک کو مار بھی ڈالا تو بھی آخر میں جو باقی رہیں گے وہ

مجھے مار ڈالیں گے اور لڑکی کو اٹھا کر لے جائیں گے۔ اس کے برعکس میں نہیں لڑوں۔ کسی پر غصہ نہ کروں بلکہ صرف خدا سے دعا کرتا رہوں کہ انھیں سیدھا راستہ دکھائے، اور اسی طرح دعا کرتے کرتے مر جاؤں تو ممکن ہے کہ ڈاکوؤں کا دل پگھلے یا میری مثال سے میری لڑکی میں بھی اتنی ہمت اور طاقت آجائے کہ وہ اپنی حفاظت کے لئے جان دینے کو تیار ہو جائے۔ لڑنے سے زیادہ بہادرانہ اور پُر اثر یہ راستہ ہے، لڑ کر بھی میں اس سے زیادہ اور کیا کر سکتا تھا۔ جو آدمی تلوار چھوڑے اُسے بے کار نہ رہنا چاہئے۔ بے کار رہنے سے دماغ میں طرح طرح کے فاسد خیالات آتے ہیں جس سے انسان کا اخلاق بگڑتا ہے دماغ بھی جس نے تشدد کو چھوڑا ہے وہ تو چوبیس گھنٹے خدا کا نام لے گا اور خدا کا کام کرے گا۔ بے کار یا برے خیالات اس کے دل میں کبھی نہیں آسکتے۔ آج سرحد پار کے رہنے والے بعض لوگوں کا پیشہ ڈاکہ زنی ہے۔ چونکہ ان کے ہاں کھانے کو نہیں ہے۔ اسی لئے وہ ڈاکہ ڈالتے ہیں۔ پھر دشمنی اور بعض دوسری باتیں اس میں شامل ہو جاتی ہیں، اگر ہمارے پاس ایک لاکھ خدائی خدمت گار ہیں اور وہ سچے خدائی خدمت گار ہیں تو وہ ضرور ان لوگوں پر اپنا اثر ڈالیں گے۔ جیسا کہ سول نافرمانی کے زمانے میں ہوا تھا، وہی اب بھی ہوگا۔ اور ڈاکہ زنی وغیرہ سب ختم ہو جائے گی۔

جیسے بندوق کی لڑائی کے لئے تیاری کی ضرورت ہوتی ہے اور بہت کچھ سیکھنا پڑتا ہے۔ ویسے ہی عدم تشدد کے لئے تیاری اور تعلیم کی ضرورت ہے۔ مگر وہ تعلیم فوجی تعلیم سے مختلف ہوگی اور وہ تعلیم ہوگی تعمیری کام کی اور خلق خدا کی خدمت کی۔ ہمیں لکھنا پڑھنا آنا چاہیئے۔ تاکہ ہم ملک کے دوسرے حصوں میں رہنے والے ہم وطنوں کے خیالات، ضروریات، دقتوں اور مصائب سے واقف ہو سکیں۔

میرے نزدیک آج کل کی صورتِ حالات میں خدمت خلق کا بہترین ذریعہ چرخہ ہے جسے میں نے ۱۹۰۸ء میں دریافت کیا تھا مجھے یقین ہے کہ چرخے کو کھو کر میں نے اپنی طاقت کھو دی ہے۔ اسے اختیار کر کے ہم اپنی کھوئی ہوئی طاقت حاصل کر سکیں گے خدائی خدمت گار کا مطلب صرف سرخ پوش ہونا اور قطار میں کھڑا ہونا ہی نہیں بلکہ اس خدائی طاقت کو محسوس کرنا ہے جو تلوار کی طاقت کی ضد اور اس سے بڑھ چڑھ کر ہے۔ ابھی جبکہ آپ صرف عدم تشدد کے دروازے ہی پر ہیں اور اتنا کچھ کر سکتے ہیں تو جب عدم تشدد کی عمارت کے اندر داخل ہوں گے تو کتنا کچھ کر سکیں گے مگر جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں اس کے لئے تعلیم اور تیاری کی ضرورت ہے۔ اگر آپ نے یہ نہیں کی، اور یہ بات آپ کے ذہن میں نہیں بیٹھی تو آپ اس چیز سے ہاتھ دھو ڈالیں۔ آپ کو سمجھنا چاہیئے کہ جیسے

فن جنگ کا ایک علم ہے ویسے ہی عدم تشدد کا بھی علم ہے۔ جیسے یورپ نے فن جنگ کو درجۂ تکمیل تک پہنچایا ہے ویسے ہی ہمیں عدم تشدد کو بھی کرنا ہوگا۔ اس کے لئے مطالعے کی ضرورت ہے، فکر کی ضرورت ہے۔ غور و خوض کی ضرورت ہے۔ چھان بین کی ضرورت ہے۔ اگر اس علم کو بھی ہم پوری طرح حاصل کرنا چاہتے ہیں، یورپ پر اپنا اثر ڈالنا چاہتے ہیں اور حیوانیت کے درجے سے آگے بڑھ کر انسانیت کا درجہ حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اس کے لئے صرف عدم تشدد ہی کا راستہ ہے۔

بادشاہ خاں — یہاں کچھ پٹھان ہیں جو ہمارے خدائی خدمت گاروں کو بہت تکلیف دیتے ہیں۔ انھیں مارتے ہیں۔ ان کی زمینیں چھین لیتے ہیں۔ اس صورت میں یہ لوگ کیا کریں۔؟

گاندھی جی — انھیں یہ سب باتیں صبر اور تحمل سے برداشت کرنی ہوں گی۔ جو سختیاں پہلے انگریز کیا کرتے تھے وہی اب یہ لوگ کرتے ہیں۔ اس لئے ہمارا رویہ ان لوگوں کے ساتھ بھی وہی ہونا چاہئے جو سرکارِ انگریزی کے ساتھ تھا۔ ہمیں تشدد کا جواب تشدد سے اور گالی کا جواب گالی سے نہیں دینا چاہئے۔ ہمیں دل میں غصہ بھی نہیں لانا چاہئے۔ اس طرح مخالف لوگ ضرور ٹھنڈے پڑ جائیں گے۔ نہیں تو ہم ان کے ساتھ عدم تعاون کریں گے۔ اگر ہم ان کی زمینوں پر کام کرتے ہیں تو انھیں چھوڑ دیں گے اور ان سے

کہیں گے کہ اچھا جتنی سختی ہو کرلو مگر ہم اب تمھاری زمینوں میں کام نہیں کریں گے ۔ اپنی آن کو نہیں چھوڑیں گے، اور محنت مزدوری کرکے پیٹ بھریں گے ۔ اگر فاقہ کشی کی نوبت آئے گی تو اسے بھی برداشت کریں گے ۔ مگر آپ کی تابعداری نہیں کریں گے ۔ اپنے ضمیر کا خون نہیں ہونے دیں گے ۔

بادشاہ خاں —— مقدمہ کرکے پولس کی مدد سے انھیں سزا دلوانا ہمارے لیے جائز ہے ؟

گاندھی جی —— سچے خدائی خدمت گار کو عدالت میں نہیں جانا چاہیے ۔ عدالت میں جانے کا تو یہی مطلب ہوا نا کہ ہم ایک طرح سے نہیں تو دوسری طرح سے اُن سے لڑ رہے ہیں پولس سے سزا دلوانا بھی تو ایک قسم کا انتقام ہے ؟ سچے خدائی خدمتگار کو یہ نہیں کرنا چاہیے ۔ میں حال کا ایک واقعہ بتاتا ہوں ۔

سیواگرام میں کچھ ہریجن لوگ میرے پاس آئے اور کہا کہ ایک ہریجن وزیر کو سی) پی کی وزارت میں داخل کرادو، نہیں تو ہم تمھارے دروازے پہ بیٹھ کر ستیہ گرہ کریں گے ۔ میں جانتا تھا کہ یہ ایک شریر شخص کی سازش ہے ۔ پولس سپرنٹنڈنٹ نے میری مدد کے لیے پولیس بھیجنی چاہی کیوں کہ اس کو غنڈوں کی طرف سے خدشہ تھا ۔ مگر میں نے انکار کردیا ۔ اور ان لوگوں سے کہہ دیا کہ یہاں جس کمرے پر چاہو قبضہ کرسکتے ہو ۔ کھانے کی ضرورت ہوگی تو وہ بھی کھلاؤں گا لیکن

تم مجھے میرے اصول کے خلاف کوئی کام کرنے پر مجبور نہیں کر سکتے۔ تمھاری ہٹ دھرمی کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔ انھوں نے میری بیوی کا برآمدہ اور غسل خانہ پسند کیا۔ وہ ہم نے انھیں دے دیا۔ ہم ان کی دیکھ بھال کرتے تھے، ان کی ضرورتیں پوری کرتے کوئی بیمار ہوتا تو تیمار داری بھی کرتے تھے۔ آخر نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ہمارے دوست بن گئے

تشدد کا برداشت کرنا عدم تشدد کا پہلا قدم ہے۔ آخری نہیں۔ خدائی خدمت گاروں کا نظام فوجی طرز پر بنا ہے۔ مگر ان کے اور ملٹری کے کام میں بہت فرق ہے۔ فوج میں جو جگہ قواعد کی ہے وہی عدم تشدد میں خدمت خلق اور اس کی تیاری مثلاً فرسٹ ایڈ دیہاتوں کی صفائی، ہندوستانی زبان وغیرہ کی تعلیم کی ہے۔ خدائی خدمت گار کے پاس روزی پیدا کرنے کا کوئی ذریعہ ہونا چاہیے جو چھن نہ سکے۔ جیسے کتائی، بنائی یا کوئی اور دستکاری۔ بغیر سزا کا طریقہ اختیار کیے ہوئے جرائم پیشہ لوگوں کو سدھارنے کا یہ واحد ہتھیار ہے

خدائی خدمت گاروں کے افسروں کے ساتھ گاندھی جی کی بات چیت:-

"میں یہاں اس لیے آیا ہوں کہ آپ لوگوں سے ملوں۔ آپ لوگ جو کہیں وہ سنوں، اور لوگ آپ کے بارے میں جو کہتے ہیں وہ بھی

سنوں — آج اس صوبے میں، آپ کے دفتر میں ایک لاکھ خدائی خدمت گاروں کے نام ہیں کسی دوسرے صوبے میں شاید اتنے والنٹیر نہیں ملیں گے۔ اگر ہوں بھی تو ان میں اتنی تنظیم نہیں ہے۔ آپ سب ایک آدمی کے ماتحت ہیں، جو وہ کہے آپ کرنے کو تیار رہیں یہی آپ کی طاقت کا راز ہے۔ آپ لوگوں نے اپنا سارا نظام فوجی طرز پر بنایا ہے۔ جرنیل اور کرنیل کے خطاب بھی دیتے ہیں۔ مگر آپ کے کام میں اور ملٹری کے کام میں بہت فرق ہے۔ آپ نے جان بوجھ کر لاٹھی اور بندوق چھوڑ دی ہے۔ آپ نے اپنے ایڈریس میں مجھے بتایا ہے کہ عدم تشدد کی طاقت بہت بڑی طاقت ہے اور تلوار کی طاقت سے بڑھ کر ہے اور خود میرا تو یہ تجربہ ہے ہی کہ اگر عدم تشدد کی رہائی اچھی طرح منظم کیا جائے تو وہ بہت بڑا کام کرسکتی ہے۔ جنوبی افریقہ میں ہماری تعداد تیرہ ہزار تھی اور گورے لاکھوں بھرے پڑے تھے پھر بھی ہم ان سے لڑے اور کامیاب ہوئے۔ اگرچہ ہمارے لوگ کچھ بہت لکھے پڑھے نہ تھے مگر ایک بڑی بات ان میں یہ تھی کہ وہ سب میرے کہنے پر چلتے تھے، اُن میں ڈسپلن تھا۔ ان لوگوں نے سب مصیبتیں سہیں، گولی تو وہاں نہیں چلی مگر ہر طرح کی تکلیف کا انھوں نے خوشی سے خیر مقدم کیا۔ وہاں قیدخانہ یہاں کے قید خانے سے برا تھا۔ خوراک بدتر تھی۔ مگر پھر بھی قید خانوں میں، بچے، بڈھے، عورتیں سب گئے۔ کچھ لوگوں کو جلاوطن کیا

گیا جن کی پیدائش ہندوستان کی تھی۔ واپس بھیج دیا گیا۔ وہ لوگ خاموشی سے چلے آئے، اور سب کچھ شانتی سے برداشت کیا گولی بھی کھانی پڑی تو اسے ہنس کر برداشت کر لیتے۔ یہاں ہم کروڑوں کی تعداد میں ہیں اور محض ستر ہزار انگریز ہم پر حکومت کر رہے ہیں۔ یہ کیوں؟ یہ صرف اس لئے کہ ہم لوگوں نے عدم تشدد کی طاقت کو منظم نہیں کیا۔

آپ نے مجھے یقین دلایا ہے، اور میں آپ کا یقین کرتا ہوں کہ آپ عدم تشدد کو سمجھتے ہیں اور اس پر قائم رہیں گے۔ اگر سچ مچ آپ کی ایک لاکھ کی تعداد ایسے ہی لوگوں کی ہے تو ان کے ذریعے کیا نہیں کیا جا سکتا؟ کانگریس میں تو آج کل کچھ مطلبی لوگ بھی گھس آئے ہیں۔ مگر آپ ایک لاکھ آدمی صرف خدمت ہی کے لئے آئے ہیں۔ اس میں آپ کی کوئی ذاتی غرض نہیں ہے۔ پیسہ آپ کو نہیں ملتا۔ کپڑے تک بھی اپنے پاس سے بنوانے پڑتے ہیں۔ روٹی بھی اپنی جیب سے خرچ کر کے کھاتے ہیں۔ ایسی فوج کے ذریعے سے تو ہمارے ہندوستان کی آزادی حاصل کی جا سکتی ہے۔ آپ اس حد تک تو پہنچ گئے ہیں۔ وقت پڑنے پر سرکار کے تشدد کو برداشت کر لیا مار پیٹ سہہ لی۔ آج جیسا کوئی خاص موقع آیا تو کام بھی کر لیا۔ یہ سب بہت اچھا ہے مگر کافی نہیں۔ یہ پہلا قدم ہے آخری نہیں اس سے آزادی نہیں مل سکتی۔ آزادی کے لئے ہمیشہ کام کرنا

چاہیئے۔ آپ نے اپنے عہدے ملٹری والوں کے سے رکھے ہیں۔
جیسے کہ جرنیل اور کرنیل، سالار وغیرہ، ملٹری والے قواعد کرتے
ہیں۔ لڑنے کے وقت لڑتے ہیں فرصت میں کھیلتے ہیں۔ کھاتے
پیتے ہیں۔ بدعملی بھی کر لیتے ہیں، مگر ہمیں تو دن رات خدمت کرنا
ہے۔ یا اس کی تیاری کرنا ہے۔ آدمی جو کچھ دن بھر کرتا اور سوچتا ہے
رات کو خواب بھی اُسی کے دیکھتا ہے۔ فوجی آدمی خواب دیکھے گا
تو یہ کہ اگر جرنیل فلاں جگہ لڑنے کو بھیج دے تو میں خوب بہادری
دکھاؤں۔ ترقی پاؤں۔ آپ لوگوں کو تو یہ خواب آنے چاہئیں کہ
اگر فلاں جگہ یہ جھگڑا ہو اور بادشاہ خاں مجھے جھگڑا چکانے کے لئے
جان دینے کے لئے وہاں بھیج دیں تو میں وہاں دو فریقوں میں
صلح کرانے کی کوشش میں ختم ہو جاؤں اور دل میں غصہ تک نہ آئے
تو کیا اچھا ہو۔ آج لوگ بادشاہ خاں کو سرحد سے باہر بلاتے ہیں
تو میں روک دیتا ہوں۔ کیونکہ ابھی آپ کی تیاری مکمل نہیں۔ لیکن
جب آپ تیار ہو جائیں گے تو اگر کہیں جھگڑا ہو جائے جیسا آج کل
ملتان اور دہلی میں ہو رہا ہے تو وہاں امن قائم کرنے کے لئے ہم آپ
کو بھیج دیں گے۔ میں نے شانتی سینا قائم کرنے کی تجویز کی ہے۔ مگر
آپ تو پہلے ہی سے شانتی سینا میں ہیں۔ اس لئے آپ کو چاہیئے جہاں
جھگڑا ہو، وہاں جائیں۔ لوگوں کو سمجھائیں کہ آپس میں لڑتے ہو؟
خواہ مخواہ ایک دوسرے کو مارتے ہو؟ اگر مارنا ہی ہے تو ہمیں مارو۔

مگر اس کام کے لئے بہت تیاری چاہیئے - تعلیم چاہیئے ہمیں چوبیس گھنٹے اسی کا خیال کرنا اور اسی کے لئے کام کرنا ہوگا - ہم کو دیہاتوں کی صفائی کرنی ہوگی - ہم مریضوں کی دیکھ بھال کرنا سیکھیں گے - فرسٹ ایڈ سیکھیں گے - جہاں جس قسم کی مدد کی ضرورت ہوگی ویسی مدد دیں گے - یہاں تک کہ اس دیہات کا بچہ بچہ پہچاننے لگے گا - کہ یہ خدائی خدمت گار ہیں - ان کا کام ہی خدمت کرنا ہے - اسی طرح آپ کا نام ہوگا - اگرچہ ہمیں نام کی ضرورت نہیں ہے - مگر ان کاموں سے جب لوگ ہمیں اچھی طرح سمجھ جائیں گے تو ہمارا خدمت کا کام آسان ہو جائے گا -

پشتو کی تعلیم تو ہمیں حاصل کرنی ہی چاہیئے - لیکن اس کے علاوہ دوسروں کی خدمت کے لئے ہمیں ہندوستانی بھی سیکھنی ہے

ہمارے پاس روٹی پیدا کرنے کا ذریعہ ضرور ہونا چاہیئے آج آپ میں سے اکثر کے پاس زمین ہے - مگر کل وہ چھن سکتی ہے - جو خدا کی خدمت کرتے ہیں انھیں روٹی تو ضرور ملے گی مگر خدا بے ہاتھ پاؤں ہلائے روٹی نہیں دیتا - اس کے لئے کچھ نہ کچھ دھندا تو کرنا ہی ہوگا - دھندے ہی سے روٹی ملتی ہے - آپ لوگ سرخ پوش ہیں - میرا خیال تھا کہ آپ کھادی پوش بھی ہوں گے مگر میں دیکھتا ہوں کہ کھادی آپ میں سے بہت کم پہنتے ہیں شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کو اپنی وردی اپنے خرچ سے بنانی

پڑتی ہے۔ اور کھادی خریدنے کے لئے آپ کے پاس پیسہ نہیں ہو اگر آپ لوگ کاتنا، دھننا سیکھ لیں تو کھادی مفت میں تیار ہو سکتی ہے۔ اور کچھ پیسے بھی مل سکتے ہیں۔

اب یہ سوال ہے کہ ایک لاکھ خدائی خدمت گاروں کے ہوتے یہاں ڈاکے کیسے پڑتے ہیں۔ دوسری جگہ آپس میں لڑیں جھگڑیں مگر یہاں تو ایسا نہیں ہونا چاہیئے۔ اگر یہاں ایک بھی ڈاکو ہے تو ہمیں شرم آنی چاہیئے۔ مجھے تو آتی ہے۔ آج کل یہاں بعض لوگوں نے ڈاکہ زنی کو پیشہ بنا لیا ہے۔ کیونکہ ان کے پاس پیسہ کمانے اور روٹی پیدا کرنے کا دوسرا کوئی ذریعہ نہیں ہے ہم ان کے ساتھ دو طرح سے نپٹ سکتے ہیں۔ ایک تو جیسے سرکار کرتی ہے۔ یعنی جرائم پیشہ ایکٹ بنا کر دن میں اور رات میں ان کو تین تین چار چار بار تھانے میں بلا کر حاضری لیتی ہے اور اس طرح انھیں تنگ کرتی ہے۔ یا محبت سے سمجھا کر۔ میں یہ نہیں جانتا کہ جرائم پیشہ سب کے سب بد معاش یا ڈاکو ہی ہوتے ہیں۔ ہم انھیں بھی سمجھا سکتے ہیں۔ کہ جو ہم کرتے ہیں وہ تم بھی کرو۔ اس سے تمھیں روٹی ملے گی اور تم گناہ اور اس کے نتائج سے بھی بچو گے۔ یہاں ڈاکہ وغیرہ اس قدر بڑھ گئے ہیں کہ بچارے ڈاکٹر خاں صاحب پریشان ہیں کہ کیا کیا جائے۔ وہ یہ حالت ایک دن بھی دیکھنا نہیں چاہتے مگر لاچار ہیں، ایک تو ان کے پاس طاقت نہیں جو طاقت بھی دی

گئی ہے۔ وہ ایک کھلونا سا ہے۔ پولیس اور ملٹری ہمارے ہاتھ میں نہیں ہے۔ وہی پولیس جو ڈاکٹر صاحب کو سلام کرتی ہے اوپر سے حکم ملے تو انھیں ہتھکڑیاں لگا دے گی، مگر پھر بھی آج ہمارے پاس کچھ طاقت موجود ہے۔ ہم میں یہ صلاحیت ہونی چاہیئے کہ ہم یہ کھوج لگائیں کہ فلاں مجرم کہاں گیا ہے، وہاں جا کر اس سے ملیں اس کے ارد گرد کے لوگوں سے ملیں۔ انھیں سمجھائیں بجھائیں۔ ان میں رہ کر کام کریں، ان پر اپنا اثر ڈالیں۔ ان کے طریقہ معاش کو سدھاریں۔ اگر یہ نہیں کر سکتے تو یہ وزارت آپ کے بادشاہ خاں کے، میرے، سب کے لیئے باعثِ شرم ہوگی۔ میں اس ندامت میں شریک نہیں ہونا چاہتا۔

ڈاکٹر خاں صاحب کو آج مجبوراً سزا کا راستہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔ سزا نہ دیں تو جرم اور بڑھ جائیں۔ سرکار کے پاس دوسرا راستہ نہیں ہے۔ مگر ہمارے پاس تو ہے۔ ایک لاکھ آدمیوں کے لیئے یہ معمولی بات ہے۔ یہ اتنی بڑی جماعت اگر چاہے تو کیا نہیں کر سکتی۔ خدا نے ہمارے سامنے دونوں راستے رکھے ہیں۔ امن کا راستہ اور تشدد کا راستہ۔ اگر ہم امن کا راستہ پسند کرتے ہیں تو دوسرے کو مارنے کے بدلے خود مرنا، خدمت لینے کے بدلے خدمت کرنا ہوگا۔ اگر آپ یہ کرنے لگیں، اور چوبیس گھنٹے خدمت یا خدمت خیال میں لگے رہیں تو چند ہی سال میں آپ اس صوبے کی شکل بدل

سکتے ہیں۔

گاندھی جی نے کہا کہ اگرچہ بظاہر آپ لوگوں نے اس بات کے کہنے میں بے جا جرأت سے کام لیا ہے۔ مگر میں اپنی عادت کے مطابق مانے لیتا ہوں کہ یہ بالکل صحیح ہے۔ اس کے بعد انھوں نے ان لوگوں کو تفصیل سے سمجھایا کہ ان کے نزدیک عدم تشدد کا کیا مفہوم ہے اور اس کے لوازم کیا ہیں۔ یہ بات تو آسان ہے کہ قوی اور مسلح حریف کے مقابلے میں ایک قسم کے انفعالی عدم تشدد سے کام لیا جائے لیکن سوال یہ ہے کہ جب باہر کی کوئی قوت آپ کو دبانے کے لئے نہیں ہوگی تو کیا تب بھی آپ آپس کے تعلقات میں عدم تشدد سے کام لیں گے؟ آپ کا عدم تشدد طاقتوروں کا عدم تشدد ہے یا کمزوروں کا؟ اگر طاقتوروں کا عدم تشدد ہے تو تلوار کو ترک کرنے سے آپ کو اور زیادہ طاقت کا احساس ہونا چاہیے۔ لیکن اگر ایسا نہ ہو تو آپ کے لئے یہی بہتر ہے کہ ہتھیاروں کا استعمال جو آپ نے اپنی خوشی سے چھوڑ دیا ہے پھر شروع کر دیجئے۔ اس لئے کہ بہادر اور مسلح سپاہی ہونا نہتے اور بزدل ہونے سے اچھا ہے۔

گاندھی جی نے اس الزام کی تردید کی جو کئی لوگوں کی طرف سے ان پر لگایا جاتا ہے کہ انھوں نے پٹھانوں کو عدم تشدد کا سبق دے کر اسلام کو کمزور کر دیا ہے۔ انھوں نے کہا آپ نے اسلام کی قابل قدر خدمت انجام دی۔

اسی سلسلے میں انھوں نے فرمایا کہ خدا کی خدمت گار سے مراد وہ شخص ہے جو خدا کی یعنی خلقِ خدا کی خدمت کرتا ہو۔ اس کے لئے قول، عمل اور خیال کی پاکیزگی اور کسی مفید کام میں ہمیں مصروف رہنا ضروری ہے۔ اس لئے کہ بے کاری میں نفس پاک نہیں رہ سکتا۔ آپ کو چاہیئے کہ کوئی ہاتھ کا کام سیکھ لیں جو اپنے گھر پر کر سکیں۔ بہتر تو یہ ہے کہ آپ روئی دھنکنا، کاتنا اور کپڑا بننا سیکھیں۔ اس لئے کہ یہ ایسے کام ہیں جو لاکھوں آدمی اپنے گھر پر کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ آپ کو ہندوستانی زبان سیکھنا چاہیئے تاکہ آپ کے خیال میں وسعت پیدا ہو اور آپ باہر کی دنیا سے روشناس ہوں۔ حفظانِ صحت کی ابتدائی باتیں اور فرسٹ ایڈ بھی سیکھنا ضروری ہے۔ آخری مگر نہایت ہی اہم چیز یہ ہے کہ آپ کو سب مذہبوں کا احترام کرنا چاہیئے اور ان سے رواداری برتنی چاہیئے۔

ساتواں باب

پٹھانوں کے درمیان

دنیا میں جتنی اچھی اچھی چیزیں ہیں۔ سب ایک نہ ایک دن ختم ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ بادشاہ خاں نے گاندھی جی کے لئے آرام کی جو مدت مقرر کی تھی وہ اس مہینے کی ۱۵ر تاریخ کو سنیچر کے دن ختم ہو گئی۔ اس روز ہم اس ارادے سے چل کھڑے ہوئے کہ ضلع مردان کے مفصلات اور ضلع پشاور کی بقیہ تحصیل نوشہرہ کا دورہ کریں۔ یہ سفر مختصر تھا اور چھوٹی چھوٹی منزلوں میں بانٹ دیا گیا تھا اس لئے گاندھی جی کو ذرا بھی تھکن محسوس نہیں ہوئی۔ ہماری سواری کے لئے وہ موٹر بس لے لی گئی تھی جو پنڈت جواہر لال نہرو نے خدائی خدمت گاروں کو پروپیگنڈا کے لئے دی ہے۔ جب ہم اعلیٰ درجے کی پکی سڑک پر چلتے تھے تو دونوں طرف کے گاؤں کی پوری پوری آبادی گاندھی جی کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے اُمنڈ آئی تھی۔ یہ لوگ بالکل خاموش کھڑے رہتے تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں کتنا ڈسپلن ہے۔ ان لمبے تڑنگے پٹھانوں میں اس قدر

کشادہ دلی گرم جوشی متانت اور وقار ہے کہ انسان کا دل بے اختیار اُن کی طرف کھنچتا ہے۔ بار بار خیال آتا ہے کہ کاش ہندوستان کے اور حصوں میں بھی لوگوں کا مجمع اُن کی تقلید کرتا۔ ان میں ایک ہی کمزوری ہے، اگر اُسے کمزوری کہا جائے، کہ ان کا مہمان داری کا شوق حد سے بڑھا ہوا ہے۔ ممکن تھا کہ اس وجہ سے گاندھی جی کو دقتیں پیش آتیں مگر بادشاہ خاں نے پیش بندی سے کام لے کر لوگوں کو وقت پر سمجھا دیا تھا اس لئے یہ مہمان داری اعتدال کی حد سے نہیں بڑھنے پائی۔

البتہ ایک بار جب گاندھی جی اُتمان زئی کے باہر سیر کے لئے جا رہے تھے، اُن کو اپنی بس روک کر اُترنا پڑا تاکہ منت خاں کیلی (جس کا نام بادشاہ خاں کے ایک چچا کے نام پر رکھا گیا ہے) کے باشندوں کا پھلوں اور گنّوں اور ترکاریوں کا تحفہ قبول کریں۔ انھوں نے کہا کہ ہم چاہتے ہیں کہ آپ ہمارے ساتھ ہی رہ جائیں اور اس صوبے میں بود و باش اختیار کرلیں۔ اُن کے سردار نے کہا ہمارا آپ پر بڑا حق ہے، آپ نے ہمارے بادشاہ خاں صاحب کو نصیبت کے زمانے میں چھ سال تک اپنے ہاں رکھا۔ اب ہم آپ کو کم سے کم چھ مہینے تو مہمان رکھ سکتے ہیں۔ گاندھی جی اور سب لوگ یہ سن کر ہنسنے لگے۔ کوئی بیس پچیس بچے بھی گاؤں سے آگئے تھے تاکہ گاندھی جی سے ملیں، اور اُن سے مصافحہ کریں۔ اپنی ٹوپیاں

(جو مہمند قبائل میں استعمال ہوتی ہیں۔) اپنے معصوم سُرخ سُرخ چہرے شالوں میں ڈھکے ہوئے ایک ایک کرکے گاندھی جی کے پاس آتے تھے اور اُن کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر پٹھانوں کی شان سے مصافحہ کرتے تھے اور "ترامانئے" کہتے تھے اور پھر بڑے ٹھاٹھ سے "ککڑوں کوں" اکڑ کے ساتھ چلے جاتے تھے گویا اب اُن کی شان میں کئی انچ کا اضافہ ہوگیا ہے۔

پشاور سے نوشہرہ موٹر سے گھنٹے بھر کا راستہ ہے، جس وقت ہم روانہ ہوئے۔ نیلے آسمان پر سورج چمک رہا تھا اور ہوا میں بڑی خوش گوار خنکی اور تازگی تھی۔ میرا جی چاہتا ہے کہ حسن فطرت کے اس منظر کا جو ہماری آنکھوں کے سامنے تھا، مفصل نقشہ کھینچوں مگر میں اپنے قلم کو روکنے پر مجبور ہوں۔ دور تک دھندلے ارغوانی رنگ کا پہاڑوں کا سلسلہ چلا گیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ کسی زمانے میں یہ پہاڑ درختوں سے ڈھکے ہوئے تھے۔ مگر اب بالکل ننگے اور اُجڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔ بدھ تہذیب اور یونانی باختری تہذیب کی بے شمار نشانیوں کو دیکھ کر جو دریائے سوات اور دریائے کابل کی وادیوں میں ہر طرف پھیلی ہوئی ہیں چشم تصور کے سامنے ماضی کی تصویر پھر جاتی ہے۔ مگر گاندھی جی کی توجہ ان چیزوں کی طرف زیادہ نہ تھی۔ وہ خدائی خدمت گاروں کے خیال میں ڈوبے ہوئے تھے۔ انھوں نے اپنے سر ایک بہت بڑی ذمہ داری لی تھی۔ اُن کے

سامنے وہ لوگ تھے جو جنگ جو سپاہیوں کی حیثیت سے دنیا میں مشہور تھے۔ اب ایک شخص کے حکم سے اُنھوں نے ہتھیار رکھ دیے تھے۔ اور عدم تشدد کا اصول اختیار کر لیا تھا۔ گاندھی جی کو یہ فکر تھی کہ کس طرح اُن کو عدم تشدد میں کامل بنا لیں، تا کہ وہ ہندوستان کی جنگ آزادی کو سر کر سکیں۔ دیکھنا یہ تھا کہ اُن کو اپنی کوشش میں کہاں تک کامیابی ہوتی ہے۔

ہم سولہ تاریخ کو سہ پہر کے وقت دریائے کابل کو پار کر کے نوشہرہ پہنچے۔ نوشہرہ ایک بہت بڑا فوجی مرکز ہے اور رسالپور کی چھاؤنی اور ہوائی اڈے کی طرح، پشاور کی حفاظت کرتا ہے کیونکہ پشاور سرحد سے اس قدر قریب ہے کہ اس پر درۂ خیبر کی طرف سے اچانک حملہ ہو سکتا ہے۔ نوشہرہ میں بھی اُتمان زئی اور پشاور کی طرح گاندھی جی خدائی خدمت گاروں کے سالاروں سے ملے۔ اُنھوں نے ایک تحریری ایڈریس میں گاندھی جی کا شکریہ ادا کیا کہ آپ نے ہمارے ہاتھ میں عدم تشدد کے ہتھیار دیئے ہیں جو فولاد اور پیتل کے ہتھیاروں سے کہیں زیادہ بہتر اور اُن سے کہیں زیادہ زبردست ہیں۔ انھوں نے گاندھی جی کو یقین دلایا کہ ہم لوگ عدم تشدد پر کامل عقیدہ رکھتے ہیں جس کا ثبوت سول نافرمانی کی تحریک میں ہمارے طرز عمل سے مل چکا ہے اور ہم اس عقیدے کو کبھی نہیں چھوڑیں گے

سپاسنامہ کا کچھ ضروری حصہ ہدیہ ناظرین کیا جاتا ہے۔

آپ کا عدم تشدد کا سکھایا ہوا سبق جس طرح ہم صوبہ سرحد والوں نے پڑھا، اور اس پر عمل کیا ہے اگر اس کے متعلق ایک کلمہ فخر کا کہدیں تو بے جا نہ ہوگا۔ اور امید ہے کہ آپ ناراض بھی نہ ہوں گے۔ کیوں کہ تشدد ہمارا پیشہ تھا جو "فخر افغان" نے ہم سے چھڑا دیا۔ ورنہ پیدائشی عدم تشدد والوں کا عدم تشدد بے معنی ہے۔ اس نسخے کے استعمال کا مریض اگر کوئی تھا تو وہ پٹھان تھا اور اس نسخے کو کسی نے سمجھا تو وہ بھی پٹھان نے۔ پٹھان اور مسلمان جس کے مذہب کا اصل اصول عدم تشدد تھا اور تشدد اس کی استثنیٰ۔ اصول کو بالکل بھول کر استثنیٰ کو مذہب بنا چکا تھا مگر پٹھان کے قائد نے اس کو اپنا بھولا ہوا اصول پھر یاد دلا دیا۔ ہم آپ وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ اس صوبے کے باشندے جو سب "پٹھان" ہیں (کیا ہندو اور کیا مسلمان) قلیل ترین عرصے میں آزادیٔ وطن کی فوج کے بہترین سپاہی بن کر آپ کے دوسرے حکم پر میدانِ جنگ میں آجاویں گے۔ اور امید ہے کہ اس سیلاب کو پھر روکنا شاید دفتریوں کے لئے مشکل بھی ہو جائے۔

اس وقت سے لے کر کہ اس ملک کی غلامی کی تشخیص آپ نے کی۔ اور اس کے علاج کے لئے آپ نے نسخہ تجویز کیا۔ یہ صوبہ سرزمانے میں آپ کی امداد کا خواہش مند رہا جو بالآخر اس کو ملی اور آپ کو

اپنے اندر لے آگر رہا۔ اور ممکن ہے کہ ہمیشہ کے لیے آپ کو اپنا بنالے
اس لئے کہ اصل حالت اس صوبے کی جس طرح باقی صوبجات سے
قبل از اصلاحات جدا تھی اب بھی اسی طرح جُدا ہے۔ پہلے اگر قوانین
جشیانہ تھے تو اب ملازمین برطانیہ نافرمان ہیں۔ کانگریس وزارت
تو ہے، مگر ملازمین ہماری وزارت سے تعاون نہیں کر رہے ہیں۔
یہ بھی مرض ہے۔ اس کا بھی علاج آپ کو بتانا ہے۔ آپ سے بہتر
ڈاکٹر ہم کو مل نہیں سکتا۔ نسخہ تجویز کرکے تشریف لے جاویں ؟
گاندھی جی نے ان کے اڈریس کے جواب میں کہا کہ میں آپ
کی اس بات کو پوری طرح جانتا ہوں کہ آپ نے عدم تشدد کے اصول
کو سمجھ لیا ہے اور اس پر ہمیشہ قائم رہیں گے۔ میں آپ کو
مبارک باد دیتا ہوں اور یقین دلاتا ہوں کہ اگر آپ نے اس اصول پر
پورا پورا عمل کیا تو آپ دنیا کی تاریخ کو بدل دیں گے۔ انھوں نے
بتایا کہ ایک خدائی خدمت گار اور ایک معمولی سپاہی کی تربیت
اور طرزِ عمل میں کیا فرق ہونا چاہیئے۔ انھوں نے کہا کہ معمولی
سُرخ پوشوں کے دل میں جب سچا عدم تشدد پیدا ہوگا
تو سورج کی گرمی کی طرح ہر شخص اس کو خود بخود محسوس کرے گا۔
ہر مرد، عورت، بچہ، بوڑھا اُن کی نیکی کا معترف ہوگا اور جو حکومت
کی پوری طاقت نہیں کرا سکتی اُن کا ایک اشارہ وہ کام کرا سکے گا
خدائی خدمت گار جیل میں سرکار کو ستانے کے لئے نہیں

اپنی معصومیت کا ثبوت دینے کے لئے جائے گا۔ اس کی قانون کی پابندی کی صلاحیت کم نہ ہوگی۔ وہ اخلاقی مجبوری سے قانون شکنی کرے گا۔ چور، ڈاکوؤں کے جیل جانے سے آزادی نہیں مل سکتی بے گناہ کی قربانی ہی نتیجہ خیز ہوتی ہے۔ سول نافرمانی کرنے والے کو خدا کا فرماں بردار بننا پڑے گا۔

(مردان تحصیل کے خدائی خدمت گاروں کے افسروں سے بات چیت)

گاندھی جی:۔ آج کئی دنوں سے میں خدائی خدمت گاروں کے افسروں سے مل رہا ہوں۔ یوں تو میں آج کل خاموش رہتا ہوں۔ آپ یہ بھی دیکھتے ہیں گلا خراب ہو جانے کی وجہ سے میری آواز بھی نہیں نکلتی ہے۔ فقط آپ سے بات چیت کرنے کے لئے خاموشی کو چھوڑتا ہوں۔

کیا آپ لوگ عدم تشدد کی خوبیاں سمجھ گئے ہیں؟ اور موقع پڑا تو اس پر قائم بھی رہیں گے؟ مجھے سب جگہ سے اس کا جواب "ہاں" میں ملا ہے۔ اس سے مجھے بڑی خوشی اور تسلی ہوتی ہے۔ مگر جوں جوں میں آگے بڑھتا ہوں مجھے اپنی ذمہ داری کا احساس زیادہ ہوتا جاتا ہے۔ کیا آپ لوگ جو کچھ کہہ رہے ہیں، سوچ سمجھ کر کہہ رہے ہیں؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ ایک رواج سا بن گیا ہے۔ اس لئے آپ سب لوگ ہاں کہہ دیتے ہیں؟ اگر آپ سچے دل سے ہاں کہہ رہے ہیں تو

آپ کو اس پر قائم رہنا چاہیئے۔ میں سوچتا ہوں کہ اور کچھ کہنے سے پہلے آپ سے پھر اتنا پوچھ لوں، کیا واقعی یہ بات آپ کے دل پر جم گئی ہے؟ کیا سچ مچ آپ اس پر قائم رہنا چاہتے ہیں؟

سب نے مل کر جواب دیا "ہاں"

ایک آواز:۔ ہم اور تو سب کچھ برداشت کر لیتے ہیں مگر جب لوگ ہمارے بزرگوں کو گالی دیتے ہیں تو وہ برداشت نہیں ہوتا۔

گاندھی جی:۔ (ہنس کر) بس چلو چھٹی ہوئی۔ اصلی امتحان تو یہی ہے۔ ویسے تو سب لوگ ایک حد تک برداشت کر لیتے ہیں بات تب ہے کہ امتحان کا موقع آئے اور آپ برداشت کر لیں۔ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ کوئی سردار کو بُرا بھلا کہے، گالیاں دے تب بھی آپ برداشت کریں گے۔ تحمل کا دامن نہ چھوڑیں گے۔ اور دل میں بھی غصہ نہ آنے دیں گے۔ اگر آپ اس حد تک عدم تشدد کو سمجھ گئے تو میں آپ کو اور بادشاہ خاں کو مبارک باد دیتا ہوں۔ اس سے ضرور ہندوستان کا بھلا ہوگا۔ مگر صرف زبانی ماننے سے عدم تشدد نہیں آجاتا۔ اس کے عملی ثبوت کی ضرورت ہے۔ سورج کا نکلنا چھپا نہیں رہ سکتا۔ اندھے کو بھی اس کی گرمی محسوس ہوتی ہے۔ اسی طرح ایک لاکھ خدائی خدمت گاروں کے دل میں سچا عدم تشدد پیدا ہوگا تو اس کا نور سورج کے نور سے بھی کہیں بڑھ چڑھ کر ہوگا۔

جو لوگ جان بوجھ کر انجان بنتے ہیں انھیں بھی پتہ چل جائے گا۔ کہ آج صوبہ سرحد میں آپ جیسے لوگ پیدا ہو گئے ہیں۔ اگر آپ اپنے دل سے غصہ نکال ڈالیں، بدزبانی چھوڑ دیں (لاٹھی چھری تو پہلے ہی چھوڑ چکے ہیں) تو آپ خود چاہیں تب بھی اس بڑی تبدیلی کو نہیں چھپا سکیں گے۔ اور آپ کے آس پاس کے لوگوں پر بھی اس کا اثر پڑے بغیر نہ رہے گا۔ آپ لوگوں کو جاننا چاہیے کہ جنوبی افریقہ میں کافی تعداد پٹھانوں کی بھی تھی اور وہ ستیہ گرہ کی لڑائی میں شامل بھی ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک ایک کو میں پہچانتا تھا۔ کئی تو میرے موکل تھے۔ مگر میں صرف ان کا وکیل ہی نہ تھا ان کو سیاسی تعلیم دینا بھی میرا کام تھا۔ اگر کسی کے پیٹ میں درد ہوتا یا کسی کا سر دکھتا تو دوائی بھی دیتا تھا۔ اس طرح سے میں ان کا دوست تھا اور وہ میرے دوست تھے، اور میں جو کچھ بھی کہوں کرنے کو تیار ہو جاتے تھے اور خود چاہے کچھ بھی کریں مجھے آکر بتا دیتے تھے۔ یہاں تک کہ ذرا سی بات بھی نہیں چھپاتے تھے۔ میرا ان کے دل میں ایک طرح کا ڈر تھا۔ وہ جانتے تھے کہ اس آدمی سے کچھ نہ چھپا سکیں گے۔ اور اگر کوئی برا کام کر بیٹھے تو وہ سخت ڈانٹ پلائے گا۔ میری ڈانٹ سے وہ کیوں ڈرتے تھے؟ ویسے تو ان میں سے ہر ایک آسانی سے جیب میں رکھ سکتا تھا۔ میرا جسم دیکھنے میں جیسا آج کمزور سا ہے ویسا ہی اس وقت بھی تھا۔ انھیں ڈر تھا۔ تو میری محبت کا۔

وہ مجھ سے بہت محبت کرتے تھے۔ اس لئے مجھ سے ڈرتے بھی تھے میں پٹھانوں کو خوب پہچانتا ہوں۔ انسانوں کو قتل کر ڈالنا اُن کے نزدیک اتنی ہی معمولی بات ہے۔ جیسے کہ مرغی یا بکرے کو کاٹ ڈالنا۔ وہ مارنے کو ہمیشہ تیار رہتے ہیں۔ لوگوں کو پٹھانوں کا ڈر رہتا ہے۔ کیونکہ وہ لاٹھی چلانے میں ماہر ہیں۔ پتھر پھینکنا بھی جانتے ہیں۔ شاید ہی کوئی پٹھان ہو جسے بندوق یا چھری چلانی نہ آتی ہو۔ میں پٹھان کی لاٹھی کی طاقت کو خوب پہچانتا ہوں اگر میر عالم کی لاٹھی سر کے بجائے پیٹھ پر نہ پڑی ہوتی تو میں آج یہاں نہ ہوتا۔ لیکن آج میں یہ دیکھتا ہوں کہ وہ پٹھان جو بچپن ہی سے لاٹھی بندوق چلانا جانتے ہیں .... اور جن کے لئے انسان کو مار ڈالنا معمولی بات ہے۔ انھوں نے بادشاہ خاں کے کہنے سے لاٹھی اور بندوق چھوڑ دی ہے اور وہ سمجھ گئے ہیں کہ جو چیز بادشاہ خاں ان کو دینا چاہتے ہیں یعنی عدم تشدد وہ لاٹھی اور بندوق سے زیادہ طاقت ور ہے۔ اگر سچ مچ آپ یہ بات سمجھ گئے ہیں۔ اور سب پرانی باتیں بھول گئے ہیں۔ اپنے پرانے رسم و رواج کو اس طرح سے اُتار پھینکا ہے۔ جیسے سانپ اپنی کینچلی کو اگر ایک لاکھ خدائی خدمت گاروں نے عدم تشدد کو اس طرح اپنا لیا ہے تو مجھے یہ ایک معجزہ سا لگتا ہے۔ بادشاہ خاں کی کیا طاقت تھی کہ وہ سب آپ سے کروا سکتے۔ یہ طاقت تو انھیں خدا ہی نے دی ہے۔ کہ وہ اس طرح

آپ کا دل بدل سکے۔ اس میں صوبہ سرحد کی بھلائی ہے۔ ہندوستان کی بھلائی ہے اور اس سے ہمارے دین اور دنیا دونوں سدھر جاتے ہیں۔

آپ نے مجھے یقین دلایا ہے کہ آپ عدم تشدد کے پابند رہیں گے۔ اگر آپ جو کہتے ہیں۔ وہ ٹھیک ہے۔ (مجھے "اگر" کہنا پڑتا ہے۔ کیونکہ یہ کوئی معمولی بات نہیں، بڑی بھاری بات ہے۔ بہادری کی بات ہے) تو آپ بڑا کام کر سکتے ہیں۔ آپ بہادر ہیں۔ مرنا مارنا جانتے ہیں۔ مگر میں اس سے بڑھ کر بہادری کی توقع آپ سے رکھتا ہوں۔ وہ بہادری کیا ہے؟ وہ طاقت کون سی ہے؟ اس کی کیا نشانی ہے؟ جو نشانی میں دیکھنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے۔ جب میں یہاں بچے بچے سے پوچھوں کہ کیا آپ خدائی خدمت گاروں کو پہچانتے ہیں۔ عورتوں سے پوچھوں۔ تانگے والوں سے پوچھوں۔ تو مجھے جواب ملے کہ ہاں پہچانتے ہیں۔ اگر وہ لوگ آپ سے ڈرتے ہیں تو آپ سچے خدائی خدمت گار نہیں۔ آپ کی زبان میں ایسی مٹھاس ہونی چاہیئے۔ آنکھ میں وہ نور ہونا چاہیئے کہ ہر کوئی سمجھ جائے کہ یہ خدائی خدمت گار ہے۔ اس سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے اور وہ لوگ خوشی سے وہی کام کریں جو آپ ان سے کروانا چاہتے ہیں۔ اگر آپ کو کہیں کوئی اکیلی اور بے یار و مددگار عورت ملے تو بجائے ڈرنے کے وہ یہ محسوس کرے کہ میں اس شخص کے سائے میں پوری طرح سے محفوظ

ہوں۔ آج سرکار شارع عام پر تھوکنے سے روکنے کے لئے یا دوسری کسی غلاظت کو بند کرنے کے لئے قانون بناتی ہے۔ تب بھی کام نہیں چلتا۔ خدائی خدمت گار کو لوگوں کے دلوں میں اس طرح سے گھر کر لینا چاہیئے کہ اس کا لفظ بھی ان باتوں کو روکنے کے لئے کافی ہو۔

آج ہٹلر کی آواز سے لاکھوں دل کانپ جاتے ہیں ابھی مسٹر چیمبرلین اور فرانس کے ایلچی ولادیئر اپنی بات منوانے کو خود اس کے پاس گئے سلطنت فرانس اور برطانیہ کی ساری طاقت اُن کے پشت پر تھی۔ پھر بھی اپنا سامنہ لے کر آنا پڑا۔ یہ ایک قسم کی طاقت کی مثال ہے۔ یہ طاقت ہے لاٹھی کی۔ ہٹلر اور مسولینی دنیا کو کوئی نئی چیز نہیں دے رہے۔ مگر جس طاقت کا ذکر آج میں خدائی خدمت گاروں کے سامنے کر رہا ہوں۔ وہ بالکل ایک نئی قسم کی اور جُدا چیز ہے۔ مثال کے طور پر اگر خدائی خدمت گاروں کا ایک اشارہ ہندوستان کی سب رعایا سے وہ کام کرا سکے جو کہ سرکار اپنے قواعد اور قوانین کے زور سے بھی نہیں کرا سکتی تو ان کو کون سی طاقت کی ضرورت ہوگی؟ کیا ان کی طاقت مسولینی یا ہٹلر کی طاقت سے کہیں بڑھ چڑھ کر نہ ہوگی۔

وہ طاقت ہے۔ محبت کی، عام تشدد کی، اگر میں ہر طرف سے جیسا کہ میں ابھی ذکر کر چکا ہوں۔ اس قسم کی نشانیاں دیکھوں تب میں آپ کو سچا خدائی خدمت گار سمجھوں گا۔ اور میں یہ سمجھوں گا کہ ہندوستان کی آزادی سچ مچ قریب ہے۔ خدائی خدمت گار

کو کیسی زندگی بسر کرنی چاہیئے؟ ان کو کیا تعلیم ملنی چاہیئے؟ آج کل
میں جو میں گھنٹے یہی سمجھا رہا ہوں۔ انھیں دن رات خدمت ہی کا
خیال رہنا چاہیئے۔ عدم تشدد کے ذریعے سے لڑائی کرنے کے
لئے انھیں ہر وقت تیار رہنا چاہیئے۔ عدم تشدد کی لڑائی
میں آزادی کے لئے سلطنت کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنی جان
قربان کرنے کی طاقت تو ان میں ہونی ہی چاہیئے۔ چاہے مقابلہ
سلطنت سے ہو یا اپنے بھائیوں سے۔ وہ امن کے واحد ہتھیار
کو کبھی نہ چھوڑیں۔ ان کا ہمیشہ ہی ایک طریقہ رہے یعنی امن کا۔ عدم
تشدد کا، مگر اپنے بھائیوں سے ہمیں لڑنا ہی کیوں پڑے؟
اگر وہ ہماری مخالفت کرتے ہیں تو ہم برا کیوں مانیں؟ ان
پر غصہ کیوں کریں؟ میں یہ نہیں مانتا کہ وہ سب برے آدمی
ہیں۔ اگر آپ دیکھیں تو معلوم ہو کہ ان میں کچھ بھلے آدمی بھی ہیں
مگر آج ان کے دل میں یہ خیال بیٹھ گیا ہے کہ کانگریس بدمعاش
لوگوں کی جماعت ہے۔ اس کا ساتھ دینے والے یا تو خود
بدمعاش ہیں یا بدمعاش لوگوں کے زیر اثر ہیں۔ ان کے
ہنچے سے ملک کو چھڑانا چاہیئے۔ ہمیں اپنے مخالفین کا نقطۂ نگاہ
سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ تبھی ہم اس کا علاج بھی کر سکیں
گے۔ غصے سے یہ علاج نہیں ہو سکتا۔ ہمیں اپنے عمل سے
بتا دینا چاہیئے کہ ہم بدمعاش نہیں۔ بے ایمان نہیں، خود غرض

نہیں ہیں۔ ہمیں پیسہ نہیں چاہیئے۔ طاقت نہیں چاہیئے۔ صرف اپنے ملک کی آزادی چاہیئے۔ اگر ہم سچے ہیں۔ سچ مچ ہمارے دل میں آزادی کی لگن ہے۔ اس کے لئے سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہیں تو ہمارے مخالفین ضرور آخر میں غلطی کو محسوس کریں گے اور جیسے موم آگ کے پاس آ کر پگھل جاتا ہے۔ ہماری محبت اور ایثار ان کے دلوں کو پگھلا دے گا۔ اب فرض کرو کہ اس طرح کرتے کرتے ہم جیل چلے گئے اور وہاں ہمیں کسی نے گالیاں بھی دیں تو ہمارے دل میں غصہ نہیں آئے گا۔ آنکھ لال نہیں ہونے پائے گی۔ اگر غصہ آ گیا تو ہمارا جیل جانا بے کار ہوا۔ بادشاہ خاں ہی کو لیجئے۔ آپ نے انھیں بادشاہ خاں، فخر افغان وغیرہ کے محبت بھرے نام دئے ہیں۔ جیل میں اگر وہاں کے سپاہی انھیں گالی دیں۔ اور انھیں یا آپ کو غصہ آئے کہ اس دو ٹکے کے آدمی کی یہ کیا مجال کہ انھیں گالی دے! تو بادشاہ خاں اور آپ جیل جانے کے لائق نہیں۔ ہمیں یہ سب باتیں شانتی سے برداشت کرنی چاہیئے۔ ہم جیل میں جاتے ہیں تو سرکار کو ستانے کی غرض سے نہیں بلکہ اپنی بے گناہی کا اپنے عدم تشدد کا جیتا جاگتا ثبوت دینے کے لئے۔ میں جانتا ہوں کہ ایسے کم آدمی جیل گئے ہیں۔ عام لوگوں نے یہ سمجھا کہ صرف جیل جانے ہی سے آزادی مل جائے گی حالانکہ انھیں سرکار کو دکھانا تھا کہ اگر سرکاری لوگ سختی بھی کریں

زیادتی بھی کریں تو بھی ہمیں غصہ نہیں آتا۔ ہم میں قانون کی پابندی کی صلاحیت کچھ کم نہیں مگر صرف اخلاقی مجبوری سے ہم اس کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ اگر ایسے سچے آدمی ہزاروں کی تعداد میں جیل گئے ہوتے تو آزادی مل گئی ہوتی۔ مگر میرے ساتھیوں ہی نے میرے سامنے قبول کیا کہ تم جو کہتے ہو وہ ہے تو ٹھیک مگر ہمارے گلے نہیں اترتا۔ ہمارے دل میں تو بندوق بھری ہے۔ مگر ہم جانتے ہیں کہ اس سے اس وقت کام نہیں چل سکتا۔ اس لئے تمہاری بات اس وقت مانے لیتے ہیں۔ تب جیل جانے سے کچھ نتیجہ نکلا مگر جتنا ہم چاہتے تھے اتنا نہ نکلا۔

جب ملیشیا میں میں نے لڑائی موقوف کی تو میں نے اعلان کیا تھا کہ یہ ہم اس لئے نہیں کرتے کہ ہم کمزور ہو گئے ہیں۔ ہاں لوگ جیل جانے کو تیار نہیں بلکہ اس لئے کہ تشدد بھرے دل سے جیل جانے سے فائدہ نہیں ہو سکتا۔ قربانی کے لئے اہلیت چاہئے۔ اب سوال یہ ہے کہ قربانی کا حق کسے ہے؟ اس کے لئے کیسی اہلیت ہونی چاہئے۔ کیسی تیاری چاہئے؟ یوں تو چور ڈاکو بھی جیل جاتے ہیں۔ مار کھاتے ہیں۔ مگر ان کا یہ کام قربانی تھوڑا ہی ہوگا۔ وہ تو اپنے گناہوں کی سزا پاتے ہیں جسے قربانی دینا ہے اسے بے گناہ ہونا چاہئے۔ صاف دل پاک دامن ہونا چاہئے۔ تبھی اس کی قربانی کی کوئی قیمت ہوگی۔ تبھی اس کی قربانی کا کوئی نتیجہ بھی ہوگا۔ جس کے

لئے ہمیں قربانی دینی ہے۔ پہلے ہمیں اس کی خدمت کرنی سیکھنا چاہیئے۔ بس خدائی خدمت گار کو سب سے پہلے خلق خدا کا خادم ہونا چاہیئے۔ آج ہندوستان کے کروڑوں بھوکوں کی خدمت کا بہترین طریقہ چرخہ اور کھدر ہی ہے۔ بھوکے کو بھکاری بنانے سے کچھ فائدہ نہیں۔ چرخہ کسی کو بھکاری بنائے بغیر امداد دیتا ہے۔ آج لاکھوں روپے اس کے ذریعے ہندو مسلمان عورتوں کے گھروں میں پہنچتے ہیں۔ اسی طرح آپ تھوڑا سا بیماریوں کا علاج اور فرسٹ ایڈ کا کام سیکھ لیں تو غریبوں کی خاصی خدمت کر سکیں گے۔ اپنے صوبے سے باہر کے لوگوں کی خدمت کرنی ہو اور وہاں کے حالات سے واقف ہونا ہو تو پشتو کے علاوہ ہندوستانی بھی آنی چاہیئے ہیں یہ سب باتیں آپ سے اس لیئے کہتا ہوں کہ میری آنکھوں کے سامنے اس دن کا نقشہ ہے جب آپ کو اپنے صوبے سے باہر سارے ہندوستان میں خدمت اور آزادی کے لئے نکلنا پڑے گا۔ اس وقت ہندوستانی آپ کے کام آئے گی۔

آج کے زمانے میں جیل جانا بجائے خود کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ جیل جانے کی صلاحیت ہونی چاہیئے۔ سرکار کو خود احساس ہونا چاہیئے کہ بے گناہوں کو جیل میں ڈال کر حکومت نہیں چل سکتی روحانی طاقت خدا کی دین ہے۔ اگر دل میں خدا نہیں تو کلمہ یا گائتری پڑھنا محض طوطے کی رٹ ہے۔

صوابی تحصیل کے خدائی خدمت گاروں کے افسروں سے گاندھی جی نے بات چیت کرتے ہوئے کہا: میں آپ سے کہنا چاہتا ہوں کہ اگرچہ میں بعض دوسرے کام بھی کرتا ہوں۔ مگر میرا دل دن رات آپ ہی میں پڑا رہتا ہے۔ اُٹھتے بیٹھتے، کھاتے پیتے آپ کی صورت آنکھوں کے آگے رہتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے آپ لوگوں سے بڑی بڑی اُمیدیں باندھ رکھی ہیں اور وہ اب سے نہیں برسوں سے ہیں۔ لاہور کانگریس کے موقع پر آپ لوگ ایک بڑی تعداد میں آئے تھے۔ اس سے پہلے میری ملاقات بادشاہ خان سے نہیں ہوئی تھی۔ وہیں پہلی دفعہ جان پہچان ہوئی۔ اس کے بعد وہ جیل بھیج دیئے گئے۔ رہا ہوتے ہی وہ میرے پاس آئے۔ اور میرے ساتھ ہی رہے۔ تب سے میرے دل میں یہ خیال پیدا ہو گیا ہے کہ آپ لوگوں کے ذریعے بڑا کام کیا جا سکتا ہے۔ اگر میری یہ امید بر آتی ہے تو میرے جیسا آدمی یوں ہی نہیں بیٹھا رہ سکتا۔ بعد میں مجھے یہ کہنا پڑے کہ میں نے تو ان لوگوں کا اعتماد کر لیا تھا مگر ان لوگوں نے اپنے عہد کے مطابق عدم تشدد کو نہیں نبھایا۔ تو خدا کے دربار میں بھی میں ذمہ داری سے بری نہ ہوں گا۔

اگر میں آپ لوگوں سے پوچھوں تو آپ بھی ضرور وہی جواب دیں گے جو دوسری جگہ خدائی خدمت گاروں نے دیا ہے یعنی آپ عدم تشدد کو سمجھتے ہیں، اور لڑائی کے وقت اس پر قائم رہیں گے؟

لڑائی تو آج بھی جاری ہے صرف صورت بدلی ہوئی ہے۔ بجائے جیل خانے کے ہم اسمبلی میں جا کر حکومت سے بھڑتے ہیں۔ ۱۹۳۱ء اور اس کے بعد کی لڑائی میں جیل جانے، لاٹھیاں کھانے اور سختیاں سہنے کے امتحان میں آپ پاس ہو چکے ہیں۔ مگر میری نظر میں یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ اس کی زیادہ اہمیت اس زمانے میں تھی جب جیل جانا شرم کی بات سمجھی جاتی تھی مگر اب تو ہم نے جیل جانے کو اپنا پیشہ بنا لیا ہے، جیل کو گھر بنا لیا ہے۔ اب جیل جانا کوئی شرم کی بات نہیں۔ اس لئے اب جیل جانے کی اتنی اہمیت نہیں رہی۔ میری نظر میں تو جیل جانے کی بجائے خود کبھی قدر تھی ہی نہیں۔ اصل قدر جیل جانے کی قابلیت ہو سکتی ہے۔ جب میں پہلی بار جنوبی افریقہ میں جیل گیا تو میں نے خدا سے دعا کرنے کے بعد اپنے دل سے پوچھا کہ کیا میں واقعی اس کے قابل ہوں! کیا میرا دل صاف ہے! یا میں محض لوگوں کو دھوکہ دے رہا ہوں۔ جب ہم بغیر کسی قصور کے جیل جاتے ہیں تو ہمیں موقع ملتا ہے کہ سرکاری آدمیوں پر بھی اپنی بے گناہی ثابت کر دیں۔ ایسے شخص کی بے گناہی سرکار کو چبھتی ہے، اور وہ سوچنے لگتی ہے کہ اسی طرح سب لوگوں کو بے گناہ جیل میں ڈال دیا تو حکومت کیسے چلے گی جیل جانے کا اصل مقصد یہی ہے۔

آج میرا جسم کمزور ہو گیا ہے، مگر دل نہیں۔ ابھی مجھ میں حکومت سے

لڑنے کی کافی طاقت موجود ہے۔ پھر میں کیوں ملک کو لڑائی کے لئے نہیں بلاتا؟ اس لیئے کہ میں جانتا ہوں کہ کانگرس کے نظام میں ابھی تک تشدد موجود ہے (جھوٹ، خود غرضی، بددیانتی، گندگی یہ سب تشددہی کی مختلف صورتیں ہیں)، اس لئے میں آج کانگرس والوں سے کہتا ہوں کہ اگر آپ اپنے نظام میں سے یہ سب برائیاں نہیں نکال سکتے، اگر آپ کے دل میں تشدد چھپا ہوا ہے تو محض منہ سے عدم تشدد کا دعوےٰ کرنے سے کچھ فائدہ نہیں۔ آپ اسے چھوڑ دیں۔ آپ سے بھی آج میں یہی کہتا ہوں کہ اگر آپ کے دل میں جس طرح ایک چھوٹے بچے کے لئے اسی طرح ایک ظالم سے ظالم شخص کے لئے بھی رحم موجود ہے تب ہی آپ عدم تشدد کو اختیار کریں۔ اگر یہ بات نہیں۔ آپ ایسے نہیں بن سکتے یا نہیں بننا چاہتے اگر آپ کا یہ خیال ہے، ظالم پر غصہ تو آئے ہی گا تو آپ اس راستے کو چھوڑ دیں۔ یہ بھی آپ کے لئے ایک طرح کی بہادری ہوگی۔ آخر آپ پٹھان ہیں۔ بہادری آپ کا جوہر ہے۔ تو یہ بہادری بھی آپ میں آنی چاہیئے۔ یہ ہندوستان کے لئے برا نہیں کچھ اچھا ہی ہوگا، اور اگر عدم تشدد آپ میں نہیں ہے اور اس کا دعوےٰ کرتے ہیں تو اس میں ملک کی برائی ہوگی۔ لیکن اگر آپ کو دل سے یہ یقین ہوگیا ہے کہ عدم تشدد یعنی روحانی طاقت ہی اصل طاقت ہے تو تمہیں سمجھنا چاہیئے کہ یہ طاقت خدا سے ملتی ہے۔

خدا دل میں نہیں تو آپ کتنا ہی کلمہ پڑھتے رہیں اور میں گائیتری اس سے کچھ فائدہ نہیں۔ یہ تو ایک طوطے کو بھی سکھایا جاسکتا ہے۔ بلکہ طوطا تو گائیتری اور کلمہ دونوں پڑھ سکتا ہے۔ مگر رہتا طوطے کا طوطا ہی۔ یہ بنیادی چیزیں میں نے کچھ تفصیل سے آج آپ کے سامنے رکھی ہیں۔ کیونکہ باقی سب چیزیں اسی میں سے نکلتی ہیں۔"

آٹھواں باب

گاندھی جی اور بادشاہ خاں کی گفتگو

گاندھی جی کی صوبہ سرحد کی مہم کا ایک نازک مرحلہ وہ تھا جب کہ پشاور اور مردان کے ضلعوں میں خدائی خدمت گاروں کا معائنہ کرنے کے بعد انھوں نے ۱۹ راور ۲۰ ر اکتوبر کو اتمان زئی کی بیکن قیام گاہ میں بادشاہ خاں سے تبادلہ خیالات کیا۔ انھوں نے پوچھا آپ کے خیال میں خدائی خدمت گاروں کا رویہ عدم تشدد کے بارے میں کیا ہے۔ بادشاہ خاں نے جواب دیا "مہاتما جی میرا خیال یہ ہے کہ جیسا خود انھوں نے ہمارے سامنے اعتراف کیا تھا وہ اناڑی رنگروٹ ہیں، اور ابھی تک معیار سے بہت نیچے ہیں۔ اُن کے دلوں میں تشدد موجود ہے اور وہ اُسے دور کرنے میں پوری طرح کامیاب نہیں ہوئے ہیں۔ ان کے مزاج میں خرابیاں ضرور ہیں مگر اُن کے خلوص میں شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ اگر موقع ملے تو اُن کو ٹھیک

کیا جا سکتا ہے، اور میرے خیال میں اس کی کوشش ضرور کرنی چاہیے۔"

بات یہ ہے کہ بادشاہ خاں کو خود اس معاملے میں بہت فکر ہے۔ انھیں یقین ہے کہ تشدد ان کی قوم کے لیے ایک لعنت ثابت ہوا ہے۔ یہ ایک ناسور کی طرح انھیں کھائے جاتا ہے اور ان کے زوال کی سب سے بڑی وجہ ہے۔ ایک اور موقع پر گاندھی جی سے گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے اس مسئلے کو چھیڑا۔ وہ اپنے ملک کے قدرتی مناظر کی حسن و دل کشی کا ذکر کر رہے تھے اور ان پر ایک وجد کی سی کیفیت طاری تھی جو ایسے موقعوں پر ہمیشہ ہو جاتی ہے۔ لیکن جب وہ قدرت کا ذکر کرتے کرتے انسان پر آئے تو ان کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ انھوں نے کہا:-

"مہاتما جی! یہ ملک جہاں میوے اور غلے کی اس قدر افراط ہے، دنیا میں جنت کا نمونہ ہوتا مگر آج یہ ایک عذاب میں مبتلا ہے۔ مجھے روز بروز زیادہ یقین ہوتا جاتا ہے کہ تشدد اس صوبے میں ہم پٹھانوں کے لیے سب سے بڑی لعنت ثابت ہوا ہے۔ اس نے ہمارے ایکے کو توڑ دیا اور ہم میں خانہ جنگیاں پیدا کر دی ہیں۔ آج کل پٹھان کی ساری طاقت کا مصرف یہی ہے کہ اپنے بھائی کا گلا کاٹ ڈالے۔ اگر ہمیں اس لعنت سے چھٹکارا مل جائے تو پٹھانوں کی اس قوت سے کیسے کیسے مفید کام لیے جا سکتے ہیں۔"

اور صوبوں میں چاہے جو کچھ بھی ہو مگر یہ مجھے پورا یقین ہے کہ صوبہ سرحد کے لئے عدم تشدد کی تحریک خدا کی بڑی رحمت ہے۔ پٹھانوں کے لئے عدم تشدد کے سوا نجات کی کوئی اور راہ نہیں۔ میں یہ بات اپنے اس تجربے کی بنا پر کہتا ہوں کہ عدم تشدد پر تھوڑا سا عمل کرنے سے ہم میں ایک حیرت انگیز انقلاب ہو گیا ہے۔ مہاتماجی! ہم پہلے بزدل اور کاہل تھے۔ انگریز کو دیکھ کر ڈر جاتے تھے۔ ہمارا وقت بیکار گذرتا تھا۔ آپ کی تحریک نے سارا نقشہ بدل دیا ہے۔ اس نے ہم میں ایک نئی روح پھونک دی ہے اور ہمیں اس قدر محنتی بنا دیا ہے کہ جس کھیت میں پہلے دس روپے کی فصل پیدا ہوتی تھی، اب بیس روپے کی ہوتی ہے۔ ہم نے خوف کو دل سے دور کر دیا ہے۔ اور اب ہم انگریز سے کیا دنیا میں کسی سے بھی نہیں ڈرتے۔"

انھوں نے مثال کے طور پر ایک واقعہ بیان کیا۔ سول نافرمانی کے زمانے میں ایک انگریز افسر نے جس کے ساتھ سپاہیوں کا ایک دستہ تھا، سرخ پوشوں کے جلوس کو منتشر ہونے کا حکم دیا۔ دفعہ ۱۴۴ کے ماتحت حکم امتناعی اس کی جیب میں تھا مگر وہ اسے دکھاتا نہیں تھا کیونکہ وہ اپنا دبنگ پن ظاہر کرنا چاہتا تھا۔ اس نے چاہا کہ ایک سرخ پوش کے ہاتھ سے جو جلوس کے آگے آگے تھا، قومی جھنڈا چھین لے۔ لیکن اس شخص نے جھنڈا نہیں

دیا۔ اس پردہ آپ سے باہر ہوگیا اور اس نے سپاہیوں کو گولی چلانے کا حکم دیا۔ مگر یہ دیکھ کر اس کے چھکے چھوٹ گئے کہ سُرخ پوش نہایت اطمینان سے سینے پر گولیاں کھانے کو تیار کھڑے ہیں۔ اس لیے اُسے کچھ اور کرنے کی ہمت نہیں پڑی۔ بادشاہ خان نے کہا۔ " مہاتما جی اس کی حالت اس وقت دیکھنے کے قابل تھی۔ اس کے منہ سے بات تک نہیں نکلتی تھی۔ میں نے اسے اطمینان دلانے کے لیے کہا کہ ہم لوگ نہتے ہیں، آپ کو ہم سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ اگر آپ اس قدر غرور اور تحکم سے کام لینے اور گولی چلانے کا حکم دینے کے بجائے پہلے ہی حکم امتناعی دکھا دیتے تو ہم چپ چاپ منتشر ہو جاتے۔ اس لیے کہ ہم احکام کی خلاف ورزی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ وہ اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔ انگریز ہمارے عدم تشدد سے ڈرتے ہیں سمجھتے ہیں کہ ایک غیر متشدد پٹھان تشدد کرنے والے پٹھان سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔

اگر ہم عدم تشدد کے اصول کو جس کی آپ نے ہم کو تعلیم دی ہے پوری طرح سمجھ سکتے اور اس پر عمل کرتے تو پھر ہماری طاقت اور کامیابی کا کیا پوچھنا تھا۔ ہم تباہی کے گڑھے میں گرنے ہی کو تھے لیکن خدا نے اپنے فضل و کرم سے عدم تشدد کی تحریک کے ذریعے سے ہمیں بچا لیا۔ میں اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کرتا ہوں کہ سوراج کے نعرے لگانے سے کیا فائدہ۔ اگر تم خوف کو دل سے دور کردو

اور اپنی قوت بازو سے حلال کی روزی پیدا کر دے تو تم کو وہی تمھارا سوراج ہے"۔

گاندھی جی نے بادشاہ خاں کو رائے دی کہ اگر ان کو عدم تشدد کے اصول کی سچی آزمائش کرنی ہے تو خدائی خدمت گاروں کو اس کے لئے تیار رہنا چاہئے کہ وہ عملی عدم تشدد کی تربیت حاصل کریں۔ بادشاہ خاں پہلے ہی یہ فیصلہ کر چکے تھے کہ اتمان زئی کے قریب ناروندی کے گاؤں میں خدائی خدمت گاروں کے لئے ایک ٹریننگ سنٹر قائم کریں۔ اس کے علاوہ یہ بھی طے ہوا تھا کہ خود اتمان زئی میں کتائی اور بنائی کا ایک مرکز کھولا جائے گا اور یہاں خدائی خدمت گاروں کے علاوہ دوسرے لوگوں کو بھی کتائی اور بنائی وغیرہ کے مہذب اور پر امن فن سکھائے جائیں گے۔ بادشاہ خاں نے کہا "مہاتما جی میرا خیال یہ ہے کہ اتمان زئی کو ایک نمونے کا گاؤں بنایا جائے۔ کتائی اور بنائی کا مرکز گاؤں والوں کی تعلیم کے لئے ایک مستقل نمائش کا کام دے گا۔ خدائی خدمت گاروں کے مرکز میں ہم یہ کوشش کریں گے کہ اپنی سب ضرورتوں کو خود ہی پورا کریں۔ ہم صرف اپنے بنائے ہوئے کپڑے پہنیں گے۔ اپنی بوئی ہوئی ترکاریاں اور پھل کھائیں گے اور ایک چھوٹی سی ڈیری کھول لیں گے جس سے دودھ ملتا رہے۔ جو چیز ہم خود پیدا نہیں کر سکتے اسے ترک کر دیں گے۔" گاندھی جی نے کہا "بہت اچھا خیال ہے بلکہ میں یہ سمجھتا ہوں

کہ خدائی خدمت گاروں کو اپنے رہنے کے لئے جھونپڑیاں بنانے میں بھی حصہ لینا چاہیئے۔" بادشاہ خاں نے جواب دیا کہ "ہمارا بھی یہی ارادہ ہے۔"

کارکنوں کے پہلے جتھے کی ٹریننگ کے لئے گاندھی جی نے یہ رائے دی کہ بادشاہ خاں کچھ خدائی خدمت گاروں کو منتخب کرکے وردھا بھیج دیں جہاں وہ کھادی کے فن میں مہارت حاصل کرنے کے علاوہ فرسٹ ایڈ (حادثوں کا فوری علاج)، حفظانِ صحت، صفائی گاؤں سدھار کے دوسرے کام اور ہندوستانی زبان سیکھ لیں گے اس کے ساتھ ساتھ وہ بنیادی تعلیمی اسکیم سے بھی واقف ہو جائیں گے اور وہاں سے آکر عام تعلیم کا کام کر سکیں گے۔ گاندھی جی نے یہ بھی کہا کہ "خان صاحب آپ کا کام اس کے بغیر ترقی نہیں کر سکتا آپ آگے آگے چلیں اور خود ان سب چیزوں میں مہارت حاصل کریں" بادشاہ خاں نے اس سے اتفاق کیا۔ آخر میں گاندھی جی نے فرمایا "اگر آپ نے اپنے اس ادارے میں وقت کی پابندی سختی سے نہ کرائی تو سارا کام بگڑ جائے گا۔ دن بھر کے کام کا ایک دستور العمل ہونا چاہیے۔ صبح اٹھنے، رات کو سونے، کھانے، کام اور آرام کے اوقات مقرر ہونے چاہئیں اور ان کی سختی سے پابندی ہونی چاہیئے، میں اپنے پروگرام کو وقت کی پابندی پر سب سے زیادہ زور دیتا ہوں۔ اس لئے کہ یہ بھی عدم تشدد کا لازمہ ہے۔"

اس کے بعد ان دونوں نے اس مسئلے پر گفتگو کرنی شروع کی کہ جب خدائی خدمت گار عدم تشدد میں پکے ہو جائیں گے تو وہ سرحد پار کے قبائل کے چھاپوں سے نبٹنے کا کیا طریقہ اختیار کریں گے۔ بادشاہ خاں کا یہ خیال تھا کہ یہ کام پولس اور فوج کی موجودگی کی وجہ سے، جن پر عوام کو پوری طرح اختیار نہیں ہے، بہت مشکل ہو گیا ہے۔ یا تو حکام کو ہمارے ساتھ پوری طرح اتحاد عمل کرنا چاہیے یا پہلے آزمائش کے طور پر ایک ضلع سے پولس اور فوج کو ہٹا لینا چاہیے۔ اس وقت ہم خدائی خدمت گاروں کے ذریعے امن قائم کرنے کی ذمہ داری لے سکتے ہیں۔ انھوں نے یہ اندیشہ ظاہر کیا کہ بغیر اس کے امن قائم کرنے کی ساری کوششیں بےکار ثابت ہوں گی۔

لیکن گاندھی جی کا خیال اس سے مختلف تھا۔ انھوں نے کہا "صاف بات تو یہ ہے کہ مجھے حکام سے یہ اُمید نہیں کہ وہ ہمارے ساتھ پوری طرح اتحاد عمل کریں۔ انھیں اگر ہماری نیت پر نہیں تو ہماری طاقت پر ضرور شبہ ہوگا۔ یہ توقع بہت زیادہ ہے کہ وہ ہمارے بھروسے پر پولس کو ہٹا لیں۔ عدم تشدد ایک عالم گیر اصول ہے اور اس کے عمل میں ناسازگار ماحول سے خلل نہیں پڑ سکتا، بلکہ دراصل اس کی قوت کا اسی وقت امتحان ہو سکتا ہے جب وہ مخالفت کی فضا میں کام کرے۔ اگر ہمارا عدم تشدد اپنی کامیابی کے لیے حکام

کی مرضی کا پابند ہو تو وہ بالکل کھوکھلی اور نکمی چیز ہوگا۔ اگر ہم لوگوں پر پورا اثر قائم کرسکیں تو فوج اور پولس کچھ نقصان نہ پہنچا سکے گی۔" انھوں نے بادشاہ خاں کو بتایا کہ پرنس آف ویلز کے آنے کے موقع پر بمبئی میں جو فسادات ہوئے تھے، ان میں کانگریس نے فوراً حالات پر قابو پاکر امن قائم کردیا اور پولس اور فوج کھڑی تماشا دیکھتی رہی۔

بادشاہ خاں "مگر مشکل یہ ہے کہ چھاپہ مارنے والے اکثر وہ بدمعاش ہیں جو برطانوی ہندوستان سے بھاگ کر گئے ہیں، ہم کو ان سے ملنے کا موقع نہیں مل سکتا اس لئے کہ حکام ہمیں قبائلی علاقے میں جانے کی اجازت نہیں دیتے۔"

گاندھی جی: "انھیں ضرور اجازت دینی چاہیئے، اور میں آپ سے یہ کہتا ہوں کہ جب ہم پوری طرح تیار ہو جائیں گے تو وہ ضرور اجازت دیں گے لیکن اس کے لئے ہمیں سچے معنی میں خدائی خدمت گار بننا پڑے گا اور عدم تشدد کو ایک زندہ اصول بنانا پڑے گا عدم تشدد ایک اعلیٰ درجے کی عملی قوت ہے۔ یہ روحانی یا خدائی قوت ہے جو ہمارے اندر موجود ہے۔ ناقص انسان اس جوہر کامل کا مشاہدہ نہیں کرسکتا۔ اس کی آنکھیں اس کے نور سے خیرہ ہو جاتی ہیں لیکن اگر اس کا ایک ذرہ بھی ہمارے اندر قوت سے فعل میں آجائے تو یہ ایسے کام کرسکتا ہے جس سے لوگوں کی عقل دنگ رہ جائے۔

سورج کی جاں بخش حرارت سے ساری کائنات کو فیض پہنچتا ہے، لیکن اگر کوئی اس سے زیادہ قریب پہنچ جائے تو جل کر راکھ ہو جائے یہی حال ذات الٰہی کا ہے ہم جتنا عدم تشدد پر عمل کرتے ہیں اتنا ہی خدا سے قریب ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہ ناممکن ہے کہ ہم خدا بن جائیں۔ عدم تشدد کا عمل ریڈیم کی طرح ہے۔ اس کی ایک خفیف سی مقدار اگر کسی زہریلے پھوڑے وغیرہ کے اندر موجود ہو تو برابر خاموشی سے اپنا کام کرتی رہتی ہے یہاں تک کہ وہ سارے خراب گوشت کو ٹھیک کر دیتی ہے۔ اسی طرح سے سچے عدم تشدد کی تھوڑی سی مقدار بھی ہماری نظروں سے پوشیدہ خاموشی کے ساتھ اپنا کام کرتی رہتی ہے، اور سارے سماج کو بدل دیتی ہے۔

اس کا عمل بغیر کسی خارجی محرک کے آپ ہی آپ ہوتا ہے۔ روح مرنے کے بعد بھی باقی رہتی ہے۔ اس کا وجود جسم پر منحصر نہیں ہے۔ اس طرح عدم تشدد یا روحانی قوت کو اپنا اثر ڈالنے کے لیے جسمانی وسائل کی ضرورت نہیں۔ وہ بغیر ان کے کام کرتی ہے نہ زمان و مکان کی قید سے آزاد ہے۔

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر عدم تشدد ایک جگہ کامیابی کے ساتھ قدم جما لے تو اس کا اثر سب کہیں پھیل جائے گا۔ جب تک انسان زندگی میں ایک ڈاکہ بھی پڑے گا، میں یہی کہوں گا ہمارا عدم تشدد صحیح نہیں ہے۔

وہ بنیادی اصول جس پر عدم تشدد کا عمل مبنی ہے یہ ہے کہ جو بات ایک کے لئے صحیح ہے، وہ ساری دنیا کے لئے صحیح ہے۔ سب انسان حقیقت میں ایک ہیں۔ اس لئے جو میرے لئے ممکن ہے وہ سب کے لئے ممکن ہے۔ اس دلیل سے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اگر میں ان مسائل کو جو کسی ایک گاؤں میں پیدا ہوتے ہیں عدم تشدد کے ذریعے حل کر سکوں تو جو سبق اس سے ملے گا اس کی بدولت میں سارے ہندوستان کے اس قسم کے مسائل حل کر لوں گا۔

اس لئے میں نے یہ فیصلہ کیا کہ سیواگرام میں بس جاؤں۔ یہاں کا قیام میرے لئے ایک درس عمل ثابت ہوا۔ ہریجنوں کے ساتھ سے جو تجربہ مجھے ہوا اس سے ہندو مسلم اتحاد کا بہترین حل ہاتھ آ گیا۔ جو معاہدوں وغیرہ سے بے نیاز ہے۔ اسی طرح اگر آپ انسان زندگی میں سب معاملات کو ٹھیک کر لیں تو سارا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ یہاں تک کہ ہمارے تعلقات انگریزوں کے ساتھ بھی بہتر ہو جائیں گے۔ اگر ہم انھیں یہ دکھا دیں کہ ہم کو اس حفاظت کی ضرورت نہیں جس کے لئے ان کی پولس اور فوج لبظاہر رکھی گئی ہے!!

لیکن بادشاہ خان نے ایک شبہہ ظاہر کیا۔ انھوں نے کہا کہ ہر گاؤں میں ایسے خود غرض اور لٹیرے موجود ہیں جن کو اپنی ذاتی غرض کے لئے کسی بات میں تامل نہیں۔ کیا یہ بہتر ہوگا کہ ہم ان لوگوں کو بالکل چھوڑ دیں یا ان کو بھی درست کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔

گاندھی جی نے کہا "شاید آخر میں ہمیں ان میں سے بعض کو چھوڑنا پڑے لیکن ہمیں یہ حق نہیں کہ کسی کو بھی ناقابلِ اصلاح سمجھیں ہم کو ظالم کی نفسیات کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ اکثر وہ حالات کے ہاتھوں مجبور رہو جاتا ہے صبر اور ہمدردی کے ذریعے سے ہم کم سے کم ان میں سے بعض کو انصاف کی طرف لا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ برائی بھی اس وقت تک نہیں چل سکتی جب تک بھلائی سے مدد نہ لے۔ صرف حق ایسی چیز ہے جس کو کسی کی مدد کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر کچھ نہ ہو سکے تو آخر میں ہم ان کی بدی کی قوت کو اس طرح کم کر سکتے ہیں کہ ان سے اتحادِ عمل نہ کریں اور ان کو بالکل تنہا چھوڑ دیں۔

بے تشدد عدم تعاون کے اصول کا نچوڑ ہے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ عدم تعاون کی جڑ محبت پر قائم ہونی چاہیئے۔ اس کی غرض مخالف کو سزا دینا یا نقصان پہنچانا نہ ہونی چاہیئے۔ اس کے ساتھ عدم تعاون کرتے ہوئے بھی ہمیں اسے یہ محسوس کرانا چاہیئے کہ ہم اس کے دوست ہیں اور جہاں تک ممکن ہو ہمدردی اور خدمت کے ذریعے اس کے دل پر اثر ڈالنا چاہیئے۔ سچ پوچھئے تو عدم تشدد کا سب سے بڑا معیار یہی ہے کہ بے تشدد جنگ کے بعد دل میں بغض نہیں رہتا، اور آخر میں دشمن دوست بن جاتے ہیں اس کا تجربہ مجھے جنوبی افریقہ میں جنرل اسمٹس کے ساتھ ہوا۔ شروع میں وہ میرے سخت دشمن

اور نقاد تھے۔ آج وہ میرے پکے دوست ہیں۔ آٹھ سال تک ہم ایک دوسرے کے حریف تھے لیکن دوسری گول میز کانفرنس کے زمانے میں وہی تھے جنھوں نے جلوت اور خلوت میں میرا ساتھ دیا اور میری پوری پوری مدد کی۔ یہ بہت سی مثالوں میں سے ایک مثال ہے۔ زمانہ بدل جاتا ہے اور تہذیبیں مٹ جاتی ہیں لیکن میرا یہ عقیدہ ہے کہ آخر میں صرف عدم تشدد یا وہ چیزیں جو اس پر مبنی ہیں باقی رہ جائیں گی۔ انیس سو سال ہوئے عیسائیت ظہور میں آئی۔ حضرت عیسیٰ کی پیمبری کا زمانہ صرف تین سال تک رہا۔ ان کی تعلیم کو خود ان کے زمانے میں بھی لوگوں نے غلط سمجھا اور آج تو عیسائیت اُن کی مرکزی تعلیم "اپنے دشمن سے محبت کرو" کی بالکل ضد ہے لیکن ایک بڑے اصول کے پھیلنے کے لئے انیس سو سال کی مدت کیا چیز ہے۔

چھ سو سال گذرنے کے بعد اسلام کا دور دورہ ہوا۔ بہت سے مسلمان مجھے یہ تک نہیں کہنے دیتے کہ اسلام جیسا اس کے نام سے ظاہر ہوتا ہے خالص امن ہے۔ میں نے قرآن کے جو معنی سمجھے ہیں اس سے مجھے یقین ہو گیا ہے کہ اسلام کی بنیاد تشدد پر نہیں ہے مگر یہاں بھی تیرہ سو سال زمانے کے لوح پر ایک دھبے سے زیادہ نہیں۔ میرا یہ عقیدہ ہے کہ یہ دونوں مذہب اسی حد تک زندہ رہیں گے جس حد تک کہ ان کے پیرو عدم تشدد کے مرکزی اصول کو اختیار کریں گے۔ مگر یہ چیز صرف دماغ سے نہیں سمجھی جا سکتی بلکہ اس کی ضرورت ہے کہ قلب میں اُتر جائے۔

نواں باب

"رمضان میں"

کچھ دن تک گاندھی جی اتمان زئی میں آرام کرتے رہے اور اسی عرصے میں بادشاہ خاں کے ساتھ مل کر یہ سوچتے رہے کہ عدم تشدد کے اس نظریے کے مطابق جس کی انھوں نے تلقین کی تھی خدائی خدمت گاروں کی تحریک کی تنظیم از سرِ نو کس طرح کی جائے اس کے بعد ۲۱ اکتوبر کو انھوں نے صوبۂ سرحد کا دورہ پھر شروع کر دیا۔

اگلے ہفتے گاندھی جی کو کوہاٹ، بنوں اور ڈیرہ اسماعیل خاں کے اضلاع کا دورہ کرنا پڑا اور بہت سخت مصروف رہے۔ جوں جوں ہم پشاور اور مردان کے پشتو بولنے والے اضلاع سے دیہ سرخ پوش کہلاتا ہے، اس علاقے کہ یہاں خدائی خدمت گاروں کی تحریک کا زور زیادہ ہے جنوب کی طرف بڑھتے گئے ہمارا روزانہ سفر لمبا ہوتا گیا۔ موٹر کی سواری زیادہ تکلیف دہ ہوتی گئی۔ مجبوراً

کا شور و غل بڑھتا گیا، اور ضبط و نظم کم ہوتا گیا۔ جلسوں میں شرکت کی زحمت اس کے علاوہ تھی۔

اس خیال سے کہ بادشاہ خان اور خدائی خدمت گاروں کو رمضان کے زمانے میں دورے کا انتظام کرنے کی زحمت نہ اٹھانی پڑے گاندھی جی نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ یا تو ان کے دورے کا پروگرام کم کر دیا جائے یا دورے کی رفتار تیز کر دی جائے لیکن بادشاہ خان نے ایک نہ سنی وہ اور ان کے خدائی خدمت گار باوجود رمضان کے اپنے کٹھن فرائض کو ان تھک محنت سے انجام دیے رہتے تھے۔ اتمان زئی میں اُنھوں نے گاندھی جی کے آرام کے خیال سے اپنے سارے خاندان کو تتر بتر کر دیا۔ اپنے بیٹے کو اُنھوں نے نوکروں کی کوٹھری میں بھیج دیا، اور خود کہیں اور جا کر سوئے۔ وہ گاندھی جی کی طرف سے دم بھر بھی غافل نہیں ہوتے تھے اور دن رات اُن کی حفاظت اس طرح کرتے تھے جس طرح شیرنی اپنے بچے کی کرتی ہے۔ جب گاندھی جی سو جاتے تھے تو ان کا اُٹھ کر دبے پاؤں چلنا اور ہر چیز کی دیکھ بھال کرنا دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا کبھی وہ اپنے رومال سے فرش کے دھبے جو نوکروں کے پاؤں سے پڑ گئے تھے، جھاڑ دیتے۔ کبھی آہستہ سے گاندھی جی کی چادر کو جو ہٹ گئی تھی ٹھیک کرتے یا جب کوئی دوسرا موجود نہ ہوتا تو مکھیاں اُڑاتے رہتے اور جیسے ہی کوئی اُن کے بجائے کام کرنے

کو پہنچ جاتا۔ چپکے سے کمرے سے چلے جاتے۔ گاندھی جی کے لیے بہترین پھل مہیا کرنے کی خاطر انھوں نے اپنے دوستوں، اور ہمسایوں کے باغ کے باغ چھان ڈالے۔ ایک صبح یہ منظر دیکھنے کے قابل تھا کہ بادشاہ خاں چپکے سے گھر سے نکل گئے اور کئی گھنٹے کے بعد موسم کے پہلے انگوروں کا ایک بڑا سا خوشہ لیے ہوئے آئے اور آکر گاندھی جی کے سامنے رکھ دیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ اتمان زئی سے دو تین میل کے فاصلے پر خدائی خدمت گاروں کے سردار کے گھر گئے تھے۔ جہاں انھوں نے ایک خوشہ کو شاخوں کے اندر چھپا ہوا پہلے سے دیکھ رکھا تھا یہ محض اس کی ایک مثال ہے کہ وہ گاندھی جی کی خاطر مدارت میں کس قدر اہتمام کرتے تھے۔ کوہاٹ روانہ ہونے سے پہلے انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ دورے کے باقی حصے میں آزمودہ کار خدائی خدمت گاروں کی ایک لاری گاندھی جی کے ساتھ رہے گی۔

کوہاٹ کا ضلع شمالی مغربی سرحدی صوبہ کے وسط میں واقع ہے۔ کوہاٹ کا شہر اور چھاؤنی جو تحصیل کوہاٹ کے مغربی حصے میں واقع ہے۔ پشاور سے موٹر کے راستے چالیس میل ہے۔ سڑک کا کچھ حصہ درہ کوہاٹ کے آفریدیوں کے علاقے سے گذرتا ہے۔ کوہاٹ کا درہ لمبائی میں درۂ خیبر سے کم ہے۔ خیبر کو لوگ "خونی شاہراہ" "مرگ مفاجات کی راہ" وغیرہ وغیرہ

کہہ کر پکارتے ہیں۔ اس کی تنگ گھاٹیوں کی بھیانک خاموشی سے دل پر ہیبت بیٹھ جاتی ہے۔ یہ ہمیشہ سے وہی خیبر ہے "جری خوں خوار، ناقابل تسخیر اور پراسرار"۔ کوہاٹ کا درہ خیبر سے زیادہ سنگ لاخ ہے۔ اس کا حسن زیادہ دل کش ہے لیکن اتنا ہیبت ناک نہیں۔ اس کی چوٹیاں زیادہ اونچی ہیں اس کی سُرخ سفید اور سیاہ چٹانیں دھوپ میں چمکتی ہوئی زیادہ حسین معلوم ہوتی ہیں، اور نیچے وادی میں زرخیز کھیتوں اور چھوٹی موٹی خوش نما جھونپڑیوں کا سلسلہ ایک تصویر کا منظر دکھاتا ہے، جس میں بنفشئی اور سنہری رنگوں کی قلم کاری عجب لطف دیتی ہے۔

بادشاہ خاں پہاڑ کی سرد ہوا کے جھونکوں سے اور ان مناظر کے دل فریب حسن سے باغ باغ تھے۔ انھیں یہ گوارا نہ تھا کہ کوئی شخص قدرت کے ان شان دار نظاروں سے متاثر نہ ہو۔ دفعتہً وہ چلا اٹھے "وہ دیکھو عجب خاں کا گھر" اسی کے ساتھ انھوں نے ایک چھوٹی سی صاف ستھری کچی جھونپڑی کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے یہ الفاظ جو میک من کی کتاب سے یاد رہ گئے تھے۔ دہرائے "عجب خاں مولی ایلس کا بھگا لے جانے والا مشہور ڈاکو جس نے اپنے طول طویل سلسلۂ جرائم کی پاداش میں پھانسی کی سزا پائی"۔

بادشاہ خاں ہنسنے لگے "کیا کہا پھانسی پائی؟ اجی وہ تو اب تک زندہ ہے اور ترکستان کی سرحد پر کسی جگہ رہتا ہے۔ کون کہتا ہے کہ وہ بدمعاش تھا۔" اس کے بعد انھوں نے اس ڈاکو کا سارا قصہ سنایا اور ایک شخص نے جو قصے کے سب افراد کو اچھی طرح جانتا تھا اور جس نے سب واقعات اپنی آنکھ سے دیکھے تھے اس کی تصدیق کی۔ عجب خاں بغیر لائیسنس کے ہتھیار بیچا کرتا تھا۔ برطانوی فوج کے مجسٹریٹ نے اس کے مکان پر چھاپا مارا اس نے کہا "اور تم جو جی چاہے کرو لیکن اگر زنانے میں قدم رکھا تو اچھا نہ ہوگا۔" افسر ہنسنے لگا اور اس نے زنانے میں عورتوں کے برقعے اترو انے شروع کئے۔ ڈاکو نے جو کہا تھا وہی کر دکھایا ——— اُسے ایک ہی تدبیر آتی تھی اور وہی اُس نے اختیار کی۔ مجھے فوراً ایک مشہور مصنف کی کتاب کے، جو ابھی حال ہی میں پڑھی تھی، یہ الفاظ یاد آگئے۔ "اس ملک میں اگر کسی مرد کو مار دیا کسی عورت کی توہین کرو تو اس کا ایک ہی نتیجہ ہے، اور وہ موت ہے۔ اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ سزا ٹل جائے تو یہ ناممکن ہے .... دشمن جہاں ہاتھ آیا، چاہے وہ سو رہا ہو یا بیمار ہو کسی حالت میں بچ نہیں سکتا .... ان عداوتوں کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔" میں نے یہ الفاظ بادشاہ خاں کو سنائے۔ انھوں نے کہا "جانتے ہو کہ جب مس ایلس عجب خاں کی حراست میں تھی

تو اس کے ساتھ کیسا برتاؤ کیا گیا؟ چاہے جس سے پوچھ لو، وہ خود یہ کہتی تھی کہ گوری قوم کا کوئی شخص اس کی عصمت کا اس قدر احترام نہ کرتا جس قدر عجب خاں نے کیا۔"

کوہاٹ میں بہت زیادہ کام تھا اور اتنا وقت نہ تھا کہ ہم گرم اور ٹھنڈے پانی کے مشہور چشموں کو جاکر دیکھتے یا ان خوشنما پہاڑوں کی سیر کرتے جو شہر کے آس پاس واقع ہیں۔ دن بھر گاندھی جی کے پاس مختلف لوگوں کے وفد آتے رہے۔ ایک وفد کمیٹی معافی قرضہ کوہاٹ کا تھا جس نے یہ درخواست پیش کی کہ ۱۹۲۴ء کے فرقہ وارانہ فسادات کے سلسلے میں ان لوگوں کو جو لوٹے گئے تھے اور جن کے گھروں میں آگ لگا دی گئی تھی حکومت کی طرف سے قرض دیا گیا تھا۔ اب ان وعدوں کے مطابق جو بار بار کئے جا چکے ہیں ہماری درخواست ہے کہ یہ قرض معاف ہو جائے۔ ایک اور وفد کسانوں کی طرف سے تھا جنھوں نے لگان کے متعلق اپنی شکایات پیش کیں۔ ان کے علاوہ ہریجنوں اور سکھوں کے وفد بھی آئے تھے۔ بہت سے لوگوں نے ایک بڑے کاغذ پر اپنی شکایتیں اور درخواستیں لکھ کر گاندھی جی کو دیدی تھیں تاکہ وزیر اعظم کو پہنچا دیں۔ گاندھی جی نے ان سب کو اپنی ہمدردی کا یقین دلایا۔ اور وعدہ کیا کہ جب پشاور واپس جائیں گے تو ان معاملات کے متعلق وزیر اعظم سے گفتگو کریں گے ـــــــ ۲۲ کی شام کو شہر

کے باہر ایک خوش منظر میدان میں جس کے گرد پہاڑوں کا ایک قدرتی گول گھر سا تھا، ایک عام جلسہ کیا گیا۔ ڈسٹرکٹ کانگریس کمیٹی نے کوہاٹ کے باشندوں کی طرف سے گاندھی جی کی خدمت میں ایک ایڈریس پیش کیا۔ گاندھی جی نے جواب میں ان سب درخواستوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جو اس روز ان کے سامنے پیش کی گئی تھیں، کہا میں نے آج آپ کی مشکلوں اور تکلیفوں پر غور کرنے میں ایک گھنٹہ صرف کیا مگر میں آپ کے سامنے اعتراف کرتا ہوں کہ میں اب اس قسم کے معاملات کو طے کرنے کے قابل نہیں ہوں۔ ایک طرف تو بڑھاپا مجھے رفتہ رفتہ کم زور کر رہا ہے اور دوسری طرف میری ذمہ داریاں بڑھتی جاتی ہیں۔ اور یہ اندیشہ ہے کہ اگر میں بہت سے متفرق کاموں میں پڑ جاؤں تو بڑے بڑے کام رہ جائیں گے۔ ان میں سے خدائی خدمت گاروں کی ذمہ داری جو میں نے لی ہے، بہت اہم ہے اور اگر میں اُسے بادشاہ خان کے ساتھ مل کر خاطر خواہ پورا کر سکوں تو یہ سمجھوں گا کہ میرے آخری سال ضائع نہیں ہوئے۔

لوگ مجھ پر ہنستے ہیں اور اس خیال کا مضحکہ اُڑاتے ہیں کہ خدائی خدمت گار عدم تشدد کے سچے سپاہی بن سکتے ہیں۔ لیکن مجھ پر اس ہنسی کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ عدم تشدد کو جسم سے تعلق نہیں بلکہ روح سے ہے۔ جب اس کے اصلی معنی ایک بار اچھی طرح دل میں بیٹھ جائیں

تو باقی سب باتیں خود بخود ہو جاتی ہیں۔ خدائی خدمت گاروں میں بھی وہی انسانی فطرت ہے جو مجھ میں ہے، اور مجھے یقین ہے کہ اگر میں کسی حد تک عدم تشدد پر عمل کر سکتا ہوں تو وہ بھی کر سکتے ہیں اور انھیں پر کیا موقوف ہے ہر شخص کر سکتا ہے۔ اس لیے میں آپ لوگوں سے درخواست کرتا ہوں کہ میرے ساتھ مل کر خداوند تعالیٰ سے دعا مانگئے کہ میں نے خدائی خدمت گاروں کے متعلق جو خواب دیکھا ہے اُسے سچا کر دے۔

خدائی خدمت گاروں کے افسروں کے ساتھ گاندھی جی نے بات چیت کے دوران میں کہا ہر جگہ میں نے یہ بتلانے کی کوشش کی ہے کہ بادشاہ خان نے بہت بڑی ذمہ داری اپنے سر لی ہے مگر میری اور آپ لوگوں کی ذمہ داری ان سے بھی زیادہ ہے۔ آپ لوگوں نے جو قدم اُٹھایا ہے، وہ کوئی کھیل نہیں۔ آج تک جس ڈھنگ پر پٹھان لوگ چلتے آئے ہیں آپ کا ڈھنگ اس سے نرالا تو ہے ہی مگر اس سے اُلٹا بھی ہے۔ مارنے کی بجائے خود پٹ جانا ایک نئی چیز ہے۔ اور جو آپ ہمیشہ سے کرتے آئے تھے اس سے اُلٹی چیز ہے جو لوگ کئی پشتوں سے مار پیٹ ہی کرتے آئے ہیں ان کے لیے اسکے بجول کو عدم تشدد پر چلنا آسان بات نہیں۔ اس لئے جب سے بادشاہ خان نے یہ نیا کام شروع کیا ہے میرے دل میں دو طرح کے خیال اُٹھتے رہے ہیں۔ ایک طرف شک تھا دوسری

طرف خوشی تھی ۔ میں چاہتا تھا کہ خود آکر بادشاہ خاں کے کام کو دیکھوں مگر ایسا نہ کرسکا ۔ میں نے اپنے لڑکے کو بھیجا تھا اور اس کے علاوہ (VERRIAR ELVIN) ویریار ایلون[۵] بھی یہاں آچکے ہیں ۔ ان لوگوں نے میرا شک دور کیا اور مجھے بتلایا کہ سچ مچ یہ لوگ عدم تشدد پر چلتے ہیں ۔ مگر پھر بھی تھوڑا بہت شک میرے دل میں باقی رہا کیونکہ مجھے عدم تشدد کے راستے کی مشکلات کا بخوبی تجربہ ہے اس لئے آج میں خود آپ لوگوں کے پاس اپنی آنکھوں سے آپ کا کام دیکھنے کے لیے آن پہنچا ہوں ۔

جیسا کہ میں ابھی کہہ چکا ہوں مجھے ایک طرف شک تھا تو دوسری طرف میری خوشی کی بھی کوئی حد نہیں تھی ۔ جو لوگ لاٹھی اور تلوار کے ایسے ایسے جوہر دکھلاتے ہیں ۔ اگر وہ ان کو چھوڑ کر عدم تشدد کو پکڑ لیں تو یہ ہندوستان کی بڑی خوش قسمتی ہے ۔ آج تک اس ملک میں پٹھانوں کے بارے میں جو خیال چلا آیا ہے اس کی وجہ سے اور اُن کا جو تجربہ لوگوں کو ہوا ہے، اس سے بھی لوگوں کے دلوں میں پٹھانوں کا ایک ڈر پیدا ہو گیا ہے ۔ گجرات (کاٹھیاواڑ) میں بچے پٹھان کا نام سن کر کانپ جاتے ہیں ۔ سابرمتی آشرم میں

۵[۵] گاندھی جی کے ایک انگریز پادری دوست جو کہ ہندوستان کی آزادی کی تحریک میں خاص دلچسپی رکھتے ہیں ۔

ہم نڈر بنا کی تعلیم دینے کی کوشش کرتے ہیں ۔ لیکن شرم کی بات ہے کہ اتنا کرنے پر بھی ہم پورے طور سے پٹھانوں کا ڈر ان کے دل سے نہیں نکال سکے ۔ میں آ شرم کی لڑکیوں کو نہیں سمجھا سکا کہ انھیں کسی سے نہیں ڈرنا چاہیئے وہ بظاہر نڈر بنتی بھی تھیں ۔ مگر جب کبھی ہندو مسلم فساد ہوتا اور کوئی پٹھان آ نکلتا تو ادھر وہ نہیں جاتی تھیں کہ کہیں اٹھا نہ لے جائے ۔ میں انھیں سمجھاتا کہ اگر کوئی پٹھان اٹھا بھی لے جائے تو پھر کیا ہے ۔ تم اس کے گلے پڑنا کہ میں تو تیری بہن ہوں ۔ تو مجھے کہے گا کیا ؟ اور اگر خدا نہ کرے وہ کسی نامناسب بات پر بھی اتر آئے تو دانتوں سے زبان کاٹ کر تم اپنی جان دے دینا ۔ مگر اس کے بس میں نہ آنا ۔ مرنا تو ایک روز ہے ہی ۔ وہ کہتی تھیں " یہ ہے تو ٹھیک ۔ لیکن ہمارے لئے یہ ایک نئی بات ہے معلوم نہیں یہ ہم سے ہو سکے گا یا نہیں ۔ اس لئے ڈر لگتا ہے جب ان کی یہ حالت ہے تو ایک معمولی لڑکی کتنا ڈرتی ہوگی ۔ اس لئے جب میں سنتا ہوں کہ ان لوگوں میں ایک لاکھ خدائی خدمت گار ایسے پیدا ہو گئے ہیں جنھوں نے تشدد چھوڑ دیا ہے ۔ اور اب کسی کو ان سے ڈرنے کی کوئی وجہ باقی نہیں رہی تو میری حیرت کی انتہا نہیں رہتی ۔ یہ نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا کی تاریخ میں ایک بہت بڑی بات ہے ۔ اب آپ سمجھ سکتے ہیں کہ باوجود اتنی زیادہ خوشی کے میرے دل میں شک کیوں تھا ۔

تشدد چھوڑنے کی کیا شرط ہے اور تشدد چھوڑنے والوں کو کیا کرنا چاہئے۔ اس کا مجھے کچھ تجربہ ہے۔ میں نے بادشاہ خاں سے اس بارے میں کچھ باتیں کی ہیں۔ صرف اپنے آپ کو خدائی خدمتگار کہنے ہی سے کوئی خدائی خدمتگار نہیں بن سکتا اور نہ سرخ کپڑے پہننے سے۔ اگر ہمیں اس امتحان میں پاس ہونا ہے تو ہمیں ایک مرکز بنانا ہوگا جہاں آپ کو عدم تشدد کی تعلیم مل سکے۔ آپ میں سے اکثر لوگوں کو سرحد سے باہر بھی جانا ہوگا۔ کاتنے بننے کا ایک مرکز ہمیں اتمان زئی میں قائم کرنا ہوگا۔ جہاں خدائی خدمتگاروں کے علاوہ دوسرے لوگ بھی اگر کام سیکھنا چاہیں تو سیکھ سکیں۔ یورپ میں لوگوں نے ایک دوسرے کا گلا کاٹنا اپنا دھرم بنا لیا ہے وہ کروڑوں روپے اسی کام پر خرچ کر رہے ہیں۔ ان کے اچھے اچھے سائنس داں رات دن اسی کام میں لگے رہتے ہیں۔ اسی طرح وہ لوگ عیش و عشرت کے سامان پیدا کرنے میں اپنی بے اندازہ طاقت اور روپیہ خرچ کرتے ہیں۔ ان کی تعلیم و تربیت ہی ایسی ہوئی ہے اس کے برعکس خدا پرست آدمی کی کیا علامتیں ہوں گی؟ پرہیزگاری دستکاری خدا کی مخلوق کی دن رات خدمت اور خیال اس کا شعار ہوگا۔ یہ کام کرتے کرتے آپ کو پتہ لگ جائے گا کہ اس طرح آپ نے کتنی ترقی کی ہے اور عدم تشدد میں کس قدر طاقت ہے اس کا بھی آپ کو تجربہ ہوگا۔ اس طاقت کے سامنے تلوار کیا

چیز ہے ۔ اس طاقت سے اکیلا آدمی ساری دنیا کا مقابلہ کر سکتا ہے ۔ تلوار والا نہیں کر سکتا ۔ اگر ایسا مرکز یہاں بن جائے تو تمام سال تو نہیں مگر سال کا کچھ حصہ میں یہاں آکر گذاروں گا ۔

آج تک عدم تشدد کا ہم نے ایک ہی مطلب سمجھا ہے ۔ یعنی سرکار کے قانون توڑنا اس کے لیے وہ سختی کرے تو اس کو برداشت کرنا اور تشدد کو بھول جانا ۔ مگر میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اگرچہ یہ سب چیزیں عدم تشدد کی لڑائی میں ناگزیر ہیں مگر اس کی قابلیت آپ ہی آپ پیدا نہیں ہو جاتی بلکہ تیاری سے پیدا ہوتی ہے ۔ یہ بعد کی چیز ہے ۔ شروع کی نہیں ۔ لوگوں کے دلوں میں سرکار کا ڈر پیدا ہو گیا تھا ، اس کو نکالنے کا یہ علاج میں نے بتایا تھا ۔ ایک اچھا حکیم مریض کو کوئی تیز دوا دینے تو ٹھیک وقت پر اسے بند بھی کرنا جانتا ہے ۔ ورنہ اس کو مریض سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے ۔ میں نے عدم تعاون اور سول نافرمانی کی تیز دوائی تو دی تھی مگر وقت پر روک بھی لی ۔ لوگوں نے گالیاں بھی دیں کہ میں چیز کو آخر تک نہیں لے جاتا میں ان پر ہنستا تھا کیونکہ میں جانتا تھا کہ میں کیا کر رہا ہوں ۔ پٹنہ میں میں نے اعلان کیا کہ اب سول نافرمانی سوائے میرے کسی کو نہیں کرنی چاہیئے جب تک فضا نہ سدھرے وہ سب کے لیے بند رہے گی ۔ اسی طرح میں چاہتا ہوں کہ اس وقت آپ سول نافرمانی بھول جائیں ۔

میری عادت ہے کہ ہر چیز میں خدا کا ہاتھ دیکھنا چاہتا ہوں چاہے مجھے کوئی وہمی کہے۔ بادشاہ خاں نے جو آپ کا نام رکھا ہے اس میں بھی مجھے خدا کا ہاتھ نظر آتا ہے۔ دیکھئے انھوں نے آپ کو سنتے گیسی نہیں بلکہ خدائی خدمت گار کا نام دیا ہے یعنی دن رات خدا کی خدمت کرنے والا۔ مگر خدا کا جسم تو ہے نہیں تو پھر اس کی خدمت کیسے ہو؟ خدا کی خدمت تو اس کی مخلوق کی خدمت کرنے ہی سے ہو سکتی ہے۔

"آدم کو مت خدا کہو آدم خدا نہیں
لیکن خدا کے نور سے آدم جدا نہیں"

اور ہمارا گاؤں ہی تو ہماری دنیا ہے نا؟ اس کی خدمت کرنے میں دنیا کی خدمت بھی آجاتی ہے۔ بے کار کی بے کاری دور کرکے اس کی پریشانی کو مٹانا۔ مریض کی تیمارداری کرنا۔ لوگوں سے گندی عادتیں چھوڑوانا، اور انھیں صفائی کی تعلیم دینا خدائی خدمت گار کا شیوہ ہوگا، اور چونکہ اس کے سب کام خدا کے لئے ہوتے ہیں، اس لئے تنخواہ لے کر کام کرنے والوں سے اس کا کام اچھا ہونا چاہیئے۔

خدائی خدمت گار خود بے کار نہ بیٹھے۔ اگر اس پاس کہیں تھوڑی سی زمین بھی ہے اور وہ اپنے ہاتھ سے اس میں تھوڑی سی سبزی ہی پیدا کر لیتا ہے تو اس سے کسی غریب مسکین کی مدد ہو جاتی

ہے۔ اس کے برعکس اگر وہ ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھا رہے اور چونکہ خود اس کے پاس پیسہ ہے (یا اس کے ماں باپ پیسہ چھوڑ گئے ہیں) اس لیے وہ بازار سے سبزی خریدے تو وہ ایک حاجت مند کو اس کی ضرورت سے محروم رکھتا ہے جو ایک طرح خدا کی چوری ہے۔ وہ سچا خدائی خدمت گار نہیں۔ خدائی خدمت گار اگر کوئی چیز بھی لیتا ہے تو پہلے سوچتا ہے کہ کیا اس پر میرا حق ہے؟ اور اگر ہے تو کیا کسی اور کا حق مجھ سے زیادہ تو نہیں؟ اگر اس کے پاس ایک پلاؤ کا بھرا ہوا تھال ہے اور ایک کئی وقت کا بھوکا آ جاتا ہے، تو وہ سوچے گا، کہ اگر اس پر اس کا مجھ سے زیادہ حق ہے تو میں چاہے آپ بھوکا رہ جاؤں مگر اس کا پیٹ بھر دوں۔ ہاں اگر پلاؤ زیادہ ہے تو اسے کھلا کر خود پیچھے کھاؤں گا۔

اسی طرح خدائی خدمت گار اپنے وقت کا منٹ بھی ضائع نہیں ہونے دے گا۔ اپنے ایک ایک منٹ کا وہ پورا پورا اور مناسب استعمال کرے گا۔ ہر گھڑی کچھ نہ کچھ پیدا کرتا ہی رہے گا۔ وقت ضائع کرنا یا اس کا فضول استعمال کرنا بھی خدا کی چوری ہے۔

کوہاٹ کے مغرب میں سڑک کے رستے چھبیس میل کے فاصلے پر ہنگو کا قصبہ ہے، جو تحصیل ہنگو کا صدر مقام ہے۔ دوسرے دن گاندھی جی وہاں گئے۔ موسم نہایت شاندار تھا اور دور دراز پہاڑوں کا سلسلہ شفاف ہوا میں بہت صاف نظر آ رہا تھا

آس پاس کی پہاڑیاں جو زیادہ تر سرخ کنکر کی تھیں چھوٹی چھوٹی جھاڑیوں سے ڈھکی ہوئی تھیں اور جہاں تک نظر کام کرتی تھی بکریوں اور دنبوں کے بے شمار گلے چرتے ہوئے نظر آرہے تھے اور ان کی معصومیت سے بھری ہوئی "میں میں" سے ہوا گونج رہی تھی۔ ہنگو میں ایک عام جلسہ ہوا اور ایڈریس پیش کیا گیا۔ اس ایڈریس میں ایک جملہ یہ تھا کہ صوبہ سرحد کے پاس ہندوستان کی آزادی کی کنجی ہے گاندھی جی نے اپنی تقریر میں اس سے اتفاق کیا اور کہا کہ یہ کنجی اس صوبے کے خدائی خدمت گاروں کے ہاتھ میں ہے۔"جس طرح گلاب کی دلفریب خوشبو آس پاس کی ہوا کو معطر کر دیتی ہے۔ اسی طرح جب ایک لاکھ خدائی خدمت گار سچے معنی میں عدم تشدد کے پابند ہو جائیں گے تو ان کی خوشبو سارے ملک میں پھیل جائے گی اور غلامی کی لعنت کو جس میں ہم گرفتار ہیں، دور کر دے گی۔

کوہاٹ کی طرح ہنگو میں بھی گاندھی جی نے خدائی خدمت گاروں کے سالاروں سے اہم بات چیت کی انھوں نے کہا:-

"آپ لوگوں نے جن حلف ناموں پر دستخط کر کے مجھے دیئے ہیں وہ میں نے پڑھ لیا ہے اگر اسے سمجھ کر اس کے مطابق آپ چل سکیں تو میں سمجھ لوں گا کہ آپ نے بڑا بھاری کام کیا۔ آج جب نصرت خیل میں میں نے خدائی خدمت گاروں کے دفتر کی بنیاد ڈالی تھی تو وہاں مجھے ایک سپاس نامہ بھی پیش کیا گیا۔ اس میں سول نافرمانی

کی گذشتہ جنگ کا کچھ ذکر تھا۔ تو آپ سمجھیں کہ جنگ تو ہماری آج بھی جاری ہے۔ اور جب تک آزادی نہیں ملتی جاری رہے گی۔ صرف اس کی صورت بدل گئی ہے۔ دوسری بات اس ایڈریس میں یہ تھی کہ ہم نہ تو اس جنگ میں سختیوں سے ڈرتے تھے اور نہ اب ڈریں گے گورنمنٹ نے کافی تشدد سے کام لیا۔ ہم عدم تشدد پر قائم رہے۔ اور اب بھی ہم اس پر کاربند رہیں گے۔

میں جانتا ہوں کہ ننانوے فی صدی ہندوستانی عدم تشدد کا مطلب اتنا ہی سمجھے ہیں کہ ہم لاٹھی تلوار چھوڑ کر بندوق کا سینہ سپر ہو کر سامنا کریں گے۔ یہ بہت اچھی چیز ہے۔ اس میں بہادری ہے مگر آپ سب اور خاص کر افسر لوگ سمجھ لیں کہ عدم تشدد صرف اسی کا نام نہیں۔ مجھے اس سے بہت زیادہ چیز چاہیئے۔ اگر سچ مچ عدم تشدد کو سمجھ گئے ہیں تو آپ کو جاننا چاہیئے کہ عدم تشدد ایسی چیز نہیں کہ کسی خاص موقع پر صرف کسی ایک جماعت کے لئے کام میں لائی جائے۔ وہ تو چوبیس گھنٹے ہمارے دل میں رہنی چاہیئے اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہمارے دل کا ایک جزو بن جائے۔ غصہ ہمارے دل سے بالکل مٹ جانا چاہیئے۔ آخر تشدد غصے ہی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ غصے میں کوئی گولی چلاتا ہے تو کوئی گالی دیتا ہے اور کوئی لاٹھی چلاتا ہے سو اگر غصہ دل میں سے بالکل مٹا دیا جائے، تبھی ہم دعوے کر سکتے ہیں کہ ہم عدم تشدد کو پورا

سمجھتے ہیں۔ اس کے پابند ہیں اور ہمیشہ پابند رہیں گے۔ جب ہم نے سول نافرمانی کی تھی، وہ تو ایک لڑائی تھی۔ ظاہر ہے کہ وہ زندگی بھر چلنے والی چیز نہیں تھی۔ مگر آج جو لڑائی ہم لڑ رہے ہیں اصلی لڑائی تو یہی ہے۔ ہمیشہ سول نافرمانی کیسے ہو سکتی ہے۔ اگر آج ہمیں ہمیشہ کے لئے جیل میں بند کر دیا جائے تو کیا ہماری لڑائی بند ہو گئی؟

وہاں جا کر تو ہمیں بکری کی طرح معصوم بن کر رہنا چاہئے، وہاں کے قانون توڑ کر انھیں پریشان نہیں کرنا چاہئے۔ بے شک جیل میں بھی سول نافرمانی کی جا سکتی ہے۔ مگر اس کے خاص شرائط اور قواعد ہیں۔ ان کا ذکر میں ابھی نہیں کرتا۔ صرف اتنا کہوں گا کہ جیل میں چلنے کے بعد بھی ہماری لڑائی بند نہیں ہو جاتی۔ جب میں جیل میں تھا تب بھی میری لڑائی جاری تھی۔ عدم تشدد ایک ایسی چیز ہے کہ چوبیس گھنٹے کام کرتی ہے۔ گولی ایسا نہیں کر سکتی۔ گولی دشمن کو مار کر صفحۂ ہستی سے اس کا نشان مٹا دیتی ہے۔ عدم تشدد دشمن کو دوست بنا کر اس کی طاقت کو بھی اپنا کر لیتا ہے۔ سول نافرمانی کر کے ہم نے دنیا کو بتلا دیا کہ ہم کسی کے ماتحت ہو کر نہیں رہنا چاہتے مگر ابھی ہمیں ایک اور قسم کی ہمت کا ثبوت دینا ہے۔ خلافت کے دنوں میں علی بھائیوں کے پاس بڑے لمبے چوڑے پٹھان آتے تھے اور میرے پاس بھی۔ مگر وہ ڈرتے تھے کہ افسروں کو پتہ لگ گیا تو کہیں نکال نہ دیں اور ان سے وہ مجھ سے بھی زیادہ ڈرتے تھے

جسمانی طور پر وہ اتنے بہادر اور مضبوط تھے۔ مگر جب اُن کے مقابلے میں کوئی ان سے طاقت ور آدمی آیا تو وہ ان کے غلام بن کر بیٹھ گئے۔ مجھے تو ایسی طاقت چاہیئے کہ میں سوائے خدا کے جو میرا سردار ہے اور کسی کا غلام نہ بنوں۔ اگر میں یہ کر سکوں تبھی سمجھوں گا کہ عدم تشدد کو میں نے پالیا ہے۔

جیسے میں پہلے کہہ چکا ہوں عدم تشدد کا حربہ ہمیشہ کام کرتا ہے۔ ہم جیل میں گئے تو وہاں حکومت کے جو غلام بھرے ہیں یعنی وہاں کے عہدے دار، ان کے دلوں کو بدل لیں گے۔ انھیں بتا دیا گے کہ ہم جھگڑا کرنا نہیں۔ ہم دشمن کو مارنا نہیں چاہتے۔ انھیں دوست بنانا چاہتے ہیں۔ مگر اُن کے سب اُلٹے سیدھے حکموں کو مان کر نہیں۔ یہ دوست بنانے کا طریقہ نہیں۔ دوست بنانے کا راستہ یہ ہے کہ ہم ان کو بتا دیں کہ ان کے لئے ہمارے دل میں دشمنی نہیں برائی نہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ خدا ان کا بھلا کرے۔ میں کئی جیلوں میں جا چکا ہوں۔ وہاں میں نے سب کو اپنا دوست بنا لیا۔

آج ہم قانونی طریقے سے لڑ رہے ہیں۔ اگر ڈاکٹر صاحب اور ہم پورے طور پر عدم تشدد کے ماننے والے ہیں تو یہ ہمارے لئے ایک ایسا موقع ہے جو اس سے پہلے کبھی نہیں ملا تھا۔ اگر خود جیل والے یہ بات سمجھ لیں گے تو سرکار کو بھی بتا سکیں گے۔ کہ ہم ان کے دشمن نہیں دوست ہیں۔ اگر ہمارے سب وزیر حق اور عدم تشدد کو سمجھنے والے

ہوں تو ہندوستان کی آج شکل بدل دیں۔ مگر افسوس کہ سب
وزیر سچے عدم تشدد کو نہیں سمجھتے، اور جو سمجھتے بھی ہیں تو اس پر پورے
طور پر کاربند نہیں ہو سکتے۔

عدم تشدد کی ایک دوسری خوبی یہ ہے کہ اس کی تعلیم لینے کے
لئے نہ کسی مدرسے میں جانا پڑتا ہے، اور نہ کسی پیر یا گرو کے پاس!
یہ ایک سیدھی سادی بات ہے۔ اگر آپ اس کا پہلا سبق سمجھ گئے
ہیں یعنی یہ سمجھ گئے ہیں کہ یہ ایک روحانی طاقت ہے جو چوبیس گھنٹے
کام کرتی رہتی ہے تو وہ ہمارے گھر میں بھی کام کرے گی، محلے میں بھی،
دشمن کے ساتھ، دوستوں کے ساتھ، سب جگہ کام کرنا سیکھے
تعلیم تو آج آپ اپنے گھر ہی سے شروع کر سکتے ہیں۔ اتنی تعلیم میں نے پالی
ہے کہ مجھے دشمن پر کبھی غصہ نہیں آتا۔ مگر دوستوں کے ساتھ بیٹھتا ہوں
تو کبھی کبھی غصہ آ جاتا ہے۔ مجھے جو طاقت اور تعلیم عدم تشدد
کی ملی وہ میرے گھر سے ہی ملی۔ اپنی بیوی سے ملی، میں ظالم تھا۔ گو یہ
میرا ظلم محبت کا ظلم تھا۔ میں اس بے چاری پر کافی غصہ کر لیتا تھا۔ مگر
وہ سب برداشت کر لیتی تھی مجھے یہ خیال ہو گیا تھا کہ میری بات ماننا
اس کا فرض ہے۔ بعد میں مجھے احساس ہوا کہ یہ کیسی حماقت ہے
اگر مجھے بات منوانی ہے تو دھیرج سے سمجھانا چاہئے۔ اس طرح میں
نے اس سے عدم تشدد سیکھا۔ اور کسی نے میرا اتنا ساتھ نہیں دیا،
جتنا اس عورت نے۔ شاید ہی کسی بیوی نے خاوند کا اتنا ساتھ دیا

ہوگا۔ میں نے اس کا ناک میں دم کر دیا۔ آج ایک گھر بدلا، کل دوسرا!
آج ایک کپڑا پہننے کا حکم صادر کیا۔ کل دوسرے کا۔ وہ اس گھر
میں پلی بڑھی تھی۔ جہاں چھوت چھات کے رسم ورواج ملنے جاتے
تھے۔ میرے گھر میں مسلمان سے کر بھنگی تک سب آتے تھے۔ میں
نے ان سب کی خدمت اس سے کروائی۔ یہ بات اُسے پسند نہ
تھی۔ مگر اس نے کبھی چوں تک نہ کی۔ وہ کچھ بہت پڑھی لکھی تو ہے
نہیں۔ بھولی بھالی سیدھی سادی ہے، مگر اس کے اس بھولے
اور سیدھے پن نے مجھے مطیع کر لیا۔ آپ کے گھر میں بھی ماں بہن
ہیں۔ بیوی ہے۔ لڑکیاں ہیں۔ ان سے آپ ہمیشہ عدم تشدد
کی تعلیم لے سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ آپ کو سچائی پر قائم رہنے کا حلف
بھی اُٹھانا ہے۔ آپ اپنے دل سے پوچھیے کہ آپ کو سچائی سے کتنی محبت
ہے۔ اور کیا آپ اس کا پورا پورا حق ادا کرتے ہیں؟ جو سچا نہیں وہ
عدم تشدد کو کیا سمجھے گا۔ جھوٹ تو خود تشدد ہے۔

ابھی رمضان کا مہینہ شروع ہونے والا ہے۔ رمضان کا
مطلب ہم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ محض روزہ رکھنا اور کھانا پینا چھوڑ
دینا ہی کافی ہے۔ اور بات بات پر غصہ کرتے اور گالی دیتے
ہیں۔ روزہ کھولنے کے وقت بے چاری بیوی سے تیاری میں
ایک منٹ کی دیر ہو جاتی، تو اس کی شامت بلانے میں کوئی
ہرج نہیں۔ لیکن یہ رمضان کا احترام نہ ہوا۔ اگر آپ عدم تشدد

کی تعلیم سچ مچ لینا چاہتے ہیں۔ تو اس رمضان کے موقع پر عہد کرلیں کہ کچھ بھی ہو کبھی کسی پر غصّہ نہ کریں گے۔ گھر والوں پر حکم نہ چلائیں گے۔ اپنی بادشاہت نہ جتائیں گے۔ اور اس طرح چھوٹی چھوٹی چیزوں میں آپ خود عدم تشدد کا سبق سیکھ سکتے ہیں۔ اپنے بچوں کو سکھا سکتے ہیں۔ فرض کیجئے کھیل میں آپ کے بچے کو کوئی پتھر مارے۔ عام طور پر تو پٹھان اپنے بچوں کو یہ سمجھاتے ہیں کہ مار کھاکر گھر نہ آنا۔ کوئی پتھر مارے تو جواب میں اسے اور بڑا پتھر مارنا۔ لیکن اگر آپ کو اور آپ کے بچے کو دوسرا طریقہ یعنی عدم تشدد کا طریقہ سیکھنا ہے۔ تو یہ نہیں ہوگا آپ اسے سمجھائیں گے کہ تمہیں پتھر کا جواب اس سے بڑا پتھر پھینک کر نہیں دینا ہے بلکہ تم جاکر اسے گلے سے لگالو۔ اپنا دوست بنا لو۔ عدم تشدد کے ذریعے ہندوستان کو آزاد کرانے کا یہی طریقہ ہے کہ ہم غصّے کو بالکل دل سے نکال دیں اور سب کو دوست بنالیں یہ آزادی حاصل کرنے کا سیدھا سادہ اور آسان ترین راستہ ہے۔ اور میرا یہ دعوےٰ ہے کہ ہندوستان کی غریب رعایا کے لئے آزادی حاصل کرنے کا اس کے سوا دوسرا کوئی راستہ نہیں۔

دسواں باب

بنّوں

اسی میل کا سفر موٹر سے طے کرنے کے بعد گاندھی جی بنوں پہنچے
یہاں گاندھی جی کو شہریوں کی طرف سے سپاسنامہ پیش کیا گیا۔
عام جلسے میں گاندھی جی نے تقریر کرتے ہوئے کہا۔
"شاید آپ کو معلوم ہوگا کہ قریب دو ماہ سے میں پورے چوبیں گھنٹے
خاموش رہتا ہوں، خاموشی سے مجھے بہت فائدہ ہی ہوا ہے اور
میرا خیال ہے کہ اس سے ملک کو بھی فائدہ ہی ہوا ہے۔ جب پہلے میں
نے خاموشی اختیار کی تو اس کی وجہ میری ایک خاص پریشانی تھی۔
بعد میں میں نے دیکھا کہ خاموش رہ کر میں زیادہ کام کر سکتا ہوں میں
ارادہ کرکے آیا تھا کہ اس صوبے میں صرف خدائی خدمت گاروں کے
ساتھ بات چیت کرنے کے لئے ہی خاموشی چھوڑوں گا مگر بادشاہ خان
نے مجھے مجبور کیا، اور مجھے اپنا ارادہ چھوڑنا پڑا۔
آپ نے اپنے ایڈریس میں میری تعریف کی ہے میں اپنے

کو اس تعریف کے لائق نہیں سمجھتا۔ میں جانتا ہوں کہ میں آپ کی امیدوں
کو بہت کم ہی پورا کر سکوں گا۔ میں نے تو اس دورے کو آخر تک ٹالنے
کی کوشش کی۔ سب مجھے ایک جگہ بیٹھ کر جتنی ممکن ہو اتنی خدمت کرنا اچھا
لگتا ہے۔ مگر میری یہ خواہش کہ خود خدائی خدمت گاروں سے
مل کر میں دیکھوں کہ انھوں نے عدم تشدد کو کہاں تک سمجھا ہے
مجھے یہاں تک کھینچ لائی ہے۔ میری یہاں میں آمد تو اتفاقیہ
ہی سمجھنی چاہیے۔ آپ نے اپنے ایڈریس میں مجھے تھوڑا سا یہاں
کا حال سنایا ہے۔ میں نے آج کئی گھنٹے مختلف لوگوں کے
ساتھ بات چیت میں اور جو مسودے اور کاغذات میرے پاس
پہنچے ہیں انھیں پڑھنے میں صرف کئے ہیں۔ میں آپ کی حالت سمجھ
گیا ہوں، اور مجھے اس سے بہت قلق ہوا۔ سرحدی صوبہ دوسرے
صوبوں سے کچھ مختلف ہے۔ اس کے قریب بہت سے چھوٹے چھوٹے
قبیلے رہتے ہیں ان میں ایسے لوگ ہیں جن کا پیشہ ہی ڈاکہ ڈالنا ہے۔ جہاں
تک میں سمجھتا ہوں اس میں ہندو مسلمان کا کوئی سوال نہیں۔ اس میں
شک نہیں کہ ہندوؤں پر اکثر زیادتی ہو جاتی ہے۔ مگر فرقہ پرستی
کی وجہ سے نہیں۔ ڈاکوؤں کا اصلی مقصد یہی ہوتا ہے کہ اس طرح اپنی
روزی کمائیں۔ مگر اوروں کی نسبت اکثر ہندو ہی ان کا شکار ہوتے
ہیں، کیونکہ وہ زیادہ مال دار ہیں۔ چوروں کو اٹھا لے جانے کا
سبب بھی زیادہ تر روپے کا لالچ ہوتا ہے۔

میری رائے میں ان ڈاکوؤں کی روک تھام نہ ہو سکنا اس بات کا نمایاں ثبوت ہے کہ ہندوستان کے اس حصے میں انگریزی حکومت ناکامیاب رہی ہے۔ میرے دل سے سرکار کی شکایت نکلتی ہے کہ اس نے کروڑوں روپے سرحدی پالسی پر خرچ کر ڈالے ہیں اور ہزاروں جانیں قربان کر ڈالیں۔ سرکار نے سمجھا تھا کہ اس طرح طاقت کے استعمال سے سرحد پار کی دلاور قومیں ہمارے تابع ہو جائیں گی۔ مگر انھیں معلوم ہوا ہوگا کہ تلوار کے دھنی اس طرح قابو میں نہیں آتے۔ اگر جتنی اطلاعات میرے پاس پہنچتی ہیں وہ صحیح ہیں، اور میں سمجھتا ہوں کہ ضرور ہیں، تو ماننا پڑے گا کہ اس صوبے کے اکثر حصوں میں آج لوگوں کا جان و مال محفوظ نہیں ہے۔ آج کئی آدمی جن کے عزیز یا رشتے دار یا تو جان سے مارے گئے ہیں یا ان کو ڈاکو "رقم رہائی" حاصل کرنے کی لالچ سے اُٹھا کر لے گئے ہیں وہ مجھ سے ملے۔ میں نے ان کی ساری دکھ بھری کہانی سُنی۔ اس کا مجھ پر گہرا اثر ہوا ہے۔ مگر جو بھائی میرے پاس آئے تھے، مجھے ان سے افسوس کے ساتھ کہنا پڑا کہ میرے پاس کوئی ایسا جادو نہیں ہے کہ ڈاکو جن لوگوں کو اُٹھا لے گئے ہیں میں ان کو واپس دلا دوں اور نہ سرکار یا کانگرسی وزارت سے اس میں کچھ زیادہ مدد کی اُمید کی جا سکتی ہے۔ مجھے تو سرکار ان لوگوں کے پاس سرحد پار جانے بھی نہ دے گی۔ ورنہ میرا جی تو چاہتا ہے کہ ان کے پاس جا کر

قیام کروں اور جیسے میں ہمیشہ کرتا آیا ہوں ۔ انھیں سمجھانے کی اور ان کا دل پگھلانے کی کوشش کروں ۔ مگر میرے لئے یہ راستہ بند ہے اور سرکار اس کی قائل ہی نہیں ۔ آپ یہ مت سمجھئے کہ کوئی حکومت بھی اپنی رعایا کے ایک ایک شخص کی حفاظت فوج کے ذریعے سے کر سکتی ہے ۔ ایسی کوئی ریاست آج تک دنیا میں پیدا نہیں ہوئی ۔ اور انگریز سرکار سے تو یہ اُمید رکھنا ہی فضول ہے ۔ وہ اس کے لئے کسی طرح آمادہ نہیں ۔ ہاں کسی انگریز عورت کی جان جاتی رہے یا خطرے میں پڑ جائے تو دوسری بات ہے ۔ تب وہ یقیناً اپنے دعوے کے مطابق ساری سلطنت کی قوت کے ساتھ پل پڑے گی ۔ سب حالات جاننے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ کانگرس وزارت کے آنے کے بعد اس صوبے میں قبائلی ڈاکوؤں کی حالت پہلے سے بھی بدتر ہو گئی ہے ۔ ہمارے وزیروں کو پولیس پر کامل اختیار نہیں کہ اس کی پوری پوری مدد انھیں مل سکے ۔ اور محکمہ فوج پر تو بالکل ہی کوئی اختیار نہیں جتنا دوسرے صوبوں میں ہے اتنا بھی نہیں ۔ اس لئے میرا خیال ہے کہ اگر ڈاکٹر خان صاحب ان ڈکیتیوں کی روک تھام نہیں کر سکتے تو ان کا وزارت سے استعفیٰ دے دینا بہتر ہوگا ۔ کیونکہ اگر ڈکیتیاں اس طرح سے جاری رہیں اور زور پکڑتی گئیں تو کانگریس کا سارا وقار ختم ہو جائے گا ۔ مگر سوال صرف میری رائے کا

نہیں۔ یہ تو آپ کے طے کرنے کی بات ہے۔ آپ جب چاہیں ان سے وزارت کو چھڑوا سکتے ہیں۔ آخر ڈاکٹر خاں صاحب آپ کے خدمتگار ہیں۔ ورکنگ کمیٹی۔ صوبہ کانگریس کمیٹی اور جن ممبروں کی ہدایت سے انھوں نے وزارت بنائی وہ ان کے ماتحت ہیں۔ بہرحال یہ فیصلہ آپ لوگوں کو کرنا ہے کہ میں نے جن دقتوں کا ذکر کیا ہے ان کے باوجود بھی کانگریس کی وزارت رہے یا کوئی دوسری وزارت اس کی جگہ پر آجائے۔

آج مجھے جو لوگ ملے، ان میں سے کئی نے پوچھا کہ ہم جان و مال کی سلامتی کی خاطر صوبہ سرحد سے ہجرت کر کے کہیں اور جا سکتے ہیں یا۔ میں نے اُن سے کہا ہے کہ اگر وہ کسی طرح سے بھی یہاں امن سے نہ رہ سکیں۔ یا اپنے ننگ و ناموس کی حفاظت نہ کر سکیں تو کسی دوسری جگہ چلے جانا ہی مناسب ہے اور اس کا انھیں پورا پورا حق ہے۔ میرے پاس ایک یہ شکایت بھی پہنچی ہے کہ جب سے صوبہ سرحد سے انسداد جرائم ایکٹ منسوخ ہوا ہے جن مقامات پر ڈاکے پڑتے ہیں وہاں کی مسلمان آبادی نے ڈاکوؤں کے روک تھام میں پہلے کی طرح مدد دینی چھوڑ دی ہے۔ ممکن ہے یہ سچ ہو۔ مگر میں آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ اگر آپ اپنی حفاظت کا دارو مدار کسی دوسروں کی مسلح طاقت پر رکھیں گے تو ایک دن آپ کو اسی مسلح طاقت کا محکوم ہو کر رہنا ہوگا۔ آپ خود اپنی

حفاظت کرنا سیکھیئے ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کو آپس میں تعاون کرنے کی مشق ہونی چاہیئے ۔ بہر حال آپ کسی صورت میں بھی بزدل نہ بنیں ۔ اپنی حفاظت ہر شخص کا پیدائشی حق ہے ۔ میں نہیں چاہتا کہ اس ملک میں ایک شخص بھی نامرد نظر آئے ۔

چوتھا اور آخری راستہ عدم تشدد کا ہے جو میں آج آپ کے سامنے پیش کرنے کو حاضر ہوا ہوں ۔ میرا یہ دعویٰ ہے کہ اپنی حفاظت کی اس سے بڑھ کر یقینی اور پکی تدبیر اور کوئی نہیں ۔ اگر میرا بس چلے تو میں آج ہی سرحد پار کے قبیلے والوں کے پاس چلا جاؤں اور ان کو محبت کے ساتھ سمجھاؤں بجھاؤں ۔ ان کی تکلیفوں کو سمجھوں ان کی عادتیں بدلنے کے لئے جو تعلیم یا مدد چاہیئے وہ دوں ۔ مجھے یقین ہے کہ ہمارے اس طرح سمجھانے بجھانے کا اور ہماری محبت کا اثر ان کے دل و دماغ پر ہوئے بغیر نہ رہے گا ۔

ڈاکوؤں کو روپیہ ادا کر کے جان چھڑانا سخت غلطی ہے ۔ یہ تو ان کو بار بار ڈاکے ڈالنے کا راستہ دکھانا ہے ۔ یہ تو ہمارے اور ان ڈاکوؤں دونوں کے لئے ذلت کا باعث ہے ۔ زیادہ عقلمندی کا راستہ یہ ہوگا کہ ہم انھیں رشوت دینے کے بجائے ان کو دستکاری اور صنعت سکھا کر ان کا افلاس دور کریں اور ایمان داری سے روزی کمانے کا راستہ اُن کے لئے کھول دیں ۔ تاکہ وہ ڈاکہ زنی پر مجبور نہ ہوں ۔

میری آج کل خدائی خدمت گاروں کے ساتھ بات چیت ہو رہی ہے۔ بادشاہ خان کے ساتھ مل کر میں ایک تجویز تیار کر رہا ہوں۔ اگر میری کوشش کامیاب ہوئی اور خدائی خدمت گار جیسا کہ ان کے نام سے ظاہر ہوتا ہے سچ مچ خدمت کرنے والے بن گئے تو ان کے طرز عمل کا اثر پھولوں کی مہک کی طرح دور دور پھیل جائے گا۔ اور خود بخود سرحد کا مسئلہ ہمیشہ کے لئے طے ہو جائے گا۔

بنوں سے روانہ ہونے سے پہلے گاندھی جی اس جگہ کو دیکھنے کے لئے گئے جہاں ابھی حال میں چھاپہ مارا گیا تھا۔ اس تھوڑی سی دیر میں کئی باتیں ان کے علم میں لائی گئیں جو قابل ذکر ہیں، لیکن چونکہ ورکنگ کمیٹی کی ہدایت کے مطابق آصف علی صاحب ان واقعات کی تحقیقات کر رہے ہیں اس لئے میں انھیں چھوڑتا ہوں۔ البتہ میں نے خود جو کچھ دیکھا اور سنا وہ لکھے دیتا ہوں۔ یہ بات ہر شخص جانتا ہے کہ اگر مقامی افسر چاہتے تو یہ چھاپہ روکا جا سکتا تھا۔ انھیں اطلاع مل چکی تھی کہ چھاپہ مارا جائے گا۔ چھاپہ مارنے والے قریب قریب سارے وقت نظروں کے سامنے رہے۔ پھر یہ واقعہ کیوں ہونے دیا گیا؟ یہ ایک معمہ ہے جسے اگر سرکاری کمیٹی نہیں تو آصف علی صاحب ضرور حل کریں گے۔

پڑھنے والوں کو اس کا اندازہ ہونا چاہیئے کہ جس جگہ چھاپہ مارا گیا اس کا محل وقوع کیا ہے۔ یہ زرخیز اور خوش منظر میدان جسے

ٹوچی اور کمبیلا دریا سیراب کرتے ہیں، ایک گوناگوں اور دردناک تاریخ رکھتا ہے۔ اس کے شمال میں ضلع کوہاٹ کے بے آب و گیاہ پہاڑوں کا سلسلہ جو سالٹ رینج (SAJTRAN) کہلاتا ہے واقع ہے اور جنوب میں ڈیرہ اسمٰعیل خاں کا ریتیلا میدان ہے اور مغرب اور شمال مغرب میں وزیرستان کی بھیانک پہاڑیاں ہیں جہاں زندگی نام ہے ایک دائمی کش مکش کا نہ صرف انسان اور فطرت میں، بلکہ انسان اور انسان میں بھی، ایسے ماحول میں قدرتی طور پر یہ اپنے تند خو سرحدی [illegible]یوں کے حملوں کی جولاں گاہ بن گیا اس کی ابتدائی تاریخ جس کا اندازہ آپ کو ذیل کی عبارت سے ہوگا جو کھا۔ ربرن کی کتاب سے لی گئی ہے۔ اس کو پڑھتے ہوئے ایسا لگتا ہے کہ یہ انسان انسان کے بیچ نہیں بلکہ چیلوں اور دوسرے شکاری جانوروں کے بیچ لڑائی کی خوفناک کیفیت آنکھ کے سامنے گذر رہی ہے۔ اس بات سے شاہ فرید (جو شیتک بھی کہلاتے تھے) کی اولاد کو بڑی خوشی ہوئی، اس لئے کہ ان لوگوں کو وزیری قبیلے کے لوگوں نے بہت دق کر رکھا تھا۔ یہ لوگ کمر کس کر تیار ہو گئے ان کے ساتھ ان کے بیوی بچے بھی پہاڑ سے اتر آئے اور وہ ٹوچی کے ڈھلانے پر خیمہ زن ہوئے۔ اس کے بعد ان کے سردار جمع ہوئے اور انکشمول نے کہا "ہم لوگ منگلول اور ہانیوں کے پاس تین کبوتر بھیجتے ہیں جس سے ان کو یہ اندازہ ہو جائے گا کہ ہمارے ہاتھوں

ان کا کیا حشر ہونے والا ہے " اس کے بعد انھوں نے تین کبوتر لئے پہلے کو صحیح سلامت رہنے دیا۔ دوسرے کے پنکھ اکھاڑ لیئے اور تیسرے کا ایک ایک پر نوچا، اور سر اور پیر کاٹ لیے۔ انھوں نے یہ کبوتر ایک قاصد کے ساتھ منگلوں اور ہانیوں کے سرداروں کے پاس اس پیام کے ساتھ بھیجے کہ اللہ تعالے تم سے ناراض ہے اس لئے کہ تم نے پیر صاحب کے ساتھ بے ادبی کی اور اس نے تم کو ہمارے سپرد کردیا۔ اگر تم بھاگ گئے تو پہلے کبوتر کی طرح صحیح سلامت رہوگے اگر یہاں ٹھہرے رہے تو دوسرے کبوتر کا سا حال ہوگا اور اگر تم نے ہمارا مقابلہ کیا تو وہ حشر ہوگا جو تیسرے کبوتر کا ہوا۔ اس سے منگل اور ہانی ڈر گئے، اور واقعی ان کے ساتھ وہی ہوا جو کبوتروں کے ساتھ ہوا تھا "

عہد وسطے میں یہ جگہ ان پردیشی فوجوں کی آرام گاہ کا کام دیتی تھی جو غزنی سے ہندوستان کی طرف جاتے ہوئے یہاں سے گذرتی تھیں۔ اور حملہ آور فوجوں کے ساتھ جو علیق یعنی رنڈی بھڑوے کتھک گوتے وغیرہ رہا کرتے ہیں۔ انھوں نے اس کو اپنا مرکز بنا لیا۔ ان لوگوں کی روایات ابھی تک چلی جاتی ہیں۔ تاریخ کے اس پس منظر کا سرحدی علاقے کے چھاپوں اور اغوار کی واردا توں کے متعلق بحث کرتے ہوئے ذہن میں رکھنا بہت ضروری ہی ہے۔

تشدد اور عادم تشدد کی طاقت کا مقابلہ۔ پہلی دشمن کو ختم کردیتی

ہے اور دوسری اس کو دوست بناتی ہے، اس لئے وہ بڑی ہے۔
تعمیری پروگرام اس کا ظاہری یا سماجی روپ ہے جیسے کہ چرخہ چھوت
چھات کو مٹانے۔ شراب اور دوسری قومی اثرات پیدا کرنے کی تحریک
یہ سب چیزیں عارضی، سیاسی مصلحت کے طور پر نہیں ہونی چاہئیں
بلکہ عدم تشدد کے سانچے میں ڈھل جانی چاہئیں۔

۲۵ اکتوبر ۱۹۳۸ء کو بنوں میں خدائی خدمت گار افسروں کے
ساتھ گاندھی جی کی اہم بات چیت ہوئی، گاندھی جی نے کہا:
میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اگر عدم تشدد پر قائم رہنا
چاہتے ہیں تو اس میں کون سی چیزیں ہیں جنھیں سمجھنا آپ کے لیے
ضروری ہے۔ عدم تشدد کی تحریک جب یہاں شروع ہوئی تھی، تو
لاکھوں لوگوں نے یہ بات سمجھ لی تھی کہ سرکار کا مقابلہ ہم تلوار سے
نہ کر سکیں گے۔ کیونکہ سرکار کی طاقت ہماری تلوار کی طاقت سے بہت
بڑی ہے۔ ہم جب تلوار سے کر سکتے ہیں تب بھی مرنے کی تیاری
کر کے ہی جاتے ہیں۔ تلوار ہاتھ میں ٹوٹ جائے گی تو موت تو
سامنے کھڑی ہی ہے۔ پھر ہم بغیر تلوار کے مرنے کا علم سیکھ کر باہر
کیوں نہ نکلیں۔ سرکار ہمیں مارنا چاہتی ہے۔ مارے، قید کرنا چاہتی
ہے تو قید کرے۔ ہماری جائداد ضبط کرنا ہے تو کرے۔ مگر اکثر لوگوں کے
دل میں یہ خیال ہے کہ اگر ان کے پاس تلوار کی کافی طاقت ہو تو وہ
تلوار سے بھی لڑیں گے۔ آج عدم تشدد سے کام لیتے ہیں کیونکہ

اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ دل میں تو تشدد موجود ہے۔ بظاہر اسے ترک کر دیا ہے۔ اس سے ہماری قوت بڑھی تو سہی مگر ہمارا عدم تشدد بہادر آدمی کا نہ تھا کمزور کا تھا۔ جو لوگ عدم تشدد کو اس طرح سے اختیار کرتے ہیں۔ اور عدم تشدد کو کمزور کی طاقت سمجھتے ہیں۔ انھوں نے بڑی بھاری غلطی کی ہے۔ اگر آپ ایک لاکھ خدائی خدمت گار بھی یہی غلطی کریں تو یہ بڑی بُری بات ہوگی۔ اگر آپ نے بادشاہ خاں کے کہنے پر بظاہر تو تلوار کو چھوڑ دیا۔ مگر دل میں تشدد بھرا رہا تو آپ کا عدم تشدد زیادہ دیر تک قائم رہنے والا نہیں۔ دو چار سال بعد آپ پھر تلوار پکڑنا چاہیں گے۔ اور اس وقت عادت چھُٹ جانے کی وجہ سے آپ کو دقت پیش آئے گی، اور آپ نہ اِدھر کے رہیں گے، نہ اُدھر کے۔ خواہ مخواہ بعد میں پچھتائیں گے اور یہ بادشاہ خاں کے میرے اور آپ کے لئے باعثِ شرم ہوگا۔ آپ لوگ کمزور اور بزدل بن جائیں گے۔ یہ ہم نہیں چاہتے۔ میں جو چیز چاہتا ہوں وہ تو سب سے انوکھی ہے۔ یعنی یہ کہ ہم لوگ اگر تلوار چلا بھی سکتے ہوں اور ہماری فتح ہونے میں کوئی شک نہ ہو تو بھی ہم دشمن پر تلوار نہ چلائیں گے۔ اور مخالف کے پاس ایک ٹوٹی سی تلوار ہو، تب بھی اُسے ہم اپنے گلے پر چلانے دیں۔ دل میں غصہ تک نہ لائیں۔ اور یہی نہیں بلکہ محبت سے اس کو اپنے دل میں

جگہ بھی دیں۔ اگر آپ واقعی عدم تشدد کو اسی طرح سمجھ گئے ہیں تو آپ کے لئے یہ سوال آسان ہو جاتا ہے کہ آپ کو کیا کرنا ہے۔ جو شخص سمجھ گیا ہے کہ عدم تشدد کی روحانی طاقت تلوار سے بڑھ کر ہے جو شخص جسمانی طاقت ہے۔ تو وہ کسی پر تلوار چلانا ہی نہیں چاہیے گا۔ نہ غصہ کرے گا۔ چوبیس گھنٹے خدمت ہی میں لگا رہے گا اور اس کا یہی فرض ہے۔ خدا کی خدمت صرف اس کی مخلوق کی خدمت سے ہی ہو سکتی ہے۔ کیونکہ خود خدا کو نہ تو حاجت ہے اور نہ کسی شخص کی خدمت کی ضرورت ہے۔ آپ بنوں میں رہتے ہیں تو آپ کو چاہیے کہ بنوں کے لوگوں کی خدمت کریں۔ وہ گندے رہتے ہیں تو ان کو صفائی سکھائیں۔ صفائی کرنے میں انھیں مدد دیں۔ وہ بیمار ہیں تو ان کی دوا دارو کریں۔ ان کی تیمارداری کریں۔ اگر وہ بیکار ہیں تو ان کی بیکاری مٹائیں۔ اس طرح جتنی ہم خدمت اور محبت کریں گے اتنی ہی ہماری طاقت بھی بڑھے گی۔

آپ پوچھیں گے کہ یہ سب کام کرنے سے انگریزی حکومت پر کیا اثر پڑے گا۔ میرا کہنا یہ ہے کہ ہر خدمت کر کے ہندوستان کے سب لوگوں کو محبت کے رشتے میں باندھ کر ملک میں ایک نئی فضا پیدا کر سکتے ہیں اور انگریزوں کو بھی اس محبت کی تلوار سے گھائل کر سکتے ہیں۔ آپ کہیں گے انگریزوں پر محبت کی جنگ کا اثر نہیں ہوگا۔ میرا تیس سال کا تجربہ اس کے برعکس ہے۔

جنوبی افریقہ میں ایسی ہی محبت کی جنگ ہوئی تھی اور وہی انگریز جو شروع میں ہمارے سخت دشمن تھے، آخر میں ہمارے دوست بن گئے یہاں ستر ہزار انگریز ہم تیس کروڑ لوگوں پر حکمراں ہیں۔ کیونکہ ہمارے دل پر اُن کا رعب بیٹھ گیا ہے۔ اگر ہم تیس کروڑ لوگ آپس میں اس طرح محبت سے رہنے لگیں کہ ہندو اور مسلمان چھوت اور اچھوت، لکھ پتی اور بھکاری کے درمیان تفرقہ مٹ جائے تو مٹھی بھر انگریزی فوج کی مجال نہیں کہ ہم پر حکمراں رہ سکے۔

جس طرح تشدد کے جنگ میں کچھ قانون و قواعد ہوتے ہیں۔ اسی طرح عدم تشدد کے جنگ میں بھی ہوتے ہیں۔ دنیا آج صرف تشدد کی جنگ کے آداب سے واقف ہے۔ تشدد برائی کرنے والے کو سزا دیتا ہے۔ عدم تشدد برائی کرنے والے کو، شرابی اور چور کو محبت سے سمجھا کر سدھارتا ہے۔

اگر انگریزی حکومت کو عدم تشدد کے ذریعے ہٹانا ہے تو ہمیں کیا کرنا ہوگا؟ تشدد سے کام کرنے کے لئے آپ لوگوں کو قواعد کرنی ہوگی۔ تلوار اور بندوق کا فن سیکھنا ہوگا۔ مگر تلوار کی تو اب کوئی قدر و قیمت ہی نہیں رہی۔ بندوق کی تھوڑی سی ہے۔ لیکن چند سال میں وہ بھی نہیں رہے گی۔ اب تو پہاڑ کی چوٹی پر سے ہوائی جہازوں کے ذریعے بم پھینک کر دوسرے کو ڈرا سکتے ہیں۔ زہریلی گیس چھوڑ کر تباہ کر سکتے ہیں۔ ولایت میں

میں یہ تعلیم عورتوں اور بچّوں تک کو دی جا رہی ہے۔ اسی طرح جنھوں نے عدم تشدد کی سائنس کو اختیار کر رکھا ہے انھیں اس کے قانون اور قواعد کے مطابق اپنی ساری زندگی بنانی ہوگی۔ ورنہ یہ چیز ان کے دلوں کے اندر گھر نہیں کر سکتی۔

عدم تشدد کی لڑائی کا عملی پروگرام میں نے سنہ ۱۹۲۰ء میں ملک کے سامنے رکھا تھا۔ وہ آج بھی کانگریس کے سامنے ہے۔ اس میں ایک حصہ تھا امن عدم تعاون کا اور دوسرا تعمیری کام کرنے کا یعنی قومی اتحاد پیدا کرنا، چھوت چھات کو دور کرنا، شراب اور دوسری نشی چیزوں کو چھوڑنا، کھادی اور چرخے وغیرہ کو اپنانا مگر یہ سب چیزیں ایک سیاسی چال کے طور پر نہیں بلکہ عدم تشدد کے ڈھانچے میں ڈھال کر کرنی ہیں۔ مثلاً بطور ایک عارضی سیاسی مصلحت کے ہندو مسلم اتحاد ایک چیز ہے مگر عدم تشدد کے سانچے میں ایسے ڈھالنا چاہیے کہ دل اس طرح مل جائیں کہ کبھی الگ ہی نہ ہوں۔ تب یہ ایک دوسری ہی چیز بن جائے گی۔ پہلی چیز ہمیشہ رہنے والی نہیں صرف چند روز تک چل سکتی ہے اس میں دھوکا ہو سکتا ہے، چالاکی ہو سکتی ہے۔ مگر دوسری میں صرف محبت ہی محبت ہے۔

چرخے کو میں نے اتنی اہمیت دی مگر اس کو بھی اس عدم تشدد کے سانچے میں ڈھالنا ہے۔ ہندوستان میں آج کروڑوں آدمی بے کار پڑے ہیں، یا تو ہم ان کو مر جانے دیں تاکہ جو تھوڑے سے

باقی بچیں ان میں سے ہر ایک کے حصے میں کچھ زیادہ زمین آئے جیسے کہ جنوبی افریقہ میں ہوا۔ مگر یہ تشدد کا راستہ ہے۔ عدم تشدد پر چلنے والا انسان تو خدا کی ساری مخلوق کی یکساں خدمت کرنا چاہے گا اس کا دل یہی کہے گا کہ جو چیز غریب سے غریب آدمی کو نہیں مل سکتی وہ مجھے بھی نہیں چاہیئے۔ وہ لوگ جو مشقت کرتے ہیں وہ اس میں بھی شامل ہوں گے چرخے کی دریافت اسی خیال کے ماتحت ہوئی۔ جب میں نے ہند سوراج میں چرخے کا نسخہ پیش کیا تب میں نے چرخہ دیکھا بھی نہ تھا۔ اسے جانتا بھی نہ تھا۔ میرے سامنے تو ان غریبوں کا تصور تھا جو افلاس کے بوجھ سے دب گئے ہیں اور بغیر زمین کے بے کار اور بغیر کھانے کے بھوکے بیٹھے ہیں۔ ان کو میں کیسے بچاؤں؟ یہ سوال میرے سامنے تھا۔ میں اس وقت یہاں اس محل میں بیٹھا ہوں، لیکن اگر میرا دل اس میں پھنس جائے تو عدم تشدد کے ایک پیرو کار کی حیثیت سے تو میرا خاتمہ ہی ہو جائے۔

لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ یہاں میں مجبوراً بیٹھا ہوں۔ میرا جسم یہاں ہے مگر میرا دل غریبوں کی جھونپڑیوں میں پڑا ہے۔ اگر کسی جھونپڑی میں مجھے بیٹھنا نصیب ہو تو مجھے زیادہ اچھا لگے گا۔ ہم تو غریبوں میں مل جل کر رہنا چاہتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ وہ کون سی چیز ہے جو ہم کو غریبوں سے ملا سکتی ہے۔ اس کا جواب ہے چرخہ! اسی طرح اگر میں ایک ڈاکٹر ہوں تو بھی میری آنکھوں

کے سامنے غریب لوگوں کی تصویر ہی ہوگی۔ ان کی مصیبت کیسے کٹے۔ اس کی مجھے فکر ہوگی۔ ایک راجہ کو کیسے اچھا کردوں۔ اس کا چنداں خیال نہ ہوگا۔

چرخہ میری ایجاد نہیں۔ وہ تو ہمارے بزرگوں کے زمانے میں بھی چلتا تھا۔ مگر چرخے کو عدم تشدد کے ساتھ جوڑنا میری ایجاد ہے۔ خدا نے میرے دل میں یہ خیال پیدا کیا کہ اگر تو عدم تشدد سے کام لینا چاہتا ہے تو تجھے چھوٹی سے چھوٹی، حقیر سے حقیر چیز سے کام لینا ہوگا۔ بڑی بڑی چیزوں سے نہیں۔ اگر تعمیری پروگرام کی چاروں چیزوں پر ہم جیسے چاہیئے ویسے ہی بیس سال سے عمل کرتے آتے تو آج ہم اپنے ملک کے مالک خود ہوتے۔ انگریز، جاپانی یا کوئی بھی دوسرا ہندوستان کو چھو نہ سکتا۔ اور اگر کوئی یہاں آ بھی جاتا تو یہاں سے کچھ نہ لے جا سکتا۔ آخر کار خود ہی محبت سے ہم میں مل جاتا۔ اگر ہندوستان کے تیس کروڑ لوگوں میں ہمارا دشمن ہی نہ نکلے تو کیا باہر سے خدا ہمیں دشمن بھیجے گا اور اگر کوئی دشمن بن کر آئے گا بھی تو ہمارا عدم تشدد اسے دوست بنا لے گا

ایسے ہی عدم تشدد کی میں آپ سے امید رکھتا ہوں۔ سچے عدم تشدد کی میرے دل میں قدر ہے اگر آپ لوگ سچے عدم تشدد کو مان لیں۔ اس پر عمل کرنے لگیں تو ساری دنیا کی راہ نمائی کر سکتے ہیں۔ اس لئے میں آپ لوگوں کی تعریف کرتا ہوں۔ میں

دوسری بار یہاں آیا ہوں ۔ اور مجھے امید ہے کہ یہ آخری بار نہ ہوگی اگر آپ چاہیں تو مجھے دھوکہ بھی دے سکتے ہیں میرے ساتھ عدم تشدد پر کاربند رہنے کے قول و قرار کے بعد باہر جاکر کسی کو لاٹھی بھی مار سکتے ہیں ۔ اگر ایسا ہو تو آپ کے اور میرے درمیان عدم تشدد کا جو عہد ہوا ہے وہ الٹا بیکار ہوگا ۔ لیکن اگر آپ مجھے اور اپنے آپ کو دھوکا نہیں دے رہے تو آپ کو اپنے چال چلن سے سب پر ثابت کر دینا ہوگا کہ سرخ پوشوں سے کسی کو ڈرنے کی مطلق ضرورت نہیں ، اور نہ اُن کی موجودگی میں کسی اور سے ڈرنے کی ضرورت ہے ۔

گیارھواں باب

تشدد اور روحانیت

بنوں کے خوش منظر میدان کے بالکل برعکس مروت کی تحصیل ہے۔ یہ ایک بہت بڑا ریتیلا میدان ہے جو گیارہ سو اکھٹانوے مربع میل میں پھیلا ہوا ہے، اور اس کا صدر مقام لکی کہلاتا ہے۔ گاندھی جی گزشتہ مہینے کی چھبیس تاریخ کو انتالیس میل موٹر کا سفر کرکے یہاں پہنچے تھے۔ لکی کے پروگرام میں ایک دلچسپ چیز دہ خٹک ناچ تھا جو بادشاہ خاں نے خاص طور پر گاندھی جی کے لیئے کرایا تھا۔ خٹک ناچ جیسا کہ اُس کے نام سے (خٹک سنسکرت لفظ کھٹوگ سے نکلا ہے، جس کے معنی تلوار کے ہیں۔) ظاہر ہے شمشیر زنی کے کرتبوں پر مبنی ہے اور خٹک قبیلے کے پٹھانوں میں بہت مقبول ہے، جن کا سلسلہ بنوں سے کوہاٹ ہوتا ہوا دریائے سندھ کے کنارے شمال میں اکارہ ضلع پشاور تک چلا گیا ہے۔ عوام کے فنون لطیفہ کے اور بہت سے نمونوں کی طرح یہ ناچ بھی مٹتا جا رہا تھا لیکن

خدائی خدمت گاروں کی تحریک نے جو پٹھانوں کی پرانی تہذیب کے پرانے عناصر کو نئے سرے سے زندہ کرنا چاہتی ہے، اسے بچا لیا۔ ان متناسب حرکات میں ڈھولک اور سرنائی کی دلکش آواز کے ساتھ کی جاتی ہیں۔ اس قدر سادگی اور زور تھا جو سننے والے کو مسحور کر لیتا تھا۔ اور یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوتی تھی کہ سب بچے اور بوڑھے جن میں کہیں کہیں ایک آدھ ہندو بھی نظر آ جاتا تھا۔ نہایت جوش کے ساتھ ناچ میں حصہ لے رہے تھے خصوصاً ایک زندہ دل بوڑھے کے کرتب نہایت دلچسپ تھے جو اس پرانے گیت کے الفاظ کی مجسم تصویر تھا کیا خوب محفل ہے جہاں، لہرا رہی ہوں داڑھیاں" ناچ کے چکروں کے بیچ بیچ میں یہ بڑے میاں اپنی بگلے کے پر جیسی سفید داڑھی لیے ہوئے ایسی بے ساختہ مضحک حرکتیں کرتے تھے کہ بے حس سے بے حس آدمی بھی لوٹ پوٹ ہو جائے۔

رات کو ایک عام جلسہ ہوا جس کے اندر جا بجا توڑے دار بندوقوں اور رائفلوں کا ایک جنگل سا نظر آتا تھا جس سے یہ بات صاف ظاہر تھی کہ جو لوگ نہایت غور سے گاندھی جی کی تقریر عدم تشدد پر سن رہے تھے وہ کوئی بودے لوگ نہ تھے۔ اس تقریر کے لئے جس کا موضوع "ترک اسلحہ کی قوت" تھا۔ نہایت ہی موزوں ماحول تھا۔ گاندھی جی نے فرمایا: "میں عدم تشدد کا پچاس سال کا تجربہ لئے ہوئے آپ کو یہ بتانے آیا ہوں کہ ترک اسلحہ کی قوت کبھی قوت

سے بدرجہا زیادہ ہے۔ ایک مسلح سپاہی کی ساری طاقت اس کے ہتھیاروں پر موقوف ہے۔ اگر اس کی بندوق یا تلوار اس سے لے لی جائے تو عام طور پر وہ بالکل بے دست و پا ہوکر رہ جاتا ہے لیکن وہ شخص جس نے عدم تشدد کے اصول کو صحیح صحیح عملی جامہ پہنایا ہے ایک ایسی خداداد طاقت رکھتا ہے جس کی دنیا میں کوئی نظیر نہیں۔ انسان کبھی کبھی غفلت میں خدا کو بھول جاتا ہے، لیکن خدا ہمیشہ اس کی نگہبانی اور حفاظت کرتا ہے۔ اگر خدائی خدمت گاروں نے اس راز کو سمجھ لیا ہے۔ اگر ان پر یہ حقیقت ظاہر ہوگئی ہے کہ عدم تشدد دنیا میں سب سے بڑی طاقت ہے تو بہت اچھا ہے ورنہ بادشاہ خاں کے لئے یہ بہتر ہوگا کہ انھیں وہ ہتھیار واپس کردیں جو ان لوگوں نے ان کے کہنے سے چھوڑ دیئے ہیں۔ اس صورت میں وہ کم سے کم اس دنیا کی رسم کی مطابق جو بھی قوت کو پوجتی ہے بہادر کہلائیں گے۔ لیکن اگر وہ ایک طرف اپنے پرانے ہتھیاروں کو چھوڑ دیں، اور دوسری طرف عدم تشدد کی قوت سے بھی محروم رہیں تو یہ ایک ایسا افسوسناک واقعہ ہوگا جس کے لئے میں تیار نہیں ہوں اور جہاں تک مجھے معلوم ہے بادشاہ خاں بھی تیار نہیں ہیں۔"

گاندھی جی نے انھیں سمجھایا کہ اس تعمیری کام میں جو کسی سیاسی مصلحت سے لوگوں کی خدمت کے لئے کیا جائے" اور اس تعمیری کام میں جو عدم تشدد کے ساتھ کیا جائے، کیا فرق ہوتا ہے۔ یہ

دوسری قسم کا کام ایک زبردست قوّت ہے جو لوگوں کو آزادی کی دولت بخشتی ہے۔

لکی مروت میں خدائی خدمت گار افسروں کے ساتھ گاندھی جی نے بات چیت کے دوران میں کہا:

"جوں جوں مجھے آپ سے واقفیت ہوتی جاتی ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ آپ کے ہاں کے لوگ اتنے غریب اور سیدھے سادے اور صاف دل ہیں کہ جب ایک بار اُن کے دل میں کوئی بات بیٹھ جائے تو پھر آسانی سے نہیں مٹ سکتی، اور ان کو بات سمجھانا بھی کچھ مشکل نہیں۔

عدم تشدد کی تنظیم کے اصول اور قواعد ان اصول اور قواعد کے بالکل برعکس ہوتے ہیں جن پر تشدد کی تنظیم مبنی ہے۔ فوج میں افسر اور معمولی سپاہیوں میں اونچ نیچ کی تمیز کی جاتی ہے۔ افسر حاکم اور سپاہی محکوم ہوتا ہے۔ مگر آپ کا جرنیل سب سے بہتر اور سب سے زیادہ سیوا کرنے والا سیوک مانا جاتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو معمولی سے معمولی ماتحت سے بھی کسی طرح بڑا نہیں سمجھتا۔ آپ نے محبت سے خان صاحب کو بادشاہ خان کا لقب دے رکھا ہے۔ لیکن اگر وہ دل میں اپنے آپ کو سچ مچ بادشاہ سمجھنے لگیں اور انھیں یہ زعم ہو جائے کہ وہ جو چاہیں کر سکتے ہیں تو اُن کی سرداری ہی ختم ہو جائے۔ خان صاحب آپ کے بادشاہ اس لیے ہیں کہ خدمت کی جتنی لیاقت ان میں ہے اتنی اور کسی میں نہیں!

تشدد اور عدم تشدد کی تنظیم میں دوسرا فرق یہ ہے کہ فوج کے افسروں، جرنیل، کرنیل وغیرہ کو بادشاہ مقرر کرتا ہے۔ سپاہیوں کو ان کے چناؤ میں کوئی دخل نہیں ہوتا۔ وہ سردار بن کے بیٹھ جاتے ہیں اور انھیں یہاں تک اختیار ہوتا ہے کہ جسے چاہیں ماریں جسے چاہیں رکھیں۔ مگر یہاں بادشاہ خان کو آپ نے خود بادشاہ بنایا ہے اور آپ جب چاہیں انھیں ہٹا بھی سکتے ہیں۔ پر امن فوج میں سپاہی خود جرنیل اور افسروں کا چناؤ کرتے ہیں، اور ویسے بھی ان افسروں کی حکومت محض اخلاقی ہوتی ہے۔ ان کا حکم تب ہی تک چل سکتا ہے جب تک سپاہی اُن کی سنیں۔

یہ تو آپس کے تعلقات کی بات ہوئی۔ اب اگر باہر کی دنیا کے ساتھ تعلقات کو دیکھیں تو بھی وہی فرق ان دونوں نظاموں میں نظر آئے گا۔ یہاں ابھی تھوڑی دیر ہوئی۔ باہر ایک مجمع اکٹھا ہو گیا تھا ان کو دھکے دے کر ہٹانے کے بجائے آپ نے ادب اور منت سے سمجھانے کی کوشش کی۔ جب آپ اس میں ناکام رہے تو خود اندر آ کے بند ہو گئے، اور انھیں کچھ بھی نہ کہا۔ لیکن فوجی ضابطے میں اخلاقی دباؤ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ آئیے اب اس سے بھی ایک قدم اور آگے بڑھیں۔ یہاں جو لوگ باہر سے آئے ہوئے ہیں وہ اگرچہ خدائی خدمتگار نہیں ہیں۔ پھر بھی ہماری بات محبت سے سنتے ہیں اور ان کا یہ ہلڑ مچانا بھی اُن کی محبت ہی کی ایک نشانی ہے۔ مگر ان کے علاوہ کچھ لوگ

ایسے بھی ہیں جو ہم سے دوستی نہیں بلکہ دشمنی رکھتے ہیں۔ پر تشدد میں تو ایسے لوگوں کا خاتمہ کر دیا جاتا ہے۔ مگر ہمارے یہاں دشمن کو دل میں دشمن سمجھنا بھی محبت کی بولی میں گناہ کہلائے گا۔ سو ہم ان سے بدلہ لینے کے بجائے دعا کرتے ہیں کہ ان کی طبیعت بدل جائے اور اگر ان میں کوئی تبدیلی نہ ہو تو ہم ان کی مار پیٹ کو برداشت کرتے رہیں، اور بزدلی سے نہیں بلکہ اپنی خوشی سے۔

جنوبی افریقہ کے ستیہ گرہ کے دوران میں میر عالم خاں نے غلطی سے یہ سمجھ بیٹھا کہ میں نے قوم سے دغا کی ہے۔ چنانچہ اس نے مجھ پر اچانک قاتلانہ حملہ کیا اور مجھے مردہ سمجھ کر بھاگ گیا۔ آخر غنڈہ اندر بزدل ہی ہوتا ہے۔ جب وہ گرفتار کر کے عدالت میں لایا گیا تو میں نے بیان دیا کہ میں اسے گرفتار کرانا نہیں چاہتا۔ کیونکہ اس نے جو کچھ کیا غلط فہمی کی وجہ سے کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ میرا دوست بن گیا۔ اور ایک بڑے مجمع میں اس نے مجھ سے معافی مانگی۔ اگر میں نے بدلہ لینے کی کوشش کی ہوتی تو یہ بات کبھی نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ طبیعت کے بدلنے کی اعلیٰ مثال کہی جا سکتی ہے۔ لیکن اگر محبت سے دشمن کی طبیعت کو بدلنے کی لگن آپ اپنے اندر محسوس نہیں کرتے تو آپ کے لئے یہی بہتر ہے کہ آپ عدم تشدد سے کنارہ کریں۔ یہ چیز آپ کے بس کی نہیں۔ آپ پوچھیں گے کہ اگر کوئی چور ڈاکو آ جائے یا کسی بے بس عورت پر کوئی بدمعاش حملہ کرے تب کیا اس وقت بھی ہم تشدد کا

استعمال نہ کریں ۔ میرا جواب ہے ، ہرگز نہیں ۔ جان لینے کا حق صرف خدا کی ذات واحد و لایزال ہی کو حاصل ہے ۔ اسی کو یہ قدرت ہے کیونکہ اصل حقیقت کو صرف وہی جانتا ہے کہ بے خطا فیصلہ کر سکے۔ انسان غلطی کا پتلا ہے ۔ اسے فیصلے کا حق حاصل نہیں ۔ عدم تشدد کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ لاچار ہو کر برائی کو برداشت کر لیں ۔ یا اسے نظر انداز کر دیں یا ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ جائیں ۔ اگر ہمارا عدم تشدد سچا ہے اور محبت سے پیدا ہوا ہے تو برائی کو روکنے کے لئے تشدد سے کہیں بڑھ چڑھ کر موثر ثابت ہوگا ۔ آپ سے میں اس بات کی توقع رکھوں گا کہ اگر خدانخواستہ ایسا موقع آئے تو آپ ڈاکوؤں کو کھوج نکالیں ۔ ان کو ان کی غلطی سمجھائیں ، اور اس کام میں اگر جان بھی جاتی ہو تو اس کی پروا نہ کریں "

لکی سے ڈیرہ اسمعیل خاں تک، موٹر کا بڑا لمبا اور تھکا دینے والا سفر تھا ۔ اس علاقے میں ایک وسیع خشک منظر میدان ہے جو دریائے سندھ کے کنارے تک پھیلا گیا ہے ۔ اس کے بیچ بیچ میں چکنی مٹی کی پہاڑیاں کسی دقیانوسی جانور کے ڈھانچے کی طرح کھڑی ہیں ۔ ان کے پہلوؤں میں ہوا اور بارش نے گہری دراڑیں ڈال دی ہیں ۔ اونٹوں کی قطاریں اپنی پیٹھ پر ننھے بچوں سے لے کر مرغیوں اور جلانے کی لکڑیوں تک پورے گھر بار کا سامان لادے چلی جا رہی ہیں ۔ افغانستان کے موٹے تازے ، خوفناک پاسبان کتے اپنے

مالک کے خاندان کے ساتھ جاڑا بسر کرنے کے لیے برطانوی ہند کے میدانوں کی طرف کا رخ کیے چلے جا رہے ہیں۔ گرم ہوا کے پردے کے پیچھے سراب کی جھلک نظر آتی ہے۔ گرد سے ڈھکی ہوئی جھاڑیاں سڑک کے کنارے تیزی سے دوڑتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ مگر جب ڈیرہ اسمٰعیل خاں کے راستے کی سب تصویریں حافظے میں آتی ہیں تو گرد اور دھوپ کا نقش ہی سب سے زیادہ نمایاں ہوتا ہے۔

شام کے وقت ہم ڈیرہ اسمٰعیل خاں پہنچے۔ یہاں ۱۹۳۰ء کے ہندو مسلم فساد، لوٹ مار اور آتش زدگی کے واقعات کے آثار اب تک باقی تھے۔ مقامی کانگریس محض برائے نام تھی اور یہاں کے والنٹیرز کو بادشاہ خاں کے خدائی خدمت گاروں کے ساتھ مل کر کام کرنا بھی گوارا نہیں تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب گاندھی جی شام کو اپنی قیام گاہ پر پہنچے تو مجمع کو قابو رکھنے کا سارا انتظام درہم برہم ہو گیا اور پرارتھنا کی صحبت نہیں ہو سکی۔ بعض من چلے چھت پر چڑھ گئے۔ اور گاندھی جی کے کمرے کے روشن دان سے بیسیوں متجسس آنکھیں اندر جھانکنے لگیں۔ دو دن کے بعد ڈیرہ اسمٰعیل خاں کے نواب گاندھی جی اور ان کے ساتھیوں کو ان کے ہندو میزبان کی اجازت سے "گرفتار" کر کے اپنے ساتھ لے گئے اور انھیں اپنے مکان میں رکھا جہاں مقابلتاً امن تھا۔

دوسرے دن شام کو ایک عام جلسہ ہوا جس میں ۵۷۵۴ روپے کی تھیلی گاندھی جی کی خدمت میں پیش کی گئی۔ یہ رقم ڈیرہ اسمٰعیل خاں

جیسے شہر کے لئے کچھ بھی نہ تھی۔ اور اس میں بھی پانچ ہزار روپے ایک ہی شخص کا عطیہ تھا۔

گاندھی جی نے متعدد سپاس ناموں کے جواب میں جو ان کے سامنے پیش کئے گئے تھے۔ ایک تقریر کی جس میں انھوں نے کہا:

آپ لوگوں نے مجھے روپے کی جو تھیلی دی ہے، اس کا میں شکریہ ادا کرتا ہوں۔ ان سے میرا پیٹ نہیں بھرتا مجھے تو کروڑوں آدمیوں کا کام کرنا ہے۔ مگر میں اس وقت پیسے جمع کرنے نہیں آیا ہوں۔ پیسے جمع کرنے آتا تو دوسری طرح کام کرتا۔ امیروں سے پیسے اکٹھا کرکے غریبوں کی جیب میں ڈالنا، یہ میرا اپنا کام ہے۔ بادشاہ خان نے مجھ سے کہا تھا کہ یہاں سے پیسے نہ لینا۔ مگر میں آپ کی تھیلی واپس کردوں، یہ مجھے اچھا نہیں لگتا۔ اتنا آپ لوگ سمجھ لیں کہ ہماری عورتوں کو دیہاتوں میں پیٹ بھر کر کھانا نہیں ملتا تو ان سے آزادی کی گفتگو کرنا بے کار ہے۔ جب تک ہندو، مسلمان، عیسائی سب ایک دل نہیں ہو جائیں گے۔ آزادی صرف نام کی ہی ہوگی۔ عدم تشدد کے ذریعے آزادی حاصل کرنی ہے تو ہمیں چار طرح کا تعمیری پروگرام پورا کرنا ہوگا۔ یعنی کھادی، قومی اتحاد، چھوت اچھوت کا دور کرنا اور نشہ بندی۔

اس صوبے میں ہندو مسلمان اور انگریز تینوں کا امتحان ہو رہا ہے۔ پہلے میں کہا کرتا تھا کہ ہمارا امتحان پنجاب میں ہوگا۔ مگر اس وقت تک میں سرحدی صوبے میں نہیں آیا تھا۔ انگریزوں نے ہندوستان کو

غلامی کی زنجیر میں جکڑنے کے لئے جو کچھ کیا ہے اس کا فیصلہ تو اریخ آگے چل کر کرے گی۔ مگر ہندو مسلمان آج اپنی تاریخ خود بنا رہے ہیں۔ اگر وہ آپس کے تعلقات ٹھیک کرلیں تو دنیا کے لئے ایک مثال قائم کر جائیں گے۔ بس اگر خدائی خدمت گار عدم تشدد کو سمجھ لیں اور اس پر قائم رہیں تو یہ سب جھگڑے طے ہو سکتے ہیں۔ ہمیں کھادی کے ذریعے سے یہ کوشش کرنی ہے کہ کروڑوں روپیہ جو سوت کی خریداری کے لئے ہندوستان سے باہر جاتا ہے بچ جائے۔ چرخہ سنگھ نے کھادی کے کام کے ذریعے سے اب تک چار کروڑ روپئے سے زیادہ غریب ہندو مسلمان کاتنے اور بننے والوں کو مزدوری کے طور پر تقسیم کیا ہے۔ اس کے علاوہ اچھوت ادھار کا کام ہے اور یہ بھی ہفت خواں سے کم نہیں ہے۔ آپ کا عطیہ اس عظیم انشان کام کی مناسبت سے ہونا چاہئے جس کے لئے وہ دیا گیا ہے۔ آپ کا شہر کوئی غریب شہر نہیں ہے۔ چندہ زیادہ تر تاجروں نے دیا ہے۔ یقیناً آپ لوگ اس سے زیادہ دے سکتے تھے۔ اس کے بعد خدائی خدمتگاروں سے مخاطب ہو کر انھوں نے ان کے اندر مقامی والنٹیروں کے تعلقات کی کشیدگی کا ذکر کیا جو اُن کے علم میں آئی تھی۔ یہ اختلافات بہت افسوسناک ہیں۔ لیکن اگر خدائی خدمت گار اپنے اصول پر جو وہ اب اچھی طرح سمجھ گئے ہیں، پورا پورا عمل کریں تو یہ جھگڑے اور لڑائیاں داستانِ پارینہ بن جائیں گی۔ یہی ان کے امتحان کا

وقت ہے۔ اگر وہ اس میں کامیاب ہو گئے تو وہ فرقہ وارانہ اتحاد پیدا کرنے اور سوراج قائم کرنے میں مدد دیں گے۔ میں جانتا ہوں کہ غصے کو بالکل نکال دینا بہت مشکل کام ہے۔ یہ محض انسان کی کوشش سے نہیں ہو سکتا ہے۔ اس کے لیے توفیق الٰہی کی ضرورت ہے۔ آپ سب لوگ میرے ساتھ مل کر خدا سے دعا کیجیے کہ وہ خدائی خدمت گاروں کو اتنی قوت دے کہ اپنے دل سے غصہ اور تشدد کے رہے سہے آثار بھی دور کر دیں۔"

کلاچی اسی نام کی تحصیل کا صدر مقام ہے اور دریائے لونی کے شمالی کنارے پر ڈیرہ اسمٰعیل خاں سے ۲۷ میل پچھم میں واقع ہے یہاں کے لوگوں نے ۲۰ اکتوبر کو ایک عام جلسے میں گاندھی جی کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کیا۔ اس میں اس تحصیل کے دائمی افلاس کا اور بارش کی کمی کا ذکر تھا جس کا اوسط سال میں چار انچ سے زیادہ نہیں۔ گاندھی جی نے یہ سن کر بے تامل جواب دیا کہ "چرخہ چلانے سے افلاس دور ہو سکتا ہے"۔ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ پٹھان یہ پرامن مشغلے اختیار کریں تو سوت اور اون کی کتائی کا مستقبل بہت شاندار ہوگا۔"

اگلے دن ٹونک کے عام جلسے میں گاندھی جی نے ان شکایتوں کا ذکر کیا جو وہاں کے ہندوؤں نے ان کے سامنے پیش کی تھیں۔ ہندوؤں کے ایک وفد نے ان کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ شکایت کی تھی کہ ان

کا جان مال محفوظ نہیں اگر مقامی خدائی خدمت گار ان کی مدد کریں تو ان کا مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ گاندھی جی نے کہا۔ ان لوگوں کا یہ خیال ہے کہ اس علاقے میں مسلمانوں کی کثیر آبادی کے درمیان مٹھی بھر ہندوؤں کی گذر اسی وقت ہو سکتی ہے جب مسلمان ان کے ساتھ سچ مچ ہمسایوں کا سا برتاؤ کریں۔ انھوں نے مجھ سے درخواست کی ہے کہ خدائی خدمت گاروں کو اس قدرتی فرض کی طرف توجہ دلاؤں جو ان پر عائد ہوتا ہے۔ میں ان کے اس خیال کی اور اس درخواست کی تائید کرتا ہوں، اور مجھے یقین ہے کہ اگر وہ توقعات جو میں نے آپ سے قائم کی ہیں پوری ہو جائیں تو ان لوگوں کو کوئی کھٹکا نہ رہے گا۔ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ اس صوبے میں ہندو مسلمان اور انگریز سب کی آزمائش ہو رہی ہے۔ انگریز جو کچھ کر رہے ہیں اس کی اچھی برائی کا فیصلہ تاریخ کرے گی، لیکن ہندو اور مسلمان چاہیں تو آپس کے اچھے برتاؤ سے اپنی تاریخ کو بدل سکتے ہیں خدائی خدمت گاروں کا راستہ تو صاف ہے انھیں اپنے ہمسایوں کا پشت پناہ بن کر رہنا ہے۔

سچے ارادے اور پکے عقیدے کے مٹھی بھر آدمی تاریخ کی رو کو بدل سکتے ہیں۔ یہ پہلے بھی ہو چکا ہے اور اب بھی ہو سکتا ہے۔ اگر خدائی خدمت گاروں کا عدم تشدد محض ملمع نہیں بلکہ کھرا سونا ہے۔

خدائی خدمت گار افسروں کے ساتھ بات چیت کے دوران میں
گاندھی جی نے کہا: "بادشاہ خاں نے آپ لوگوں کا نام خدائی خدمتگار
رکھا ہے اور ہندوستان کو یہ بات سنائی گئی ہے کہ آپ عدم تشدد
کے پابند ہیں۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو چھپی نہیں رہ سکتی۔ جیسے سورج
نکلتا ہے تو اندھے کو بھی اس کی حرارت محسوس ہونے لگتی ہے۔ ویسے
ہی آپ کی محبت کی حرارت ہندوستان بھر میں پھیل جائے گی۔ آج تک
ایک بھی خدائی خدمت گار مجھے ایسا نہیں ملا جس نے یہ کہا ہو کہ وہ عدم
تشدد کا پابند نہیں یا اسے سمجھتا نہیں۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم عدم تشدد
پر قائم ہیں اور رہیں گے۔ خدا نے چاہا تو ایسا ہی ہوگا۔ میرے
جیسا آدمی جس نے تلوار یا بندوق کو چھوا تک نہیں یہ کہے کہ میں عدم تشدد
پر قائم رہوں گا تو اس کی بات کی کوئی اہمیت نہیں۔ لوگ کہیں گے کہ
اس سے اور ہو ہی کیا سکتا ہے۔ مگر جب آپ لوگوں کے بارے میں
میں یہ کہتا ہوں کہ آپ عدم تشدد پر قائم رہیں گے تو لوگ ہنستے ہیں
اور مجھے بیوقوف بتاتے ہیں مگر میں یہ نہیں مانتا کہ میں بیوقوف
ہوں۔ البتہ اگر کسی پر اعتبار کرنا بے وقوفی میں داخل ہے تو ایسا بے وقوف
بننا مجھے اچھا لگتا ہے۔ آخر میں کیوں نہ دوسروں کے قول پر اسی طرح
بھروسا کروں جیسے میں چاہتا ہوں کہ دوسرے لوگ مجھ پر بھروسا کریں
اگر آپ کے بارے میں میرا خیال غلط ہے تو بہت جلد اس کا پتہ چل جائے
گا یہ ایسی چیز نہیں جس کا اثر دیکھنے کے لئے پچاس سال انتظار کرنا

پڑے۔ یہاں کے ہندو لوگ بھی میرے پاس آتے ہیں۔ ان کو یقین نہیں ہے کہ آپ سچے خدائی خدمت گار ہیں۔ اگر آپ لوگ پوری طرح عدم تشدد پر قائم ہوں گے تو خود بخود سب لوگ قائل ہو جائیں گے۔ یہ ایک بڑا معجزہ ہوگا۔ دو تین دن ہوئے سرحدی صوبے کے معزز مسلمان میرے پاس آئے تھے۔ کہنے لگے تم بڑے ہوشیار ہو۔ خدائی خدمت گاروں سے میل جول پیدا کر رہے ہو۔ یہ اچھی ترکیب ہے۔ میں تمھاری چال سمجھ گیا ہوں۔ میں چونکا کہ نہ جانے کیا سمجھے ہوں گے۔ وہ کہنے لگے کہ تم خدائی خدمت گاروں کو بہادر بنا رہے ہو۔ یوں تو وہ پہلے ہی سے بہادر ہیں۔ مگر تم ان کی بہادری کو اور بڑھا رہے ہو۔ جہاں تک بن پڑے گا یہ لوگ تلوار سے کام نہیں لیں گے۔ بہادر کو تلوار کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ ہٹلر کو دیکھو نہ! بغیر تلوار نکالے وہ فتح پر فتح حاصل کر رہا ہے۔ لیکن اگر کبھی ان لوگوں کو تلوار نکالنے کا موقع پڑ جائے تو ان کی تلوار سب کو کاٹ کر رکھ دے گی۔

میں دل میں کچھ ہنسا اور کچھ رو دیا۔ اگر میری تعلیم آپ کے دل میں اس طرح کا جذبہ پیدا کرتی ہے تو پہلے میرے دل میں یہ جذبہ ہونا چاہیے۔ لیکن میں تو خدا کو حاضر ناظر جان کر کہتا ہوں کہ ایسی بات میرے دل میں کبھی آتی ہی نہیں۔ تو پھر آپ کے دل میں کیسے آ جائے گی خصوصاً ایسی حالت میں کہ آپ نے میرا پیام خود میرے منہ سے سنا ہے۔

مجھ میں غصہ تو کافی ہے۔ مگر پچاس سال کی کوشش سے میں اسے قابو میں رکھ سکتا ہوں۔ مخالف پر تو مجھے غصہ آتا ہی نہیں ہے۔ مگر دوستوں پر کبھی کبھی کر لیتا ہوں۔ اتنی کمزوری مجھ میں ضرور ہے۔ میں آپ کو جو سکھانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ فرض کیجئے یہاں جنگ چھڑ جائے۔ دشمن معصوم بچوں اور عورتوں کو قتل کرنا شروع کر دیں اور ہر طرح سے آپ کو اور مجھے اشتعال دلانے کی کوشش کریں۔ تب بھی ہم تشدد کا دامن نہ چھوڑیں۔ خدا ہمارا امتحان اسی طرح سے لیتا ہے۔

اس دوست نے جو کچھ میری بابت سمجھا وہی چیز کئی انگریزوں کے دلوں میں بھی ہے۔ مگر میں تو آپ لوگوں کو اس کے برعکس تعلیم دینا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں آپ لوگ غصے کو بالکل دل سے نکال دیں۔ مرنے سے تو ڈرنا ہی کیا۔ آپ تو پہلے بھی نہیں ڈرتے تھے۔ اب اور بھی نڈر ہو جائیں گے۔ کوئی ہم کو مار ڈالے، ہمارے معصوم بچوں کو قتل کر ڈالے، تو بھی ہماری تلوار اس پر نہیں چلے گی۔ اس کو غلط راستے سے روکنے کی کوشش میں ہم خود مر جائیں گے مگر اس پر غصہ نہیں کریں گے۔

مجھ سے کسی نے پوچھا تھا کہ فرض کیجئے آپ کی لڑکی کو ڈاکو اٹھا کر لے جاتے ہیں۔ آپ اس کی حفاظت کے لیے مرنا چاہتے ہیں۔ مگر وہ آپ کو درخت سے باندھ دیتا ہے، اور مرنے بھی نہیں دیتا۔ تب

آپ کیا کریں گے ؟ میں نے جواب دیا کہ تب میں لاچار ہو جاؤں گا اور خدا مجھے معاف کر دے گا۔ مگر میں اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ وہ جس رسی سے مجھے باندھے جہاں تک ہو سکے گا اُسے توڑ ڈالوں گا۔ لیکن اگر اس کو توڑنے کی طاقت ستر سال کی عمر میں مجھ میں نہ ہوئی تو اس کوشش میں خود ٹوٹ جاؤں گا۔ صرف اس کی ضرورت ہے کہ زندگی کی محبت دل سے نکال دیں۔ اپنی جان دینے کی طاقت تو ہر انسان میں ہوتی ہو ہونی ہی چاہیے۔

تو میں آپ کو جان دینے کا فن سکھانا چاہتا ہوں۔ کوئی آپ کی بیوی بچوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے تو بھی آپ کے منہ سے یہی نکلے کہ یا خدا اس پر رحم کر۔ اسے حیوانیت سے بچا۔ اگر آپ یہ سیکھ سکتے ہیں تو بہت اچھا ہے۔ لیکن اگر نہیں سیکھ سکتے تو بہتر ہوگا کہ آپ بھی تلوار اٹھائیں مجھے کوئی شکایت نہ ہوگی۔ میں آپ سے ہاتھ دھو لوں گا اور صبر کر کے بیٹھ رہوں گا۔ رہی دنیا تو اُسے شکایت ہی کیا ہو سکتی ہے۔ آپ نے ہزارہا سال تلوار چلائی ہے۔ آیندہ بھی وہی کرتے رہیں تو اس میں کوئی انوکھی بات نہ ہوگی۔ لیکن اگر میری تعلیم کی وجہ سے آپ تلوار چھوڑ کر بزدل اور نامرد بن جائیں تو اس میں آپ کی، میری خان صاحب کی سب کی ذلت ہے۔

غالباً یہ ایک پہلا موقعہ تھا کہ کسی شخص نے ان لوگوں سے اس طرح گفتگو کی تھی، اور عدم تشدد کا مکمل پیغام ان تک پہنچایا تھا۔ خود

یہ بات کہ گاندھی جی کو اس کا موقع دیا گیا، پٹھانوں کی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز کرتی ہے۔ جب یہ اکھڑ سپاہی اپنے سردار خان عبدالغفار خان کی تیز نظروں کے سامنے گاندھی جی کے انوکھے پیام امن کو غور سے سن رہے تھے تو ان کو دیکھ کر بے اختیار کیٹس کے یہ لافانی اشعار یاد آجاتے تھے جن میں بہادر کورٹیز اور اس کے ساتھیوں کا ذکر ہے۔

اس وقت میری حالت اس شخص کی سی تھی جو دوربین لگائے آسمان کو
دیکھ رہا ہو اور یکایک ایک نئے ستارے کی جھلک اس کی
نظر پر آن کر پڑتی ہے یا بہادر کورٹیز کی سی جس کی عقاب
کی سی تیز نظریں بحرالکاہل کو جھانتی ہوئی یکایک ٹھٹک گئیں
اور اس کے سب ساتھی کبھی حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھتے
تھے اور کبھی ڈارین کی سرزمین پر پہاڑ کی ایک چوٹی کو ——

بارھواں باب

آزاد قبائل میں

ڈیرہ اسمٰعیل خاں پہنچ کر صوبہ سرحد کے قبائلی علاقوں کا دورہ ختم ہوگیا۔ ۱۳ مارچ گذشتہ کو سہ پہر کے وقت ڈیرہ اسمٰعیل سے روانہ ہوکر ہم نے دورے کا آخری حصہ شروع کیا۔ سیوا گرام سے جہاں بیماری پھیل گئی تھی اور آدھے کارکن، صاحب فراش تھے واپسی کا تقاضا ہو رہا تھا۔ اس کے علاوہ گاندھی جی کو یہ فکر تھی کہ رمضان کے مہینے میں اپنے دورے کو اس سے زیادہ جاری نہ رکھیں جتنا کہ اشد ضروری تھا جس اہتمام کے ساتھ ہمارے مسلمان میزبان بادشاہ خان صاحب اور ان کے خدائی خدمت گار روزے کی حالت میں گاندھی جی اور ان کے ساتھیوں کے کھانے پینے کا اور آرام و آسائش کا سامان کرتے تھے اس کی وجہ سے گاندھی جی کو اور بھی لگنے لگا کہ جہاں تک ہوسکے ان کا بوجھ ہلکا کرنا شرافت کا تقاضا ہے۔ ایک روز جب ہم دوپہر کے کھانے کے بعد سڑک کے کنارے

ایک چھوٹے سے گاؤں میں ٹھہرے تھے۔ گاندھی جی نے خدائی خدمتگاروں سے گفتگو کرتے ہوئے اس بات کی طرف اشارہ کیا۔ انھوں نے کہا " میں اس سے بہت متاثر اور شرمندہ ہوں کہ رمضان کے زمانے میں جب کہ مسلمانوں کے اس گاؤں کے کسی ایک گھر میں بھی چولھا نہیں جلتا۔ ہم لوگوں کے لئے آپ کو کھانا پکوانا پڑا۔ اب میری وہ عمر نہیں کہ میں بھی آپ لوگوں کے ساتھ روزہ رکھوں۔ جیسے میں جنوبی افریقہ میں ان مسلمان بچوں کی تربیت کی غرض سے رکھتا تھا جو میری نگرانی تھے۔

"اس کے علاوہ مجھے خاں صاحب کے جذبات کا لحاظ تھا۔ جنھیں دن رات میرے آرام کی فکر رہتی ہے۔ میرے روزے رکھنے سے ضرور وہ پریشان ہوتے۔ اس کے سوا کہ میں آپ سے معافی مانگوں اور کیا کر سکتا ہوں "۔

ہمارا باقی سفر بھاگ دوڑ میں گذرا۔ پہلے دن ہم سو میل کا فاصلہ طے کر کے پنبالے کے گاؤں تک پہنچنا چاہتے تھے جو بڑی سڑک سے دس میل کے فاصلے پر ہے۔ جب ہم میری خیل پہنچے تو اندھیرا ہو چلا تھا اور سڑکیں روک دی گئی تھیں۔ اس سڑک کے اس حصے میں سفر خطرناک سمجھا جاتا ہے اور سہ پہر کے چار بجے کے بعد آمدورفت کی اجازت نہیں دی جاتی۔ لیکن بادشاہ خاں کی موجودگی ہر جگہ " کھل جا سم سم " کا کام دیتی تھی۔ جب ہم پہلی روک پر پہنچے تو بادشاہ خاں نے اپنے بیٹے ولی خاں سے جو موٹر چلا رہے تھے کہا " ان لوگوں سے

کہو کہ ہم اپنی ذمہ داری پر سفر کرنا چاہتے ہیں اور دیکھو اگر کوئی شخص چلائے کہ ٹھہر جاؤ تو فوراً گاڑی روک دینا۔ اگر لوگوں کو معلوم ہو جائے گا کہ ہم کون ہیں تو کوئی ہم سے تعرض نہیں کرے گا۔ لیکن اگر تم نے یہ کوشش کی تیزی سے نکل جاؤ تو ممکن ہے کہ پیچھے سے بندوق کی آواز سنائی دے۔" رات کو ہم مقصود جان اور ان کے بھائی کے باغ میں ٹھہرے جنھوں نے اپنی اعلیٰ تعلیم کو دیہاتی وضع اور لمبی سفید ریش میں چھپا رکھا ہے۔ صبح پھر وہی بھاگ دوڑ شروع ہو گئی۔ اسی راستے سے ہم ڈیرہ اسمٰعیل خاں واپس پہنچے اور احمدی بانڈہ نام گاؤں میں دو گھنٹے ٹھہر کر بنوں کے قریب سے گذرتے ہوئے سالٹ رینج کی بھوری مٹی کی پہاڑیوں کے ساتھ ساتھ چلتے رہے جن کی شکستہ چوٹیوں پر ہمیشہ ایک طلسمی سکوت اور خواب سا چھایا رہتا ہے۔ پھر کوہاٹ کے شہر اور درہ کوہاٹ سے ہوتے ہوئے اس مقام سے گذرے جہاں ایک چھوٹی سی پگ ڈنڈی ایک کوہستانی گھاٹی سے نکلتی ہے۔ اسی جگہ سے لوگ مولی ایلس کو پکڑ کر لے گئے تھے۔

اب اس مقام پر پولیس کا پہرہ لگا دیا گیا ہے۔ اس سے آگے ایک سو پچیس میل کا فاصلہ طے کر کے شام کے وقت ہم پشاور شہر کے چوک میں پہنچ گئے۔

جب ہم اسفغان کی سڑک پر اڑتے چلے جا رہے تھے، تو بادشاہ خاں مختلف مقامات اور مناظر پر جرح کرتے ہیں آتے

تھے سرحدی ہمدرد گرتے جاتے تھے۔ بنوں سے کوہاٹ جانے والی سڑک کی بے شمار فوجی چوکیوں میں سے ایک کے پاس سے گذرتے ہوئے انھوں نے کہا "کس قدر بیکار اسراف ہے۔ یہاں تماجی ذرا جھنڈ مل اور مسلح گاڑیوں اور ٹینکوں کی اس بے جا نمائش کو دیکھے گا اور اس پر بھی یہ لوگ ڈاکوؤں کے اس چھوٹے سے گروہ کو جو مدت سے اس علاقے کو تاراج کر رہا ہے۔ گرفتار کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے۔ ایک سال ڈاکوؤں کے سردار نے اپنا جھنڈا سامنے کی پہاڑی پر برطانوی فوج کے سامنے گاڑ دیا اور پکار کر کہا کہ اگر ہمت ہو تو مجھے پکڑ لو لیکن وہ اب تک پکڑا نہیں گیا۔ یا تو یہ فوج کی انتہائی نالائقی ہے اور یا اس کی مجرمانہ بے پروائی"

پٹیالہ اور احمدی باندھ میں گاندھی جی نے خدائی خدمت گاروں سے گفتگو کی اور پٹیالہ میں ایک عام جلسہ بھی ہوا۔ مگر قبل اس کے کہ میں گاندھی جی کی گفتگو کا خلاصہ بیان کروں یہ ضروری ہے کہ جو لوگ ان کے مخاطب تھے اُن کی کچھ روایات اور خصوصیات بیان کر دی جائیں۔

لفظ افغان ایک وسیع معنی رکھتا ہے جس کا اطلاق افغانستان کی جدید ریاست کے ہر باشندے پر ہوتا ہے لیکن لفظ پٹھان کا تعلق زبان سے ہے۔ یہ پختون کی بگڑی ہوئی شکل ہے جس کے معنی ہیں پختون بولنے والا۔ اس میں جنوبی مشرقی

افغانستان اور ہندوستان کے سرحدی علاقے کے سب لوگ جو پختون یا پشتو بولتے ہیں شامل ہیں۔ ایک چیز جس پہ بادشاہ خان عام جلسوں میں تقریر کرتے ہوئے اکثر زور دیتے تھے یہ بھی کہ ہر وہ شخص پٹھان ہے جس نے اس صوبے کو اپنا وطن بنا لیا ہے اور پختون بولتا ہے، چاہے ہندو ہو یا سکھ یا مسلمان۔ واقعی ایسے ہندو اور سکھ مرد عورتیں اور بچے موجود ہیں جو پٹھانوں کے درمیان بس گئے ہیں، پٹھانوں کا لباس پہنتے ہیں اور پشتو کے سوا کوئی زبان نہیں بولتے۔ یہاں تک کہ انھوں نے اپنے ناموں میں پشتو زبان کا لاحقہ، زئی بھی لگا لیا ہے۔

پٹھان بڑے تندرست ہوتے ہیں۔ ان کا جسم دبلا مگر مضبوط اور لچک دار ہوتا ہے۔ سارے دورے میں ایک پٹھان بھی نہیں ملا جس کا پیٹ نکلا ہوا ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ بے چربی کا گوشت کھاتے ہیں۔ اور نشاستے دار غذائیں بہت کم استعمال کرتے ہیں۔ یہ کبھی بغیر ہتھیار لگائے باہر نہیں نکلتے۔ مویشی چراتے وقت لدو جانوروں کو ہانکتے وقت، کھیت بوتے وقت، میلے ٹھیلے میں، عام جلسوں میں، غرض ہر وقت، ہر جگہ وہ مسلح ہوتے ہیں ان کی رائفل یا بھاری جزائل (پرانے فیشن کے پٹھان توڑے دار بندوق کو اس نام سے پکارتے ہیں۔) عموماً بائیں کندھے سے لٹکی ہوتی ہے۔ کارتوسوں کی پیٹی، چھریاں اور خنجر ان کے جسم میں

جا بجا گھسے ہوئے ہوتے ہیں مثلاً کمر کی پٹی پر، گریبان کے نیچے گولی پر
اس تمام وقت میں جو وہ گھر سے باہر گزارتے ہیں دم بھر بھی الگ
نہیں ہوتے۔ وہ بڑے ماہر نشانہ باز ہوتے ہیں اور گھات میں
چھپ کر بیٹھنے، چھاپہ مارنے اور پہاڑی لڑائی لڑنے میں کمال رکھتے ہیں

جو انگریز پٹھانوں پر کتابیں لکھتے ہیں وہ عام طور پر ان کی [illegible]
کو برا کہتے ہیں۔ اس لئے کہ ان میں سے اکثر پرانے فوجی افسر ہوئے
ہیں جن سے ان کی دشمنی ہے۔ پٹھانوں کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ
وہ "پرلے سرے کے چور اور لٹیرے ہوتے ہیں"۔ کمانڈر اسٹیفن کنگ
ہال فرماتے ہیں "پٹھان سوتے آدمی کے نیچے سے کمبل تک چرا لیتے
ہیں" لیکن ڈیویز کا اور اس دلچسپ کتاب "کاروانِ خیبر" کے
مصنف کا خیال ہے کہ اصل مسئلہ یہ نہیں کہ پٹھانوں کو سوتے
ہوئے شہریوں کے نیچے سے کمبل چرانے سے کیونکر روکا جائے
بلکہ یہ ہے کہ سنتریوں کی رائفلوں کی چوری کیونکر بند کی جائے۔ یہاں
تک ہوا کہ رائفل کے چوری جانے پر مارشل لا کی سزا دی گئی، اور
پہرے والوں کی بندوقیں ان کی کلائی یا کمر پر زنجیر سے جکڑی جانے
لگیں۔ مگر اس کا نتیجہ صرف یہی ہوا کہ رائفل بمعہ سنتری لاپتہ
ہونے لگیں۔

اپنے سماجی تعلقات میں پٹھان "پٹھن ولی" کے یعنی تین اخلاقی
ضابطوں کے پابند ہیں جن کا قبائل کے لوگوں کو خیال رکھنا پڑتا ہے۔

جن کی خلاف ورزی گناہِ کبیرہ سمجھی جاتی ہے اور دائمی ذلت اور معاشرتی مقاطعے کا باعث ہوتی ہے۔

(۱) پٹھان کو چاہیئے کہ مفرور کو پناہ دے (ننواتی) (۲) اس کا فرض ہے کہ سخت سے سخت اپنے دشمن سے مہمان نوازی (میلمستیا) کا برتاؤ کرے (۳) اس پر لازم ہے کہ توہین کا بدلہ توہین سے لے (بدل)، اس آخری اصول کی وجہ سے خون کی عداوت کا سلسلہ چلتا رہتا ہے جو پٹھانوں کی قوم کے لئے ایک لعنت ہے۔ ہر قبیلے کی چھوٹی چھوٹی گوتوں میں خانہ جنگی ہوتی رہتی ہے ہر خاندان کسی نہ کسی خاندان سے خون کی عداوت رکھتا ہے اور ہر شخص کے کچھ نہ کچھ جانی دشمن ہوتے ہیں۔ ہر شخص اپنی قتل کی وارداتوں کا شمار رکھتا ہے ہر قبیلے کا اپنے ہمسایوں سے جانوں کی لین دین کا کھاتا ہوتا ہے ڈلویہر لکھتا ہے "بدقسمتی سے سرکش پٹھانوں کو یہ احساس نہیں کہ اس وحشیانہ رسم کے مہلک اثر سے ان کے بہت سے بہترین خاندان قریب قریب ختم ہو گئے ہیں۔ جب تک یہ خانہ جنگیاں موقوف نہ ہوں نہ تو ایک متحدہ قوم بن سکتی ہے اور نہ امن قائم ہو سکتا ہے"!!

بہرحال پٹھانوں کی سیرت کی اچھی یا بُری صفات میں اب تک عدم تشدد داخل نہ تھا۔ اسی لئے گاندھی جی نے خدائی خدمتگاروں کو یہ بتانے میں خاص اہتمام کیا کہ وہ جو بات انھیں سمجھانے کے لئے آئے ہیں وہ ان کے قدیم علم و عمل سے بالکل الگ ہے اور بادشاہ خاں

کی تعلیم روایات ماضی کے بالکل برعکس ہے۔ انھوں نے پٹیالہ کے خدائی خدمت گاروں سے کہا:-

"میں نے جو کچھ بادشاہ خاں سے سُنا تھا۔ وہ اب خود آپ لوگوں کی زبان سے سُن لیا کہ آپ نے عدم تشدد کو مصلحت وقت کے طور پر نہیں بلکہ ایک عقیدے کے طور پر ہمیشہ کے لئے اختیار کر لیا ہے۔ اس لئے محض تلوار کو ہاتھ سے رکھ دینا جب کہ آپ کے دل میں تلوار موجود ہے، کچھ زیادہ فائدہ نہیں دے گا۔ تلوار کا ترک اس وقت تک سچا نہیں سمجھا جائے گا جب تک آپ کے دل میں ایسی طاقت نہ پیدا ہو جائے، جو تلوار کی طاقت کے برعکس اور اس سے برتر ہے۔ اب تک انتقام آپ لوگوں کے ہاں ایک مقدس فرض سمجھا جاتا ہے۔ اگر آپ کی کسی شخص سے خون کی عداوت ہو تو ہمیشہ باقی رہتی ہے اور باپ سے بیٹے کو منتقل ہوتی چلی جاتی ہے۔ عدم تشدد کا اصول یہ ہے کہ اگر کوئی شخص آپ کو اپنا سمجھتا ہو تو آپ کو یہ حق نہیں کہ آپ اسے اپنا دشمن سمجھیں ظاہر ہے کہ انتقام کا یہاں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

انھوں نے اپنے مخاطبوں سے پوچھا "جنرل ڈائر سے زیادہ ظالم اور خوں خوار اور کون ہو سکتا ہے؟ لیکن کانگریس نے جو کمیٹی جلیانوالا باغ کے معاملے کی تحقیق کے لئے مقرر کی تھی وہ میرے مشورے سے، یہ مطالبہ کرنے سے باز رہی کہ ڈائر پر مقدمہ چلایا جائے۔ میرے دل میں اس کی طرف سے مخالفت کا شائبہ کبھی نہ تھا۔ میں تو

چاہتا تھا کہ اس سے مل کر اس کے دل پہ اثر ڈالوں مگر یہ آرزو پوری نہیں ہوئی - اس کے بعد انھوں نے ان لوگوں کو بتایا کہ خدائی خدمت گاروں کا عدم تشدد اپنے آپ کو کس طرح خلق خدا کی خدمت میں ظاہر کر سکتا ہے اور اس کے لئے کس قسم کی تربیت کی ضرورت ہے۔

جب یہ گفتگو ختم ہوئی تو ایک خدائی خدمت گار نے جو گاندھی جی کی تقریر بڑے غور سے سن رہا تھا یہ مشکل سوال پوچھا "آپ ہم سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ ہم ہندوؤں کی چھاپہ مارنے والوں سے حفاظت کریں مگر اسی کے ساتھ آپ ہم سے یہ کہتے ہیں کہ ہم اپنے ہتھیاروں سے چوروں اور ڈاکوؤں کے مقابلے میں بھی کام نہیں لے سکتے یہ دونوں باتیں ساتھ ساتھ کیسے ہو سکتی ہیں ؟" گاندھی جی نے جواب دیا یہ "تناقض محض ظاہری ہے۔ اگر آپ نے سچ مچ عدم تشدد کی روح کو جذب کر لیا ہے تو آپ چھاپہ مارنے والوں کے حملے کا انتظار نہیں کریں گے بلکہ ان کے علاقے میں جا کر انھیں ڈھونڈھ نکالیں گے اور ایسی کوشش کریں گے کہ ان کے حملے رک جائیں۔ اگر اس پر بھی وہ چھاپہ ماریں تو آپ ان کا سامنا کریں گے اور ان سے یہ کہیں گے کہ وہ آپ کے ہندو ہمسایوں کے مال کو اس وقت تک ہاتھ نہیں لگا سکتے جب تک آپ کی لاشوں پر سے نہ گذریں۔ اگر سینکڑوں خدائی خدمت گار اپنے ہندو ہمسایوں کی حفاظت پہ

تیار ہوں تو چھاپہ مارنے والوں کو اس میں بہت تامل ہوگا کہ ان سب بے گناہ خدائی خدمت گاروں کو جو عدم تشدد کے ذریعے ان کا مقابلہ کر رہے ہیں، بغیر کسی اشتعال کے قتل کر دیں۔ آپ کو شیخ عبدالقادر جیلانی کا اور ان چالیس اشرفیوں کا قصہ معلوم ہے جو ان کی ماں نے انھیں بغداد جاتے وقت دی تھیں۔ راستے میں قافلے پر ڈاکوؤں نے حملہ کیا اور حضرت عبدالقادر کے ساتھیوں کے پاس جو کچھ تھا لوٹ لیا۔ خود عبدالقادر اتفاق سے بچ گئے تھے مگر آپ نے خود چھاپہ مارا۔ مارنے والوں کو پکار کر کہا کہ میری ماں نے چالیس اشرفیاں میرے کرتے کے استر میں سی دی ہیں، روایت یہ ہے کہ ڈاکوؤں پر اس لڑکے کے (حضرت شیخ اس زمانے میں بہت کم سن تھے) بھولے پن کا اس قدر اثر ہوا کہ انھوں نے نہ صرف اس کو لوٹنے چھوڑ دیا بلکہ اس کے ساتھیوں کا بھی سارا مال واپس کر دیا !!

احمدی بانڈہ میں گاندھی جی نے خدائی خدمتگاروں کو یہ سمجھایا کہ عدم تشدد کے پروگرام میں سول نافرمانی کی کیا حیثیت ہے اور وہ عملی پروگرام سے کیا تعلق رکھتی ہے۔ لیکن چونکہ گاندھی جی اس تقریر کو اپنے اخبار میں شائع کر چکے ہیں۔ اس لئے یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں۔

پشاور کے بار ایسوسی ایشن نے گاندھی جی کی موجودگی

سے فائدہ اٹھاکر وزیر اعظم کے مکان پر ان کی خدمت میں ایک ایڈریس
پیش کیا اس میں انھوں نے بڑے فخر سے یہ دعوےٰ کیا کہ گاندھی
جی ان کی برادری کے رکن ہیں اور ضمناً اپنے پیشے کے بعض ممتاز
لوگوں کی سیاسی خدمات کا ذکر کر کے اپنی تعریف بھی کر دی۔ گاندھی
جی نے ایک مزاحیہ تقریر میں اس عزت کا شکریہ ادا کیا جو انھیں بخشی
گئی تھی اور کہا کہ میں اس رتبے کا مستحق نہیں ہوں۔ اس لئے کہ ایک
تو لندن کی اس قانونی انجمن نے جس سے میں نے سند لی تھی مجھے
اپنی رکنیت سے خارج کر دیا ہے، دوسرے میں نے جو کچھ قانون پڑھا
تھا وہ سب مدت ہوئی بھلا دیا۔ پچھلے زمانے میں میرا شغل عدالتوں
میں قانون کی تشریح کرنے سے زیادہ قوانین کی خلاف ورزی
رہا ہے۔ ایک اور وجہ جو سب سے اہم ہے یہ کہ میں وکیلوں اور
ڈاکٹروں کے بارے میں کچھ انوکھے خیالات رکھتا ہوں جو میں نے
اپنی کتاب انڈین ہوم رول میں ظاہر کئے ہیں۔ میرے خیال میں سچا
وکیل وہ ہے جو حق اور خدمت کو مقدم سمجھتا ہے اور معاوضے کو مؤخر
جانتا ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ آپ لوگوں نے بھی اس نصب العین
کو اختیار کیا ہے یا نہیں۔ لیکن اگر آپ یہ حلف اٹھائیں کہ آپ اپنی قانونی
قابلیت کو ایثار کے جذبے کے ماتحت خدمت میں صرف کریں گے
تو میں سب سے پہلے آپ کے سامنے ہدیہ عقیدت پیش کروں
گا۔

پشاور سے روانہ ہونے سے پہلے گاندھی جی صوبہ سرحد کے وزیروں سے ملے اور وعدے پورے کرنے کے لئے جو انھوں نے مختلف اوقات پر کیئے تھے، ان کے ساتھ بعض سیاسی اور انتظامی معاملات پر گفتگو کی جن کے بارے میں پبلک میں بڑی بحثیں ہو رہی تھیں۔ اس گفتگو کے بعض معاملات صاف ہو گئے اور وزارت نے گاندھی جی کے ملاحظات کی روشنی میں بعض امور کا قطعی فیصلہ کر دیا۔

جنوبی ہند کے ایک اعلیٰ انگریز عہدے دار پشاور میں گاندھی جی سے ملنے کے لئے آئے اور انھوں نے اُن سے ایک مشکل سوال پوچھا "جنوب سے شمال کی طرف آتے ہوئے مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بالکل دوسری قسم کے انسان رہتے ہیں۔ یہاں کے لوگوں میں اور جنوب کے لوگوں میں کوئی چیز مشترک معلوم ہی نہیں ہوتی کیا یہ دونوں کبھی مل سکتے ہیں؟" گاندھی جی نے جواب دیا کہ ظاہر میں یہ اختلاف ضرور ہے لیکن عدم تشدد وہ سنہری پل ہے جو تند خو اور جنگ جو پٹھانوں کو جنوبی ہند کے ذہین اور حلیم لوگوں سے ملاتا ہے۔ وہ خدائی خدمت گار جنھوں نے عدم تشدد کا عقیدہ اختیار کر لیا ہے اب ہندوستان کے دوسرے حصے کے لوگوں سے مختلف نہیں رہے، اگر کچھ فرق ہے تو تشدد سے پاک بہادری کے مدارج میں ہے۔ مختلف قسم کے لوگوں کے میل جول کا مسئلہ ہو

یا کوئی اور پیچیدہ سوال ہو، عدم تشدد کا نقطۂ نظر اختیار کرتے ہی ساری مشکلات غائب ہو جاتی ہیں۔

ضلع ہزارہ جو دریائے سندھ کے اس پار واقع ہے آخری ضلع تھا جس کا گاندھی جی نے دورہ کیا۔ یہ صوبہ سرحد کا انتہائی شمالی ضلع ہے اور سارے صوبے میں یہی ایک علاقہ ہے جو دریائے سندھ کے مشرق میں واقع ہے۔ یہ برطانوی علاقے کے ایک سو بیس میل لمبی ایک گاؤدم پٹی ہے جس کے مشرق میں کشمیر کا علاقہ اور مغرب میں علاقہ آزاد کی پہاڑیاں ہیں۔

اس ضلع میں داخل ہونے سے پہلے ۲ نومبر کو گاندھی جی تھوڑی دیر کے لئے بھوتی علاقہ چھچ میں گئے تھے۔ یہ علاقہ اگرچہ سیاسی اور جغرافی حیثیت سے پنجاب کا ایک حصہ ہے۔ لیکن زبان رسم ورواج اور عادات و خصائل کے لحاظ سے یہاں کے باشندے سرحد کے لوگوں سے قریبی تعلق رکھتے ہیں۔ انھوں نے یہ درخواست کی کہ ان کے علاقے کے پشتو بولنے والے لوگوں کو صوبہ سرحد کی خدائی خدمت گاروں کی تحریک میں شریک ہونے کی اجازت دی جائے۔ گاندھی جی نے ان سے کہا اس میں کوئی دشواری نہیں ہے۔ خدائی خدمت گاروں کی ایک انجمن ہے جس کا صدر مقام اتمان زئی ہے۔ ہر شخص جو اُن کے حلف نامے پر دستخط کر دے اور پشتو بول سکتا ہو اپنا نام خدائی خدمت گاروں میں لکھوا سکتا ہے۔

صرف یہ شرط ہے کہ اس کے ساتھ ساتھ کسی اور انجمن کا ممبر نہ ہو۔ اس لئے آپ لوگوں کو پورا حق ہے کہ خدائی خدمت گاروں میں داخل ہو جائیں اور اس کے لئے کسی خاص اجازت کی ضرورت نہیں ہے!"

بھوتی چلتے ہوئے گاندھی جی کی موٹر کو ایک حادثہ پیش آیا جس میں ایک بچھڑا ٹکر کر کچھ تھوڑا سا کچل گیا۔ مقامی کانگریسی لیڈروں نے جو بادشاہ خاں کے ساتھ تھے بے تامل اس حادثے کا سارا الزام اپنے مخالفوں پر یا حکومت پر رکھ دیا۔ گاندھی جی کے نزدیک کانگریسی دوستوں کے اس طرح جھٹ پٹ اپنے مخالفوں کو بغیر کافی وجوہ کے قصوروار ٹھہرانے میں تعصب اور تنگ دلی پائی جاتی تھی جو عدم تشدد کے ساتھ نہیں کھپتی تھی۔ گاندھی جی نے کہا "جب محبت کا بیج ہمارے دل میں پھوٹ آئے گا تو ہمارے فسادات سے جھگڑے اور آپس کی تو تو میں میں ایک داستان پارینہ بن جائے گی۔ جب خدائی خدمت گاروں کے دل محبت سے بھر جائیں گے تو ہمیں آزادی مل جائے گی۔ لیکن آزادی ہمیں اس وقت تک نہیں ملے گی جب تک ہماری محبت روزمرہ کے کاموں میں نہ جھلکے۔"

جب جلسہ ختم ہو گیا تو گاندھی جی نے بادشاہ خاں سے کہا "ہم کو یہ چاہئے کہ جہاں یہ حادثہ ہوا تھا وہاں کسی شخص کو بھیج کر بچھڑے کے مالک کو معاوضہ دیں اور بچھڑے کے علاج کے لئے سالوتری کے پاس لے جائیں۔ بادشاہ خاں نے کہا "بے شک" اور فوراً اس کا انتظام کر دیا۔

گاندھی جی ۱۰ نومبر کی شام کو ہری پور پہنچے اور راستے میں سکھوں کے مشہور مندر پنجہ صاحب میں گئے۔ جہاں مندر کے منتظموں کی طرف سے ان کو اور بادشاہ خان کو "سراپا" دیا گیا، ہری پور میں ویسی ہی گڑبڑ تھی جیسی ڈیرہ اسمٰعیل خان میں ہوئی تھی۔ شہر کے اندر سے گاندھی جی کا جلوس نکالا گیا حالانکہ انھوں نے اس کی ممانعت کر دی تھی اور ان سے وعدہ کر لیا گیا تھا کہ ایسا نہیں ہوگا۔ گاندھی جی کے اسباب کے پہنچنے میں ایک گھنٹے سے زیادہ لگ گیا۔ اس مجمع کی وجہ سے جس نے ان کے میزبان کے گھر کو گھیر رکھا تھا، ہم کو وہاں پہنچے چند ہی گھنٹے ہوئے تھے کہ لوگ دروازے کے اندر گھس آئے اور دوسرے دن صبح کو مقررہ وقت سے کئی گھنٹہ پہلے گاندھی جی ایبٹ آباد روانہ ہو گئے۔

چھ تاریخ کی شام کو ہری پورہ میں ایک جلسہ ہوا یہاں بھی ایک چھوٹا سا واقعہ ہوا جس کی طرف گاندھی جی نے اپنی تقریر میں اشارہ کیا۔ جلسے سے پہلے ایک مقامی ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر کا خط گاندھی جی کے پاس پہنچا جس میں نرمی سے اس بات کی شکایت کی گئی تھی کہ کانگریس کے مقامی عہدہ داروں نے اسکول کی زمین پر جلسہ کرنے کے لیے ان سے باضابطہ اجازت نہیں لی تھی۔ گاندھی جی نے اپنی تقریر میں کہا کہ مکمل اخلاق اور ضابطے کی پوری پابندی بھی اسی طرح عدم تشدد کے اجزاء ہیں جس طرح اور بڑی بڑی چیزیں جو ان کے سامنے بیان کی گئیں، سائنس داں کہتے ہیں کہ ہم لنگوٹ

کی اولاد ہیں۔ ممکن ہے کہ ایسا ہو، لیکن انسان کو خدا نے اسی لئے نہیں بنایا کہ وہ حیوانِ مطلق کی حیثیت سے زندگی بسر کرے جس نسبت سے وہ عدم تشدد اور رضاکارانہ ضبط کی عادت ڈالتا ہے اسی نسبت سے وہ حیوانوں سے ممتاز ہوتا ہے اور اس درجے پر پہنچتا ہے جو خدا نے اس کے لئے مقرر کیا ہے۔ عدم تشدد نے جو ذمہ داریاں ہم پر عاید کی ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ہم کمزور سے کمزور آدمی یہاں تک کہ بچے کے حقوق کا بھی احترام کریں۔"

سوشلسٹ خیال کی ایک چھوٹی سی جماعت نے ایک چھوٹا سا ہنگامہ برپا کر دیا انھوں نے بادشاہ خاں کو ایک ایڈریس دیا جو وہ گاندھی جی کے سامنے پیش کرنا چاہتے تھے لیکن چونکہ جلسہ شروع ہو چکا تھا اس لئے انھیں اجازت نہیں دی گئی۔ اس پر وہ ناشائستہ نعرے لگاتے ہوئے جلسے سے چلے گئے۔ گاندھی جی نے اس واقعہ سے فائدہ اُٹھا کر اس بات پر زور دیا کہ عدم تشدد میں تحمل بہت ضروری ہے۔ ہمیں گالیوں کا جواب تحمل سے دینا چاہیے۔ انسانی فطرت اس طرح کی واقع ہوئی ہے کہ اگر ہم غصے یا گالی کا بالکل نوٹس نہ لیں تو دوسرا شخص جلد تھک کر خاموش ہو جانے گا۔ ہمیں ان لوگوں کی طرف سے جنھوں نے گڑبڑ مچائی تھی دل میں ناراضگی نہیں رکھنی چاہیے انھوں نے بلا ارادہ ہمیں تحمل کا ایک قابلِ قدر سبق دیا، ستیہ گرہی ہمیشہ دشمن کو امکانی دوست سمجھتا ہے۔ عدم تشدد کے نقطۂ

صدی کے تجربے میں میں نے ایک مثال بھی ایسی نہیں دیکھی کہ کامل عدم تشدد کے مقابلے میں عداوت زیادہ دیر تک باقی رہ سکی ہو۔"

۳۱ر نومبر ۱۹۳۶ء

تیرھواں باب

عدم تشدد کی وضاحت

سرحد پار کے اضلاع پشاور، مردان، کوہاٹ، بنوں اور ڈیرہ اسمٰعیل خاں کے برخلاف ہزارہ کے ضلع میں نہ تو آبادی میں پٹھانوں کا غالب حصہ ہے اور نہ یہاں کے پٹھان اتنے اجڈ ہیں جتنے دوسرے اضلاع کے۔ یہ ضلع مانسہرہ اور ایبٹ آباد کے پہاڑی خطوں اور ہری پور کی سیراب تحصیل پر مشتمل ہے۔ یہ کم و بیش قدیم ٹیکسلا کا علاقہ ہے جو سندھ کے اس پار ایک خوش حال ہندو ریاست تھی اور جس کے دارالسلطنت ٹیکسلا میں وہ مشہور و معروف یونیورسٹی تھی جہاں نہ صرف ہندوستان کے دور دراز مقامات سے بلکہ وسط ایشیا میں صحرائے گوبی کے آگے کے ملکوں تک سے بھی طلبار اُمڈے چلے آتے تھے۔ گاندھی جی کے پروگرام میں یہ بھی شامل تھا کہ تینوں تحصیلوں کے صدر مقامات میں جائیں۔ ۷ر نومبر کی صبح کو وہ ہری پور سے مقررہ وقت سے کئی گھنٹہ پہلے روانہ ہو کر ایبٹ آباد

میں اپنے میزبان رائے بہادر پرمانند کے یہاں اچانک پہنچے۔ ایبٹ آباد سطح سمندر سے چار ہزار ایک سو دو فٹ بلند ہے۔ اس کے شمال میں وادی کگن کے خوش نما مناظر ہیں اور مانسہرہ کی طرف برف پوش پہاڑ کی چوٹیوں کا سلسلہ ہے۔ ایبٹ آباد بڑی دلچسپ جگہ ہے لیکن اس کے ساتھ ماضی کی ناخوش گوار یادیں وابستہ ہیں۔ ہندوستان میں بہت کم مقامات ہوں گے جنھوں نے خلافت کے زمانے میں عدم تشدد کے پہلے سبق کی اتنی بھاری قیمت ادا کی ہو جتنی ایبٹ آباد نے کی تھی۔ آج بھی اگر کوئی شخص ایک بار اس شہر سے گذر جائے تو اس پر یہ تکلیف دہ حقیقت منکشف ہو جائے گی کہ دوسرے پہاڑی مقامات کی طرح یہاں بھی فوج والوں کے سوا عام شہری ذلت کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ سب اچھی جگہیں فوج کے لئے اور حکمران طبقے کے لئے محفوظ ہیں۔ مجھے یہ بتایا گیا ہے کہ ایک معزز ہندوستانی کو اپنے ذاتی بنگلے میں رہنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ اس لئے اس سے ملے ہوئے دونوں بنگلوں میں جو اسی کی ملکیت تھے صاحب لوگ کرائے پر رہتے تھے، اور ان کو یہ گوارا نہ تھا کہ کوئی "نیٹو" اُن کے بیچ میں رہے۔

فقیر بادشاہ خاں کا دل ہمیشہ غریبوں میں پڑا رہتا ہے۔ یہ بات ہم پر ایک روز صاف ظاہر ہو گئی، جب وہ صبح تڑکے ہم میں سے چند نوجوانوں کو پہاڑ پر چڑھنے کے لئے لے گئے۔ انھوں نے کہا

"چلو پہاڑ کی چوٹی سے سورج نکلنا دیکھیں اور ہمیں زبردستی صبح کی سخت سردی میں گھسیٹتے ہوئے باہر لے گئے۔ پہاڑ کی اطراف کا منظر جو چاروں کی تازگی بخش اور شاندار صبح کو دکھائی دیا ایک جان فزا منظر تھا۔ وادی کی دھندلی گہرائی سے لے کر پہاڑوں کی چیڑ کی درختوں سے ڈھکی ہوئی سر بفلک چوٹیوں تک، کھیتوں کی سیڑھیاں اس کی شہادت دے رہی تھیں کہ آخر کار عدم تشدد لاکھوں انسانوں کے صبر، محنت اور اتحادِ عمل کی شکل میں اس جنگ میں فتح حاصل کرتا ہے جو ان پہاڑیوں میں قدرت کی تہی دستی سے ہمیشہ سے ہوتی ہے۔ بادشاہ خاں نے ہم کو لے جا کر ان کھیتوں میں سے ایک کھیت دکھایا تاکہ ہمیں یہ اندازہ ہو کہ پہاڑوں کے پہلو کی بنجر پتھریلی زمین کو کاشت کے قابل بنانے میں کس بلا کی محنت کرنی پڑتی ہے! یہ کشمکش نہایت دقت سے آہستہ آہستہ قدم بہ قدم آگے بڑھتی ہے۔ کھیت کی ایک تنگ پٹی سے چٹان کو صرف ہاتھ کی قوت سے ہٹانے میں سالہا سال صرف ہو جاتے ہیں اور پھر جیسے ہی زمین سے کچھ پیداوار ہونے لگتی ہے حکومت فوراً آکر لگان کا مطالبہ کرتی ہے۔" بادشاہ خاں جوش میں چلا اُٹھے "یہ بڑی بے انصافی اور سنگ دلی ہے۔ اگر میرے اختیار میں ہو تو میں اس قسم کے کام کے لئے جس میں زمین کو قدرت سے چھیننا پڑتا ہے، امداد دیتا بجائے اس کے کہ اس پر محصول لگاؤں۔ یہ ایک شرمناک لوٹ ہے۔"

کھیت کے بیچ میں ایک جھونپڑی کھڑی تھی۔ بادشاہ خاں نے اصرار کیا کہ ڈاکٹر سوشیلا نائر جو ہمارے ساتھ تھیں اس جھونپڑی میں رہنے والے کسانوں کے خاندان سے ملیں اور معلوم کریں کہ ان کو کسی قسم کی مدد کی ضرورت تو نہیں ہے اور جب انھوں نے تھوڑی دیر بعد واپس آکر یہ بتایا کہ انھوں نے اس خاندان کے ایک مریض کو جسے کوئی چھوٹی موٹی بیماری تھی ایک سہل سا نسخہ بتا دیا تھا تو بادشاہ خاں بہت خوش ہوئے۔ دورے کے زمانے میں انھوں نے بارہا گاندھی جی سے کہا تھا "مہاتما جی مجھے سیاست سے نفرت ہے یہ ایک بھول بھلیاں ہے جس میں آدمی بے کار چکر کھاتا رہتا ہے میں چاہتا ہوں کہ اس سے بھاگ کر غریب سے غریب لوگوں کے گھروں پر جاؤں اور ان کی خدمت کروں۔" واپسی میں ہم نے دفعتاً دیکھا کہ وہ غائب ہیں۔ معلوم ہوا کہ ان کو اپنی پسند کا ایک کام مل گیا تھا۔ ایک پٹھان لڑکا ایک گدھے پر پتھر لادے ہوئے جا رہا تھا گدھے نے ٹھوکر کھائی اور بوجھ اس کی پیٹھ پر سے گر گیا۔ یہ دیکھ کر کہ لڑکے کو پتھر لادنے میں بڑی دقت ہو رہی ہے۔ بادشاہ خاں اس کی مدد کے لیے رک گئے۔ انھوں نے دوسرے ساتھیوں کو بھی مدد کرنے کے لیے بلا لیا اور جب اس کام سے فارغ ہو کر انھوں نے پہاڑی سے اترنا شروع کیا تو ان کے دل میں اس بات کی تسلی تھی کہ انھوں نے دن کا آغاز اس طرح کیا جیسا ایک خدائی خدمت گار کو

زیب دیتا ہے۔

ایبٹ آباد کے قیام میں جتنے اہم کام تھے وہ سب دوسرے دن کے پروگرام میں جمع ہو گئے تھے۔ مانسہرہ میں آٹھ تاریخ کو ایک جلسہ تھا جس میں گاندھی جی کی خدمت میں ایک ایڈریس قصبے کے باشندوں کی طرف سے اور ایک وہاں کی کسان کمیٹی کی طرف سے پیش کیا گیا تھا آخر الذکر نے گاندھی جی کو اس طرف توجہ دلائی کہ مانسہرہ تحصیل کے بعض حصوں میں نظام مال گذاری کے بعض تکلیف دہ دقیانوسی طریقے رائج ہیں اور ان کی منسوخی کی درخواست کی۔ مثلاً موروثی کاشتکاروں کو (۱) روپے میں چار آنے سے لے کر بارہ آنے تک لگان کے علاوہ مالکانہ کے نام سے زمیندار کو دینا پڑتا ہے۔ (۲) سال میں کچھ دن بغیر کسی اُجرت کے بیگار کرنی پڑتی ہے (لیکن بیگاریوں کی تعداد کھیت کے رقبے کے لحاظ سے نہیں ہے بلکہ اس پر موقوف ہے کہ وہ کتنے آدمیوں میں تقسیم ہوا ہے۔ مثلاً فرض کیجئے کہ چالیس کنال کا ایک کھیت ہے اور اس پر پانچ بیگاری دینے پڑتے ہیں۔ اب اگر زمیندار کے مرنے کے بعد اس کے پانچ بیٹوں میں تقسیم ہو جائے تو ان میں سے ہر ایک کسان سے پانچ بیگاری مانگے گا۔) (۳) زمین ساری کی ساری ورثے میں لڑکوں کو ملتی ہے۔ لڑکیاں بالکل محروم رکھی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ ایڈریس میں کئی ابواب اور ناجائز رقموں

اور ان دھوکوں اور زیادتیوں کا ذکر تھا جو زمیندار کی طرف سے کاشتکاروں کے ساتھ ہوتے ہیں۔ ان بیانات کے متعلق اس کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے کہ اگر ان کا ایک حصہ بھی صحیح ہے تو یہ ایک شرمناک ظلم ہے جسے فوراً ختم کر دینا چاہیے خصوصاً ایسے زمانے میں جب حکومت کانگریسی وزرار کے ہاتھ میں ہے۔

مانسہرہ کے عام باشندوں کی طرف سے جو ایڈریس دیا گیا وہ ان تمام ایڈریسوں میں جو سارے دورے میں گاندھی جی کی خدمت میں پیش کئے گئے سب سے زیادہ قابل لحاظ ہے گاندھی جی نے اس کے جواب میں لوگوں کو یقین دلایا کہ آپ نے عدم تشدد کے میدان میں جو کچھ کر دکھایا ہے، اس کی میں دل سے قدر کرتا ہوں لیکن میں اس پرانی مثل کا قائل ہوں کہ جو دیتا ہے اس سے اور زیادہ مانگا جاتا ہے۔ میں آپ کو جتلائے دیتا ہوں کہ میں اس وقت تک چین نہ لوں گا جب تک آپ اپنے عدم تشدد کے ذریعے نہ صرف اپنی بلکہ ہندوستان کی آزادی نہ حاصل کر لیں۔ میں آپ کے صوبے میں دوبارہ آیا ہوں تاکہ آپ سے اور اچھی طرح واقف ہو جاؤں اور یہ دیکھ لوں کہ آپ کے ہاں عدم تشدد کس طرح برتا جاتا ہے اور میرا ارادہ تیسری بار آنے کا بھی ہے اور اس وقت میں ان مسائل کو جو بیچ میں چھوٹ گئے ہیں پھر سے اٹھاؤں گا۔

اس سے پہلے خدائی خدمت گاروں کے افسروں کو مخاطب

کرتے ہوئے گاندھی جی نے کہا :۔ آپ لوگوں نے مجھے ابھی بتایا ہے کہ آپ نے ہمیشہ کے لئے تشدد کی جگہ عدم تشدد اختیار کر لیا ہے۔ کل اس بارے میں بات چیت کرتے ہوئے میرے منہ سے نکل گیا کہ ہمیں عدم تشدد کی جگہ "محبت" لفظ استعمال کرنا چاہیے یعنی آج تک جو کام تشدد سے کیا جاتا ہے وہ ہمیں اب محبت سے کرنا ہے۔ اس کے یہ معنی ہو جاتے ہیں کہ جسے ہم دشمن سمجھتے تھے اس کے متعلق دشمنی کا خیال بالکل دل سے نکل جانا چاہیئے۔ مگر صرف اتنا ہی کافی نہیں۔ سوال یہ ہے کہ اس کی جگہ کون سی چیز لے گی۔ آج دنیا میں لاکھوں آدمیوں کے پاس لاٹھی نہیں۔ مگر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ عدم تشدد کے پابند ہیں۔ عدم تشدد تو تب وجود میں آتا ہے جب ہم محبت میں وہ طاقت پیدا کر لیں جو لاٹھی میں تھی۔ یا تو ہماری سب طاقت زائل ہو جاتی ہے اور ہم کسی کام کے نہیں رہتے یا ڈرپوک بن جاتے ہیں اور اس طرح اپنی انسانیت ہی کھو بیٹھتے ہیں۔

آج کل یہ کہنے کا رواج ہو گیا ہے کہ دنیا کا کاروبار تو تھپڑ کا جواب تھپڑ سے دئے بغیر نہیں چلتا۔ میری رائے میں یہ بات ٹھیک نہیں ایک بچہ اپنے تھپڑ کا جواب تھپڑ سے نہیں دیتا۔ وہ اپنے باپ کا حکم مانتا ہے۔ مگر اس کے تھپڑ کے ڈر سے نہیں بلکہ اس لئے کہ وہ محسوس کرتا ہے کہ تھپڑ مارنے پر بھی اسے اس کی محبت نے مجبور کیا ہے اور وہ اس محبت کو ٹھیس لگانا نہیں چاہتا

میرا یہ دعویٰ ہے کہ دنیا کا کاروبار اسی طاقت کے سہارے پر چلتا ہے اور چلایا جا سکتا ہے۔ دنیا کو خاندان کا ایک وسیع تر نمونہ سمجھنا چاہیئے۔ جو قانون خاندان پر عائد ہوتا ہے وہ دنیا پر بھی ہوتا ہے۔ باقی یہ تو ہم ہی نے دنیا کو باہم مخالف گروہوں میں بانٹ کر دوست، دشمن کی تمیز پیدا کر دی ہے۔ مگر اس کے باوجود دنیا چلتی تو محبت کی طاقت سے ہی ہے۔ مجھ سے کہا گیا ہے کہ یہاں کے خدائی خدمت گار محض نام ہی نام کے ہیں۔ اُن کا کچھ بھروسہ نہیں۔ آج سُرخ پوش بن جاتے ہیں اور کل دوسرا رنگ اختیار کر لیتے ہیں۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو میرا آپ سے کچھ کہنا بیکار ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ یہ الزام جھوٹا ہوگا۔ اگر آپ میں سچائی نہیں جو کچھ آپ کرتے ہیں وہ سچے دل سے نہیں کرتے تو آپ کی سرخ وردی کس کام کی۔ میں جانتا ہوں کہ بادشاہ خاں کو اس بات نے کافی پریشان کر رکھا ہے کہ آپ کی جماعت میں کئی نالائق اور مطلبی آدمی گھس آئے ہیں مجھے بھی اس سے پریشانی ہوتی ہے۔ میں بادشاہ خاں کی رائے سے بالکل متفق ہوں کہ اگر ہمارے آدمی سچے نہیں ہیں تو صرف تعداد بڑھانے سے ہماری طاقت بجائے بڑھنے کے گھٹے گی۔ خدائی خدمت گاروں کی تحریک کا کام ہندوستان بھر میں اور اس کے باہر بھی دور دور مشہور ہو چکا ہے۔ آپ نے عدم تشدد کو جہاں تک

سمجھا ہے وہاں تک تو اس پر عمل کر لیا ہے۔ مگر اس کے اندر ابھی اور بہت کچھ ہے، اور وہ بہت بڑی چیز ہے۔ بادشاہ خاں یقین دلاتے ہیں اور میں اُسے مانتا ہوں کہ آپ عدم تشدد کا پورا پورا مطلب سمجھنے اور اس پر مکمل طور پر عمل کرنے کے لئے بے چین ہیں۔ میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ آپ کو بہت سے پہاڑ کاٹنے اور ندیاں عبور کرنی ہیں۔ عدم تشدد کا جو تعمیری پروگرام آپ کے سامنے رکھا گیا ہے۔ اس پر اگر ہم ایک بار ٹھیک طور پر عمل شروع کر دیں تو پھر آگے کا آپ کا راستہ خود بخود نکل آئے گا۔ اس سے آپ کی سچائی اور شوق کا بھی پتہ چل جائے گا۔
سہ پہر کو ایبٹ آباد واپس آ کر گاندھی جی مقامی ہریجن مندر میں گئے اور انھیں یہ سن کر خوشی ہوئی کہ کم سے کم ایبٹ آباد میں ہریجنوں پر اپنے بچوں کو مدرسے میں داخل کرانے یا کنوئیں سے پانی بھرنے وغیرہ میں کوئی روک ٹوک نہیں۔ وہ گورنمنٹ گرلز اسکول میں بھی گئے جو ان خاتون کے خلوص اور محبت کا نتیجہ ہے، جن کے گھر ہم ایبٹ آباد میں ٹھیرے تھے۔

سہ پہر کو اقلیتوں کا ایک وفد گاندھی جی کے پاس آیا تاکہ اُن مشکلوں کے بارے میں گفتگو کرے جن کا سامنا اقلیتوں کو صوبہ سرحد میں کرنا پڑتا ہے۔ سب سے زیادہ پریشانی ان کو یہ تھی کہ جب سے سرحد کا علیحدہ صوبہ بنا ہے تشدد کے جرائم

کی تعداد برابر بڑھ رہی ہے۔ اُن کی تجویز یہ تھی کہ بدامنی کے روز افزوں خطرے کو دیکھتے ہوئے ان اقلیتوں کو جو سرحدی علاقے میں آباد ہیں بلا معاوضہ ہتھیار دیئے جائیں اور ان کا استعمال سکھایا جائے تاکہ ان کو اپنی حفاظت میں آسانی ہو۔ لیکن انھوں نے اس بات کو تسلیم کیا کہ سرحد پار کی بدامنی کا مسئلہ قطعی اور مکمل طور پر صرف اسی طرح حل ہو سکتا ہے کہ اس جماعت کو جس کی اکثریت ہے اقلیت کی دستگیری کے فرض کا احساس دلایا جائے۔ گاندھی جی نے جواب میں فرمایا کہ میں آپ کے مطالبے کی تائید تو کر سکتا ہوں کہ اسلحہ کے لیے بے تکلف لائسنس تقسیم کئے جائیں لیکن حکومت سے یہ توقع کرنا بے جا ہوگا کہ وہ سرحد کے قریب رہنے والے سب لوگوں کو مفت ہتھیار بانٹے۔ اگر آپ چاہیں تو مفت میں ہتھیار بانٹنے کے لیے چندہ جمع کر سکتے ہیں، لیکن مجھے اس میں شبہہ ہے کہ بلا معاوضہ ہتھیار بانٹنے اور ان کا استعمال سکھانے سے سرحد پار کی بدامنی کا مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ اگر اس تجربے کو جو حال میں بنوں کے چھاپے میں ہوا ہے پیش نظر رکھا جائے تو اس طرح کی کارروائی محض فضول خرچی ہوگی مجھے بتایا گیا ہے کہ بنوں کے حملے کے وقت شہریوں کی طرف سے صرف ایک بندوق استعمال کی گئی حالانکہ شہر میں بندوقوں کی کمی نہ تھی اور اس ایک بندوق سے بھی چھاپہ مارنے والوں سے زیادہ پبلک کو نقصان پہنچا۔ البتہ آپ نے

اکثریت کے فرض کے متعلق جو کچھ کہا اُس سے مجھے اتفاق ہے۔ بادشاہ خاں خدائی خدمت گاروں کو اس کے لئے تیار کر رہے ہیں کہ شہریوں کو ان چھاپوں سے محفوظ رکھنے کا فرض انجام دے سکیں۔ وفد کے ارکان نے گاندھی جی سے چند اور امور کے متعلق بات چیت کی گاندھی جی نے کہا کہ مولانا ابوالکلام آزاد اور غالباً ان کے ساتھ بابو راجندر پرشاد کو ورکنگ کمیٹی نے صوبہ سرحد میں آنے کی ہدایت کی ہے۔ آپ ان سے ان چیزوں کے متعلق گفتگو کیجئے گا۔

صوبہ سرحد میں اقلیتوں کی جو حیثیت ہے یہاں اس کے متعلق چند باتیں کہنا بے جا نہ ہوگا۔ اس صوبے کی کل آبادی ۲۴،۷ لاکھ ہے جس میں سے ۲۲،۵ لاکھ مسلمان ہیں ۱،۵ لاکھ ہندو ہیں، ۴۷،۰۹ ہزار سکھ ہیں۔ ۱۶،۴ ہزار عیسائی، ۶۲ پارسی ۱۱ یہودی اور ۳ بودھ ہیں۔ فی صدی کے حساب سے مسلمانوں کی آبادی ضلع ہزارہ میں ۹۰ فی صدی سے لے کر ڈیرہ اسمٰعیل خان میں ۸۶ فی صدی تک ہے۔ لین دین اور تجارت اب تک عموماً ہندوؤں اور سکھوں کے ہاتھ میں ہے اور چونکہ پہلے وہ تعلیم میں مسلمانوں سے آگے بڑھے ہوئے تھے۔ اس لئے ملازمتوں میں بھی ان کا حصہ اپنی تعداد کے لحاظ سے بہت زیادہ ہے۔ کچھ عرصے سے انھیں مسلمانوں کے مقابلے کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اور مقابلے کی وجہ سے آپس میں مخالفت پیدا ہوگئی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے

کہ جو لوگ کامیاب ہیں انھیں اپنی کامیابی کا تاوان اور بھی زیادہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ ایک کامیاب رائے بہادر جس نے فوجی ٹھیکوں سے بہت بڑی دولت جمع کر لی ہے، قدرتی طور پر سرحد پار کے وزیری اور محسود قبائل کی لالچ کو بھڑکاتا ہے اور یہ لوگ اپنی غارت گری کے جذبے کو جائز ثابت کرنے کے لئے رائے بہادر پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ وہ اس فوجی مشین کو تیار کرتے ہیں یا بالواسطہ مدد دیتا ہے جو ان کو کچلنے کے لئے استعمال کی جاتی ہے۔ مسلمان سیاسی کارکنوں کو خواہ وہ کانگریسی ہوں یا غیر کانگریسی اس سے یہ شکایت ہے کہ اگرچہ اس نے اپنی ساری دولت اسی صوبے میں پیدا کی ہے اور اقلیت کے ایک رکن کی حیثیت سے اپنی حفاظت کا اور خاص مراعات کا مطالبہ کرتا ہے۔ لیکن اس کو صرف حکومت کی نظرِ عنایت حاصل کرنے کی فکر رہتی ہے۔ وہ کبھی صوبے کی ترقی کے کسی کام میں روپے سے یا ہاتھ پاؤں سے مدد نہیں کرتا۔ اقلیت میں ذہانت اور قابلیت کے ساتھ ساتھ ایثار اور خدمت کی روح نہ ہو تو یہ اس کے پاؤں میں زنجیر ہو کر رہ جائیں گی۔ اگر وہ اپنی ذہانت اور قابلیت کو اس صوبے کی خدمت میں صرف کریں جس کو انھوں نے اپنا وطن بنایا ہے تو اکثریت بہت جلد انھیں محبت اور قدر کی نظر سے دیکھنے لگے گی۔ لیکن اگر وہ ان چیزوں کو جاہ و منصب حاصل کرنے کا ذریعہ بنائیں گے تو لوگوں کے دل میں مخالفت کا

جذبہ بھڑکانے کے سوا کوئی نتیجہ نہ ہوگا۔

ایک جگہ یہ شکایت کی گئی کہ ہندو اور سکھ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کو چھونے سے ناپاک ہو جاتے ہیں۔ اگر یہ صحیح ہے تو اسے مذہب کے حقیقی جذبے کے مسخ ہو جانے کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ دوسروں کے مذہب کا اسی طرح احترام کرنا جیسے ہم اپنے مذہب کا کرتے ہیں، ایک ایسا فرض ہے جس پر ہر وقت اور ہر جگہ عمل ہوتا ہے۔ مگر جہاں ایک چھوٹی سی اقلیت دوسرے مذہب والوں کی بہت بڑی اکثریت کے بیچ میں رہتی ہو، وہاں تو اس کے بغیر چارہ ہی نہیں۔ لیکن اگر اقلیت مجبور ہو کر ایسا کرتی ہے تو اکثریت کی یہ شان ہونی چاہیئے کہ وہ دل سے اقلیتوں کے جذبات اور عقائد کا احترام کرے۔

جس چیز سے گاندھی جی کو دلی خوشی ہوئی وہ یہ تھی کہ سارے دورے میں موجودہ وزارت پر سخت سے سخت نکتہ چینی کرنے والوں نے بھی خان عبدالغفار خاں یا اُن کے بھائیوں پر کبھی تعصب کا الزام نہیں لگایا اور ان کے خلوص میں شبہہ نہیں کیا۔

"آئین ساز مجلس کے اندر بھی اور باہر بھی ایک متفقہ پروگرام کی بنیاد پر جو نئی ریاست کی سلامتی استحکام اور فلاح و بہبود کے لئے بنایا جائے۔"

ایک تجویز یہ بھی تھی کہ جب تک اس قسم کا کوئی سمجھوتہ نہ ہو اس پارٹی کی پالیسی یہ ہوگی کہ پاکستان کی موجودہ حکومت کا ساتھ دے۔

بہت جلد یہ بات ظاہر ہوگئی کہ پاکستان کی حکومت نئی عوامی پارٹی کے قیام کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتی۔ صوبہ سرحد کے وزیر اعظم خان عبدالقیوم خان نے سرخ پوشوں کے لیڈر خان عبدالغفار خان کو ایک ایسا "دشمن قرار دیا جو پاکستان کی حکومت کی جڑ کھودنے کی پوری کوشش کر رہا ہے۔" اور اس حلف وفاداری کے متعلق جو انھوں نے اور ان کی پارٹی نے اُٹھایا تھا یہ کہا کہ "یہ ایک ڈھونگ سے زیادہ نہیں۔" اسی کے ساتھ انھوں نے یہ معنی خیز جملہ کہا "جب کبھی ہم اپنے امن پسند شہریوں کی بھلائی کے لئے مناسب سمجھیں گے۔ ضروری تدبیریں اختیار کریں گے۔"

بادشاہ خان پر انتشار پیدا کرنے کا الزام لگایا گیا مگر ان کا کہنا یہ تھا کہ میں بہت سوچتا ہوں مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ پاکستان کے ارباب اختیار کدھر جا رہے ہیں۔ وہ اسلام کا نام لے کر ریاست کے قوت اور استحکام کی اپیل کرتے ہیں لیکن اسی کے

ساتھ وہ ان لوگوں سے جو پاکستان کی قوت اور خوش حالی کے بنیادی مسئلے میں اُن سے متفق ہیں لیکن اس کے طریقے کے بارے میں ایمان داری کے ساتھ ان سے اختلاف رکھتے ہیں۔ تنگ دلی اور تنگ نظری سے پیش آتے ہیں۔"

ہمارے ہمسایہ ڈومینین ہندوستان میں تقسیم سے پہلے ہندو مہاسبھا اور ڈاکٹر امبیدکر کا اچھوتوں کا فیڈریشن برابر ہر قدم پر کانگریس کی مخالفت کرتا تھا۔ لیکن جیسے ہی ہندوستان آزاد ہوا سب مخالف پارٹیاں مل گئیں۔ چنانچہ ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی اور امبیدکر اب پنڈت نہرو اور سردار پٹیل کے رفیق کار ہیں۔ اگرچہ انھوں نے اپنی جماعتوں کو کانگریس پارٹی میں ضم نہیں کیا ہے۔ بخلاف اس کے جو کچھ پاکستان میں ہو رہا ہے وہ بہت افسوسناک ہے اور اگر یہی صورت حال رہی تو نہ صرف مسلم لیگ کے لیڈروں کو بلکہ خود قوم کو اس کا نتیجہ بھگتنا پڑے گا۔ میں نے بارہا ان بیانات میں جو اخباروں کو دئے جو ان تقریروں میں جو مجمع عام میں کیں پاکستان کی وفاداری کا اظہار کیا ہے لیکن اس کے باوجود مسلمانوں میں باہم تفریق کی جاتی ہے اور میری پارٹی کے لوگوں کے ساتھ مخالفت بلکہ دشمنی کا برتاؤ ہو رہا ہے۔ میں نے ان سے صاف صاف کہہ دیا: "ہم آپ کے نظم ونسق میں رکاوٹ نہیں ڈالتے۔ ہم کو حکومت کی ہوس نہیں۔ وزارت آپ کو

مبارک ہو۔ ہم تو صرف اس کی اجازت چاہتے ہیں کہ اپنے تعمیری طریقے سے اپنے بھائیوں کی خدمت کرسکیں۔ مگر اس پر بھی وہ ہمارا پیچھا نہیں چھوڑتے۔"

.... بادشاہ خاں صوبہ سرحد میں واپس آئے تاکہ نئی جمعیتہ العوام کا پروگرام اپنی قوم کے سامنے پیش کریں۔ انھوں نے ضلع مردان میں ایک بہت بڑے جلسے کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کہا "میں نے پاکستان کی آئین ساز اسمبلی کا تماشا دیکھ لیا۔ پاکستان کے لیڈروں میں اور پرانے انگریز حکام میں کوئی مطلق فرق نہیں ہے۔ اس حکومت کی حمایت میں جو دلیل بظاہر سب سے زیادہ معقول معلوم ہوتی ہے اور عموماً پیش کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ نئی ریاست ابھی ایک نوزائیدہ بچہ ہے۔ میں ان سے یہ کہتا ہوں کہ ہندوستان کو دیکھیے جس کے لیڈروں نے سخت طوفان کے باوجود ریاست کی کشتی کو کنارے تک پہنچا دیا ہے۔ انھوں نے اپنا نیا آئین بنا لیا ہے۔ درآں حالیکہ پاکستان میں ابھی تک کچھ بھی نہیں ہوا ہے۔"

اس سے ہم صرف یہی نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ پاکستان کے موجودہ لیڈر جمہوری نظام سے ڈرتے ہیں۔ یہ لیڈر محض اپنے اپنے فائدے کی فکر ہے۔ پاکستان کو اپنی ذاتی جاگیر سمجھتے ہیں، افسوس کی بات ہے کہ یہ سب مہاجرین ہیں اور پاکستان کے

اصلی باشندے نہیں ہیں۔

"میں اس موقع پر تمھیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اسلامی یا قرآنی قانون جس کے لیے تم اتنے دن سے چلا رہے ہو، اور جس کی خاطر تم نے اور تمہارے عزیزوں نے اپنی جانیں قربان کی ہیں، پاکستان میں کبھی نافذ نہیں ہوں گے۔"

انھوں نے اپنی تقریر کو ان پر زور الفاظ پر ختم کیا "میرے افغان بھائیو! میں تمھیں یہ جتانا چاہتا ہوں کہ تم پاکستان کی ریاست میں حصہ دار ہو، اس کا چوتھائی حصہ تمھارا حق ہے۔ اب یہ تمھارا کام ہے کہ تم مل کر اٹھ کھڑے ہو، اور یہ عہد کرو کہ اپنا حق لے کر رہو گے۔ تم متحد ہو جاؤ اور مضبوط ارادے سے کام لے کر ان ریت کی دیواروں کو گرا دو جو پاکستان کے لیڈروں نے تمھارے گرد کھڑی کر دی ہیں۔ ہم موجودہ صورتِ حال کو اب برداشت نہیں کر سکتے۔ اپنی کمریں کس لو اور اپنی منزل کی طرف بڑھے چلو۔ تمھاری منزل اُن پٹھانوں کی آزادی ہے۔ جنھوں نے بڑی بڑی قربانیاں دی ہیں اور بڑی بڑی مصیبتیں اُٹھائی ہیں۔ ہم اس وقت تک چین نہیں لیں گے جب تک پٹھانستان یعنی پٹھانوں کی حکومت پٹھانوں کے ذریعے سے اور پٹھانوں کے لیے قائم نہ کر لیں۔"

تین دن بعد وہ گرفتار کر لیے گئے۔ اُن کے ساتھ اُن کے بیٹے عبدالولی خاں اور دو اور سرخ پوش لیڈر بھی پکڑ لیے گئے۔

بندہ داؤ شاہ کے چھوٹے سے کچے ڈاک بنگلے میں جو بنوں کی بڑی سڑک پر واقع ہے۔ اُن کے مقدمے کی سرسری تحقیقات ہوئی۔ اُن پر "بغاوت" کا اور "پاکستان کے دشمن فقیر ایپی کے ساتھ تعاون کا ارادہ رکھنے" کا الزام لگایا گیا۔ کوہاٹ کے ڈپٹی کمشنر نے جس کے سامنے مقدمہ پیش ہوا تھا اُن سے کہا کہ اپنی صفائی پیش کریں۔ انھوں نے ارتکابِ جرم سے انکار کیا۔ مگر اس کے سوا اور کوئی صفائی پیش نہیں کی۔ اس پر مجسٹریٹ نے پوچھا کہ کیا آپ صوبہ سرحد کے ضابطہ فوجداری دفعہ ۴۰ کے مطابق تین سال کے لئے نیک چلنی کا مچلکہ دینے پر تیار ہیں۔ بادشاہ خان نے جواب دیا کہ "میں نے ایسے مچلکے نہ کبھی دئے ہیں اور نہ اب دوں گا۔" چنانچہ انھیں تین سال کی قیدِ بامشقت جو اس جرم کی کم سے کم سزا ہے دی گئی۔

بادشاہ خان کی گرفتاری کے فوراً بعد صوبہ سرحد کی حکومت نے اپنے اس اقدام کی توجیہہ کے لئے ایک کمیونکے شائع کیا جس میں کہا گیا کہ باوجود اس کے کہ ہندوستان کی تقسیم کانگریس اور مسلم لیگ کی باہمی رضامندی سے ہوئی، عبدالغفار خاں "پاکستان کے قیام کے قطعاً مخالف ہیں۔" یہ بات صحیح نہیں تھی۔ عبدالغفار خاں ستمبر ہی میں یہ اعلان کر چکے تھے کہ وہ پاکستان کو قبول کرتے ہیں البتہ وہ یہ چاہتے تھے کہ پشتو بولنے والے لوگوں کو اپنے وطن

ہیں جس کا نام اُنھوں نے پٹھانستان رکھا، وہی حیثیت اور حقوق حاصل ہوں جو سندھیوں کو سندھ میں، پنجابیوں کو پنجاب میں اور بنگالیوں کو بنگال میں ہیں۔ بہرحال اس کمیونکے میں یہ لکھا تھا" انھوں نے اپنے پیروؤں کو یہ حکم دیا کہ ۱۵ اگست کے جشن آزادی میں شرکت نہ کریں" اور پاکستان کی نئی ریاست کا حلفِ وفاداری نہ اُٹھائیں۔ اسی لیے اُن کے بھائی کی وزارت جو ان دنوں برسرِ حکومت تھی، پاکستان سے غداری کی بنا پر برخاست کردی گئی تھی"۔ ظاہر ہے کہ یہ الزام اُسی وقت غلط ثابت ہوگیا جب بادشاہ خاں نے کراچی میں حلف وفاداری اُٹھایا، اور صاف صاف الفاظ میں پاکستان کی ریاست سے سچی وفاداری کا اظہار کیا۔ اس کے علاوہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جو الزام اُن پر لگایا گیا اُسے اُن کے بھائی کی وزارت" سے" جو ان دنوں برسرِ حکومت تھی"۔ کیا تعلق ہے؟ کیا یہ وہی پرانا قصہ نہیں، معلوم ہوتا ہے کہ بھیڑیے نے میمنے پر یہ الزام لگاکر کہ وہ اس کا پانی گدلا کر رہا ہے اُسے ہڑپ کرلیا تھا۔ اس کے بعد کمیونکے میں یہ الفاظ تھے" اسی کے ساتھ اُنھوں نے نام نہاد جمعیت العوام کو قائم کرکے اپنے دائرۂ عمل کو اور وسیع کرلیا" کوئی پوچھے کہ یہ کون سا جرم تھا اور پاکستان کے پرانے کانگریسی عناصر کو اکٹھا کرلیا۔ ظاہر ہے جسے سزا دینا ہو، اس پر کچھ الزام تو لگانا ہی چاہیے" دوسری بار کراچی جانے کے بعد .... بادشاہ خان

نے سوچ سمجھ کر اور پورا انتظام کر کے صوبے میں شورش کرنے کی کوشش کی۔ عین اس وقت جب ہندوستانی فوج کا حملہ، جس کا بہت کچھ اشتہار دیا گیا تھا، صوبہ سرحد پر ہونے کی توقع تھی " اگر کوئی ایسی سازش تھی کہ بادشاہ خاں کی مفروضہ جدوجہد اسی وقت شروع ہو جب ہندوستانی فوج کا حملہ، جس کا بہت کچھ اشتہار دیا گیا تھا، صوبہ سرحد پر ہونے کی توقع تھی " (دراصل یہ حملہ کمیونیکے کے مصنف کے ذہن کی پیداوار تھی) تو پاکستان کی حکومت بھی اسی سازش میں ضرور شریک رہی ہوگی، تبھی تو اس نے آئین ساز اسمبلی کا جس میں بادشاہ خاں حلفِ وفاداری اٹھانے کے لئے گئے تھے ٹائم ٹیبل ایسا بنایا کہ وہ اس کی کارروائی ختم ہونے کے بعد ٹھیک وقت پر اپنے صوبے میں پہنچ سکیں۔ "گڑھی حبیب اللہ کی بم باری" جو ہندوستان کی ہوائی فوج نے کہر کی وجہ سے غلطی سے کردی تھی اور جس کے لیے ہندوستان کی حکومت نے فوراً علانیہ معافی مانگی تھی " نے بادشاہ خان کو اور اکسایا " (یہ اس شخص کا ذکر ہے جس نے حال ہی میں کراچی میں کہا تھا کہ پاکستان کے قائم ہونے کے بعد سے وہ پاکستان کے فائدے کو اپنا فائدہ اور اُس کے نقصان کو اپنا نقصان سمجھتا ہے) " اور وہ گاؤں گاؤں پھر کر لوگوں سے یہ کہنے لگے کہ پاکستان ایک ریل کے پل کی طرح ہے جو ایک ہی دھکے میں بیٹھ جائے گا " یہ بات اُن کے الفاظ کو زبردستی توڑ مروڑ کر کہی گئی۔ حقیقت میں انھوں نے یہ

کہا تھا کہ پٹھانوں کو متحد ہو کر" ان ریت کی دیواروں کو گرا دینا چاہیے جو پاکستان کے لیڈروں نے ان کے گرد کھڑی کر دی ہیں" تاکہ ان کے حقوق کو محدود کر دیں۔ کمیونکے کے آخری الفاظ یہ تھے " اپنی تقریروں میں جو وہ آخر مئی سے کر رہے ہیں وہ نہ صرف حکام کو برا بھلا کہتے ہیں بلکہ لوگوں کو واقعی ابھار رہے ہیں کہ اس حکومت کے خلاف جو جائز طور پر قائم ہوئی ہے شورش برپا کریں۔ اب آپ ان الفاظ کا مقابلہ بادشاہ خان کے اس بیان سے کیجئے جو انھوں نے صاف دلی سے ۱۶ مئی ۱۹۴۸ء کو یعنی اپنی گرفتاری سے ایک مہینے پہلے دیا تھا " مجھے مجبوراً یہ کہنا پڑتا ہے کہ باوجود اس اپیل کے جو میں نے حال میں اپنے مخالف پارٹی کے دوستوں سے اخباروں اور تقریروں کے ذریعے سے کی تھی انھوں نے جمعیتہ العوام کے قیام کو ہمدردی کی نظر سے نہیں دیکھا بلکہ وہ میری پارٹی والوں کی نیت پر بار بار شبہہ کا اظہار کر رہے ہیں محض اس لیے کہ وہ ایک زمانے میں ہندوستان کی نیشنل کانگریس سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ بات اس وجہ سے اور بھی زیادہ افسوس ناک ہے کہ اس جمعیت نے اپنے خاص رزولیوشن میں حب وطن کے جذبے کے ساتھ غیر مشروط طور پر حکومت کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا۔ ہمارے حریفوں کے نزدیک ریاست سے وفاداری کا معیار یہ ہے کہ ایک پارٹی کی حکومت کے سامنے بے چون و چرا سر جھکا دیا جائے " دنیا سے یہ توقع کرنا بے جا ہے کہ وہ اس بات کو

مان لے گی کہ وہ شخص جس کو ساری عمر اپنی قوم کو تشدد سے باز رکھنے کی لگن رہی جو اسے اُن کے لئے مہلک سمجھتا تھا جس نے خوفناک پٹھانوں کو عدم تشدد کا پابند بنا کر دنیا کو حیران کر دیا جس کے خلوص اور سچائی کی گاندھی جی نے اچھی طرح جانچ کرنے کے بعد شہادت دی تھی۔ اس جرم کا مرتکب ہو سکتا ہے کہ وہ بار بار خالص عدم تشدد کا اور پاکستان کی وفاداری کا دعوےٰ کرنے اور مجمع عام میں اس کی خیر خواہی کا اعتراف کرنے کے بعد ایک دم سے اپنے عقیدے سے پھر جائے گا اور ان اصولوں کو جن کا وہ عمر بھر پابند رہا چھوڑ دے گا راقم الحروف جسے بادشاہ خاں کی دوستی اور ہم طعامی کا فخر حاصل ہے اور جو گاندھی جی کے زیر سایہ اُن کے گھر میں خاندان کے ایک رکن کی حیثیت سے رہ چکا ہے۔ یہ کہہ سکتا ہے کہ آج ہندوستان یا پاکستان میں کوئی ایک شخص بھی نہیں جو بادشاہ خاں کی طرح گاندھی جی کے حق اور عدم تشدد کے اصولوں کا اور اُن کی گہری روحانیت کا مجسمہ ہو جو ان کی طرح خدا پر عقیدہ رکھتا ہو اس کی مرضی کے سامنے سر تسلیم خم کرتا ہو اور اس کے بندوں کی دل و جان سے خدمت کرتا ہو[1]

---

[1] مہادیو ڈیسائی نے جو گاندھی جی اور بادشاہ خاں دونوں کو اتنی اچھی طرح جانتے تھے جتنا کوئی اور نہیں جانتا ہوگا ۱۹۳۸ء میں لکھا تھا "مجھے آج تک کوئی ایسا شخص نہیں ملا جو پاکبازی اور زہد و تقویٰ اور اسی کے ساتھ رقت قلب اور خدا پر سچا عقیدہ رکھنے میں بادشاہ خاں سے بڑھ کر بلکہ ان کے برابر بھی ہو۔"

"دو خدائی خدمت گار" از مہادیو ڈیسائی

خان بھائیوں کی مسلسل اسیری مہذب دنیا کے ضمیر کے لیے ایک چیلنج ہے۔ اگر بے گناہوں کی جنھوں نے اپنی زندگی کو ایک اعلیٰ نصب العین کی خدمت کے لیے وقف کر دیا ہے۔ قربانی کی مثال دیکھنی ہو تو ان ڈاکٹر بھائیوں کو خصوصاً بادشاہ خان کو دیکھیے۔ اُن کے دل میں کسی کی طرف سے دشمنی کا جذبہ نہیں بادشاہ خان کی کوئی ذاتی غرض نہیں۔ کوئی شخصی حوصلہ نہیں "میں ساری عمر ایک سپاہی رہا ہوں اور مرتے وقت تک سپاہی رہنا چاہتا ہوں" ان الفاظ کے ساتھ انھوں نے ۱۹۳۴ء میں کانگریس کا صدر بننے سے انکار کیا تھا۔ انھوں نے اپنی خوشی سے ضبطِ نفس کے لیے ہر طرح کی جسمانی تکلیفیں اُٹھانے کی عادت ڈالی۔ سفر کے زمانے میں وہ اپنا سامان خود اُٹھاتے تھے اور تیسرے درجے میں سفر کرتے تھے۔ ۱۹۳۱ء میں جب وہ پہلی بار گاندھی جی سے ملنے کے لیے بورسد آئے تو اُن کے پاس صرف ایک جوڑا کپڑا تھا "جب فاصلہ اتنا ہو جسے وہ پیدل طے کر سکیں تو کبھی سواری استعمال نہیں کرتے، لیکن جب اس کے بغیر کام نہ چل سکے تو وہ سب سے سستی سواری ڈھونڈھتے ہیں۔ وہ ہر قسم کے تعیشات سے پرہیز کرتے ہیں اور نہایت سادی غذا استعمال کرتے ہیں۔ انھیں لوگوں کی اطاعت اور سچی وفاداری حاصل ہے۔ اس لیے کہ وہ خود ان صفات کا مجسمہ ہے۔

خان بھائیوں کو پاکستان کی حکومت سے جو اختلاف بھی ہو

مگر ان کی دیانت داری شبہہ سے بالاتر ہے۔ مجھے یاد ہے کہ تقسیم کے بعد جب میں آخری مرتبہ گاندھی جی کے ساتھ دسمبر ۱۹۴۷ء اور جنوری ۱۹۴۸ء میں ٹھیرا تھا تو بادشاہ خاں نے گاندھی جی کو یہ پیام بھیجا تھا کہ آپ میری طرف سے یا ڈاکٹر خان صاحب کی طرف سے کوئی فکر نہ کیجئے۔ ہم آپ سے ملنے یا آپ کو خط لکھنے سے خاص کر کے پرہیز کرتے ہیں تاکہ پاکستان کے ساتھ ہماری وفاداری کے بارے میں کوئی شبہہ نہ کیا جا سکے۔ ان دونوں کے ساتھ یہ بڑا ظلم ہوگا کہ ان پر دھوکے یا دوغلے پن کا شبہہ کیا جائے۔ وہ اس قسم کی حرکتیں کر ہی نہیں سکتے۔ انھیں اپنے ملک سے اور اپنی قوم سے گہری اور والہانہ محبت ہے۔ بادشاہ خاں فطری طور پر سیدھے سادے اور کھرے واقع ہوئے ہیں اور کبھی کبھی ایسے بھولے پن کی باتیں کرتے ہیں کہ دوسرا آدمی گھبرا جاتا ہے۔ ایسا شخص کبھی اس ریاست کا دشمن نہیں ہو سکتا جو اپنے آپ کو اسلامی ریاست کہتی ہے۔

خان بھائی اس مٹی کے بنے ہیں جس سے ہیرو اور شہید بنتے ہیں۔ وہ اس مقصد کی خاطر جس کے لئے انھوں نے اپنی ساری زندگی گذار دی، خوشی سے جان دینے پر تیار ہو جائیں گے "مجھے پوری طرح یقین ہے کہ سب کچھ خدا کی طرف سے ہے۔ جب تک وہ مجھ سے جیل کے باہر کام لینا چاہتا تھا اس نے مجھے جیل سے باہر رکھا۔ اب اس کی مرضی یہ ہے کہ میں اندر رہ کر کام کروں میں اسی میں

خوش ہو جو اس کی خوشی ہو"۔ یہ الفاظ بادشاہ خاں نے اس وقت کہے تھے جب وہ واردھا سے اس زمانے کی بھی حکومت کے حکم سے گرفتار کر کے جیل لائے گئے تھے اور انھیں تین سال کی قید سخت کی سزا دی گئی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ آج بھی وہ یہی الفاظ دہراتے ہوں گے۔ اس لیے وہ جہاں ہیں اچھے ہیں۔ لیکن انصاف سے کہیے کہ کیا ایسے خدائی خدمت گاروں سے اس سے بہتر کام نہیں لیا جا سکتا تھا کہ انھیں جیل کی دیواروں کے اندر زندہ دفن کر دیا جائے کاش آج ہندوستان کا کوئی خدمت کرنے والا بادشاہ خاں کی طرح باخدا بے نفس، حق شناس اور سچی تنقید کرنے والا ہوتا جو حکومت کو تنبیہہ کرتا رہتا اور اُسے سیدھے راستے پر چلاتا جو ان کی سی کھری سیرت، بے لاگ دیانت رکھتا اور جیسے حضرت مسیح کی طرح غریبوں اور بے کسوں سے محبت اور ہمدردی ہوتی اور جو اپنی زندگی کے ہر سانس کو ان کی آزادی اور خدمت کے لئے وقف کر دیتا۔ اگر دونوں ملکوں میں ایسے دو دو آدمی ہوتے تو یہ ان دونوں بلکہ شاید سارے ایشیا اور پوری دنیا کے لئے امن اور سلامتی کی بہترین ضمانت ہوتی۔

اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ بادشاہ خاں میں کوئی خامی یا کمزوری نہیں ہے۔ کون انسان اس سے خالی ہے؟ ان کی ایک کمزوری یہ ہے کہ وہ انگریزوں کی بات پر شبہہ کرتے ہیں۔

کے بارے میں میں گاندھی جی کی رائے بیان کر چکا ہوں۔ بات یہ ہے کہ انسان ویسا ہی بن جاتا ہے جیسا واقعات اُسے بناتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ ۱۹۳۱ء میں گاندھی ارون معاہدے کے بعد گاندھی جی انھیں سرآر تھر گریفتھ سے ملنے کے لئے لے گئے۔ بادشاہ خاں بڑے افسروں سے ملنا نہیں چاہتے تھے۔ انھوں نے کہا کہ میں ایک سیدھا سادا آدمی ہوں اور ڈپلومیسی نہیں جانتا ہوں۔ گاندھی جی نے انھیں سمجھا بجھا کر راضی کیا۔ جب سر گریفتھ سے ملاقات ہوئی تو بادشاہ خاں نے اُن سے کہا "میں ایک صاف آدمی ہوں اور صاف باتیں پسند کرتا ہوں۔ میرے ساتھ ڈپلومیسی نہ برتیے گا۔" انھوں نے جواب دیا "خاں صاحب سیاست ایک شطرنج کا کھیل ہے جس میں دونوں طرف سے چالیں چلی جاتی ہیں۔ میں آپ کو مات دینے کی کوشش کرتا ہوں، آپ کو موقع ملے تو مجھے مات دیجیے۔" بادشاہ خاں نے کہا "تو پھر میں آپ کے ڈھب کا آدمی نہیں ہوں۔" اور یہ کہہ کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ سر گریفتھ نے حکمت عملی سے اپنا طرز بدل دیا۔ انھیں روک لیا اور ملاقات جاری رہی۔ اس کے کئی سال بعد بادشاہ خاں نے اس کے نتیجے کو بیان کیا "میں نے اپنی تجویز اُن کے سامنے رکھی (کہ قبائلیوں میں جاکر اور محبت کے ساتھ ان کی خدمت کر کے ان کے دلوں کو ہاتھ میں لیا جائے) .... مگر اس پر غور کرنے کے بجائے انھوں نے مجھے جیل میں ڈال دیا۔" وہ حد سے زیادہ

حساس ہیں اور کبھی کبھی اُن کے مزاج میں چڑچڑا پن آجاتا ہے۔ وہ صاف گو اور مُنہ پھٹ ہیں، اور جب کبھی اُنھیں غصہ آجاتا ہے تو اُن کے منہ سے گرم لاوا کی طرح الفاظ ابلنے لگتے ہیں اور سُننے والے کی روح کے اندر جھوٹ کی کھیتی جل جاتی ہے۔ لیکن اُن کے غصّے میں عداوت نہیں ہوتی۔ انھیں غصہ برائی پر آتا ہے۔ بُرے آدمی پر نہیں آتا۔ پھر بھی ستیہ گرہ کے نقطہ نظر سے یہ ایک خامی ہے اس لئے کہ ستیہ گرہ کا یہ ایک مسلمہ اصول ہے کہ سچی بات جب محبت بھرے دل سے نکلے تو اس میں سختی نہیں ہونی چاہئے۔ سارا معاملہ یہ ہے کہ انسان کو اس کا ڈھب آتا ہو۔ اسی طرح ان کی بعض اور کمزوریاں بھی گنائی جا سکتی ہیں۔ خدا اپنے سچے خدمت گذاروں کی غلطیوں کو درست کر دیتا ہے۔ مگر اُن سے چشم پوشی نہیں کرتا۔ عدم تشدد کا قانون اٹل ہے۔ اور اگر اس پر عمل کرنے میں ناتجربہ کاری سے کام لیا جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہو سکتا ہے کہ فوری مقصد میں ناکامی ہو، مگر یہ نام نہاد ناکامی عدم تشدد کی نہیں ہوتی بلکہ اس ناقص ذریعے کی ہوتی ہے جس سے وہ ظاہر کیا جائے۔ بجائے اس کے کہ اس سے انسان کا عقیدہ کمزور ہو یا اس پر مایوسی کا غلبہ ہو عدم تشدد کے پیرو کو چاہیے کہ توفیق الٰہی کے لئے۔ جس کے بغیر انسان کوئی چیز نہیں، اور زیادہ دعا کرے۔

انسان کو اس سے زیادہ نہیں دیا گیا۔

اس کی روح میں صرف اتنی ہی طاقت ہے
کہ جو آج سیکھے، اس پر کل عمل کرے۔
اس کے لیے یہ کام کیا کم ہے
کہ صناعِ حقیقی کو کام کرتے ہوئے دیکھے
اور اس سے کاری گری کے حقیقی گُر
اور اوزاروں کا صحیح استعمال تھوڑا بہت سیکھ لے"۔

اب رہے خدائی خدمت گار تو جو خبریں اس کے بارے میں مل رہی ہیں کہ بادشاہ خاں کی اسیری کے زمانے میں انھیں اپنے سردار کی وفاداری کے جرم میں کیا کچھ بھگتنا پڑ رہا ہے اگر ان کا ایک شمّہ بھی صحیح ہے تو انھیں بڑی سخت آزمائش کا سامنا کرنا ہے۔ انھیں گاندھی جی کے یہ الفاظ جن میں آئندہ کی خبر دی گئی ہے، یاد رکھنے چاہئیں:۔

"اگر آخری مقابلے میں خدائی خدمت گار اس عقیدے میں سچے ثابت نہ ہوئے جس کی پابندی کا وہ دعویٰ کرتے ہیں تو ظاہر ہوگا کہ در اصل عدم تشدد اُن کے دل میں نہ تھا یہ آزمائش کا موقع بہت جلد آئے گا۔ اگر وہ جوش اور خلوص سے تعمیری پروگرام پر عمل کرتے رہے تو اُن کے لئے کوئی خطرہ نہیں۔ وہ امتحان کے وقت دنیا کے سب سے زیادہ بہادر آدمی ثابت ہوں گے۔

"علامہ تشار دکسی کی اجازت کا پابند نہیں۔ وہ آپ ہی اپنی مُہر اور اپنی سند ہے۔ وہ بے گناہ قربانی اور ظاہری شکست کے ذریعے سے ہر معرکے کو سر کر لیتا ہے۔ وہ کبھی ناکام نہیں ہوتا۔"

جس کی قیمت صرف پانچ آنے تھی۔ مگر اس کے لگانے سے معمولی پنجابی چرخے کی گردش پچاس سے لے کر ایک سو چالیس تک بڑھ جاتی تھی۔

ایک اور حصے میں کاغذ سازی اور گنے کے رس اور تاڑی سے گڑ بنانے کے طریقے دکھائے جاتے تھے۔ حکومت کے محکمہ جات صحت، زراعت اور صنعت بھی اپنی چیزیں نمائش میں لائے تھے۔ ایک صاف ستھرے بالترتیب گاؤں کے مٹی کے ماڈل کے مقابلے میں ایک گندے اور بے ترتیب گاؤں کا ماڈل بنا کر فرق دکھایا گیا تھا۔ اس کے علاوہ دیہاتی مکان باغ اور کھیت کے بھی مٹی کے ماڈل بنائے گئے تھے۔

نمائش میں داخلہ مفت تھا۔ جیسا کہ گاندھی جی نے بتایا یہ طریقہ غلط تھا۔

اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ چھوٹی سے چھوٹی رقم کی ادائیگی ایک صحت مند دلچسپی پیدا کرنے کی باعث ہوتی ہے۔ پہلے دن اتنے لوگ آئے کہ سوائے عورتوں کے سب کا داخلہ بند کر دینا پڑا۔ اس کے باوجود لوگ دروازے اور کھڑکیاں توڑ کر اندر داخل ہو گئے۔ چھ دن میں ۴۰۰ روپے سے زیادہ کی کھادی فروخت ہوئی۔ یہ دیکھتے ہوئے کہ پچھلے بیس سال میں مقامی کھادی بھنڈار کی سالانہ بکری کبھی بھی ۲۰۰ روپے سے زیادہ نہیں ہوئی تھی۔ یہ عجیب بات تھی۔

ریلوے گاڑی اور چنگی وغیرہ کے اخراجات کے علاوہ نمائش پر ۲۰۲ روپے خرچ ہوئے۔ ان میں سے کتبوں، خاکوں اور دوسرے آرائش کے سامان کی قیمت منہا کر لینی چاہیے۔ کیونکہ یہ سامان نمائش کے ساتھ ختم نہیں ہو گیا۔

سولھواں باب

"جس کے تخیل پر ماضی کا نقشہ ہو وہ مستقبل کی تصویر نہیں دیکھ سکتا"
(رفائیل سیبٹینی)

ٹیکسلا

(۱)

گاندھی جی نے اپنا سرحد کا دورہ ختم کرنے کے بعد ٹیکسلا اسٹیشن سے وردھا روانہ ہونے سے پہلے ٹیکسلا کے کھنڈروں کی سیر کی۔ اس کے بغیر ان کا دورہ نامکمل رہ جاتا جس طرح اس بات کے سمجھنے کے لئے کہ خدائی خدمت گاروں کی عدم تشدد کی تحریک کوئی سطحی اور عارضی چیز نہیں بلکہ ایک ارتقائی منزل ہے جو ان کی معاشرتی زندگی کے اندرونی تقاضے سے پیدا ہوئی ہے۔ بادشاہ خاں اور ان کے خدائی خدمتگاروں کے ساتھ چار ہفتے مل جل کر رہنے کی ضرورت تھی۔ اسی طرح پٹھانوں کے متعلق ایک عالمگیر غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے ٹیکسلا جانا لازمی تھا۔ بعض نکتہ چینیوں نے یہ اعتراض کیا ہے کہ عدم تشدد صوبہ سرحد میں ایک خارجی چیز ہے۔ اور وہ یہاں کے ناسازگار ماحول میں پنپ نہیں سکتا۔ ان لوگوں کو یہ خبر نہیں کہ ایک ہزار سال تک اس خطے میں بودھ مت

کا دور دورہ رہا ہے۔ وادی سوات، وادی کابل اور اس کے آگے افغانستان سے ختن تک کے علاقے میں آج بھی قدم قدم پر استوپ خانقاہیں، ستون اور بودھ مت کی دوسری یادگاریں باقی ہیں۔ جو زبان حال سے اپنی داستان سناتی ہیں۔ ٹیکسلا اور گندھارا ہی کے راستے سے شمالی بودھ مت چین تک پھیلا تھا اور جب آج کل خدائی خدمت گار خیالی، قول اور فعل میں عدم تشدد کی پابندی کے حلف نامے پر دستخط کرتا ہے تو وہ گویا اپنے ان بزرگوں کی تقلید کر رہا ہے جو ٹیکسلا قدیم کے گوشۂ عافیت میں چین کے ان جاتری طالب علموں کے ساتھ جو صحرائے گوبی کو پار کر کے آتے تھے، بیٹھ کر غصے کو تحمل سے دبانے کے مسئلے کے پراسرار معنی پر غور کیا کرتے تھے۔

سر جان مارشل (SIR JOHN MARSHAL) نے اور ان سے پہلے کرین کرافٹ (CRANCRAFT) ڈیل میرک (DELMERICK) اور کننگھم (CUNNINGHAM) نے جو محض شوقیہ آثار قدیمہ کی تحقیقات کرتے تھے اس کام میں جو محنت کی ہے اس کی بدولت ہم آج صدیوں پیچھے جا سکتے ہیں اور تھوڑے سے تخیل سے کام لے کر صوبہ سرحد کی تاریخ کے اس دل کش دور کا جیتا جاگتا نقشہ دیکھ سکتے ہیں۔ راول پنڈی سے بیس میل شمال مغرب میں ٹیکسلا اسٹیشن کے مشرق اور شمال مشرق کی طرف تین الگ الگ شہروں کے آثار ہیں یہ تینوں قدیم ٹیکشا شیلا

کے کھنڈر ہیں جو وقتاً فوقتاً مختلف مقامات پر از سر نو تعمیر ہوتا رہا۔ مہابھارت میں جنم جیے کی سانپ کی قربانی کے سلسلے میں ٹیکسا شیلا کا ذکر آیا ہے۔ ایرین (ARRIAN) نے اس کا ذکر ایک عظیم الشان اور خوش حال یونیورسٹی ٹاؤن کی حیثیت سے کیا ہے "در اصل یہ ان سب شہروں میں جو انڈس (INDUS) اور ہیڈسپیس (HYDASPAS) (جہلم) کے درمیان واقع ہیں سب سے بڑا شہر تھا اور اس زمانے میں اور اس کے بعد صدیوں تک علوم و فنون کے مرکز کی حیثیت سے شہرت رکھتا تھا"

ان تین شہروں کے کھنڈروں کے علاوہ کچھ اور متفرق آثار زیادہ تر بودھ استوپ اور خانقاہیں ہیں۔ جو اس سارے خطے میں پھیلی ہوئی ہیں۔ ان میں سے گاندھی جی نے جو لیاں کی بودھ خانقاہ کے کھنڈر کو دیکھا۔ یہ خانقاہ تین سو فٹ اونچی پہاڑ کی چوٹی پر واقع ہے اور کسی زمانے میں بودھ سنگھ کے لوگوں اور جاتری طالب علموں کے لئے جنھوں نے "عیش و راحت سے منہ موڑ کر کلفت و مشقت کی زندگی بسر کرنے کا" حلف اٹھایا تھا، بہترین گوشۂ عافیت تھی۔ اس کا اس اونچی پہاڑی پر واقع ہونا جہاں سے دور دور تک کا منظر نظر آتا ہے۔ اس کی خاموشی اور تنہائی اور اس کی "ٹھنڈی اور گرد و غبار سے پاک" ہوا ان لوگوں کے ذوق جمال کو تسکین دیتی ہوگی جو اپنے گیان دھیان

کے لئے پاک اور بے داغ فطرت کی صحبت کو ناگزیر سمجھتے تھے۔ یہ یادگار ایک خانقاہ اور دو استوپوں کے چبوتروں پر جو مختلف سطحوں پر واقع ہیں مشتمل ہے۔ استوپوں کے چبوترے کھلے مربعے میدان ہیں جن کے دونوں طرف چھوٹی چھوٹی کوکلیاں بنی ہیں جن میں مورتیاں رکھی جاتی تھیں۔ خانقاہ کے کھلے چوک کے چاروں طرف چھوٹی چھوٹی کوٹھریاں ہیں جو مراقبے اور مطالعے کے لئے استعمال ہوتی تھیں یہاں سے ہم وہ باورچی خانہ جہاں یہ لوگ کھانا کھاتے تھے۔ رسوئی، کھانے کا کمرہ۔ پہاڑی کے نیچے کنوئیں جہاں سے پانی آتا تھا اور وہ پگ ڈنڈیاں دیکھ سکتے ہیں جن سے یہ لوگ قریب کے شہر سرکپ میں بھیک مانگنے جایا کرتے تھے۔ کوٹھریوں میں گھڑے اور پانی پینے کے آب خورے آج تک اسی طرح رکھے ہوئے ہیں جیسے اب سے دو ہزار برس پہلے رکھے تھے۔ اس خانقاہ میں گندھارا آرٹ کے بعض بہترین نمونے ملتے ہیں جو اب تک بہت اچھی حالت میں ہیں۔ اس سے تھوڑی دور کے فاصلے پر سرکاپ کے آثار کھود کر نکالے گئے ہیں۔ یہ ان تین مقامات میں سے دوسرا مقام ہے جہاں ٹیکشاشیلا کا شہر دوسری صدی قبل مسیح کے شروع میں تعمیر کیا گیا تھا۔ اس کے گرد ایک پتھر کی دیوار ہے جس کا گھیر چھ ہزار گز اور چوڑائی پندرہ سے لے کر بیس فٹ تک ہے۔ یہ شہر پہاڑی سے لے کر وادی تک پھیلا ہوا ہے اور اس کے

احاطے کے اندر سلسلۂ ہتھیال کی تین کھڑی چٹانیں ہیں اور ایک چھوٹی پہاڑی ہے جو سب سے الگ واقع ہے۔ یونانیوں کے بیان کے مطابق یہ شہر وسعت میں نینوا کے برابر تھا اور اس میں ایک سورج کا مندر اور ایک شاہی محل تھا۔ اس کا نقشہ موزوں اور سڈول ہے۔ سڑکیں اس زمانے کے یونانی شہروں کی طرح تنگ اور بے قاعدہ ہیں۔ مکانوں کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ دیکھنے میں ایک منزل کے معلوم ہوتے تھے لیکن اصل میں ان میں زمین کے اندر بھی ایک منزل ہوتی تھی۔ ۶۳۰ء میں ہیونسانگ نے اس شہر کو اور اس کے آس پاس بودھ مت کے معبدوں کو اچھی خاصی حالت میں دیکھا تھا۔ بودھ آرٹ اور تہذیب موریا سلطنت کے زمانے میں عروج کو پہنچی اور ۴۵۵ء کے بعد ہن قوم کی ظالمانہ تاخت و تاراج سے برباد ہو گئی۔

میوزیم میں ان باقیات کو دیکھ کر جو کھدائی سے حاصل کی گئی ہیں، انسان بڑی آسانی سے اس زندگی کا ہو بہو تصور کر سکتا ہے جو ان سڑکوں پر چلنے والے اور ان مکانوں میں رہنے والے کسی زمانے میں بسر کرتے تھے ——— ان کے لباس کا، پیتل کے برتنوں کا جن میں وہ کھانا کھاتے اور پکاتے تھے، وہ چکیاں، اوکھلیاں اور تین چار فٹ اونچی مٹی کی گولیں جو یہاں صحیح و سالم پائی گئیں، بالکل ویسی ہی ہیں جیسی کہ آج ہندوستان

کے گاؤں میں استعمال ہوتی ہیں اور اگر کوئی چپکے سے ان میں ادل بدل کر دے تو کسی کو کچھ پتہ نہیں چل سکتا۔ ایک عجائب گھر میں مٹی کے کھلونے، گاڑیاں، اسیاہی اور سادھو نظر آئے۔ معلوم ہوتا تھا کہ ابھی ابھی ان بچوں کے ہاتھوں نے جو ان سے کھیلتے تھے اُن کو چھوا ہے۔ اگر آج کوئی گاؤں کا بچہ ان کو دیکھے تو یہ کہے گا کہ کسی نے میرے کھلونے چرا لیے۔ وہ برتن وغیرہ اور دوسرا سامان جو گھر یلو رسموں میں استعمال ہوتا تھا نظروں کو ایسا مانوس معلوم ہوتا ہے کہ اگر ایچ۔ جی۔ ویلز کی "وقت کی مشین" کا ایک چکر ہمیں تین ہزار سال قبل کے ان لوگوں کے گھروں میں پہنچا دے جہاں یہ رسمیں ہو رہی ہوں تو ہم بغیر اجنبیت کے احساس کے اُن میں شریک ہو سکتے ہیں۔ اُن کی زینت اور آرائش کی چھوٹی چھوٹی چیزیں، کنگھے، آئینے، استرے وغیرہ چھوٹی چھوٹی سیندور کی ڈبیاں، سرمے کی سلائیاں، اور چاندی سونے کے زیورات بھی زمانے کے ہاتھوں ہم تک پہنچے۔ گاندھی جی کو میوزم کے نگراں نے چاندی کے بھاری کڑوں کا ایک جوڑا دکھایا تو محبت کے جذبے سے ان کا دل بھر آیا اور ایک ٹھنڈا سانس کھینچ کر انھوں نے کہا "یہ تو ہو بہو ویسے ہی ہیں جیسے میری ماں پہنتی تھیں"۔

ہمارے دل میں یہ سوال پیدا ہوا کہ آخر ان لوگوں کے خیالات اور عقائد اور رسم و رواج کیا تھے۔ اسٹریبو ایرین

(STRABO ARRYAN) اور دوسرے یونانی فاضلوں نے جو سکندر کی فوج کے ساتھ آئے تھے اپنے زمانے کے ان رسوم و قوانین کا حال لکھا ہے۔ ان سب میں بھی بودھ مت کے اہنسا کے عقیدے کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ اس نظام معاشرت میں انفرادی آزادی کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ ایرین لکھتا ہے کہ بہت سی عجیب رسموں میں جو ہندوستان میں رائج ہیں، ایک رسم قدیم حکماء کے زمانے سے چلی آئی ہے، اور حقیقت میں بہت قابل تعریف ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ قانون کی رو سے کوئی شخص کسی حال میں بھی دوسرے کا غلام نہیں ہو سکتا ہر شخص خود آزاد ہو گا اور دوسرے کے حق آزادی کا بھی احترام کرے گا۔ ان کا یہ خیال تھا کہ وہی لوگ جو نہ تو دوسروں پر حکومت کرتے ہیں اور نہ ان کی خوشامد کرتے ہیں۔ ایسی زندگی گذار سکتے ہیں جو تقدیر کے نشیب و فراز کا مقابلہ کر سکے۔ اس لیے کہ جب دولت کی غیر مساوی تقسیم جائز رکھی گئی ہے تو انصاف کا تقاضا ہے کہ ایسے قانون بنائے جائیں جن کی پابندی بلاتفریق سب پر لازم ہو۔

غیر ملکیوں اور اجنبیوں کی خاطر مدارات کا خاص اہتمام تھا اور ان کی حفاظت کی اسی طرح ضمانت کی جاتی تھی جیسے ملکیوں کی حفاظت کی۔ بعض افسر خاص طور پر اس کام کے لئے مقرر کیے گئے تھے کہ غیر ملکیوں کا خیال رکھیں اور ان کے ساتھ کوئی

زیادتی نہ ہونے دیں ۔ اگر ان میں سے کوئی بیمار ہو جائے تو یہ لوگ اس کے دیکھنے کے لیے طبیب کو بھیجتے ہیں اور اس کی ہر طرح دیکھ بھال کرتے ہیں ۔ اگر وہ مر جائے تو اُسے دفن کراتے ہیں اور اس کی چھوڑی ہوئی املاک اس کے رشتہ داروں کو پہنچا دیتے ہیں عدالت کے حاکم ان مقدمات کے فیصلے میں جن کا تعلق غیر ملکیوں سے ہو ۔ بہت احتیاط سے کام لیتے ہیں ۔ اور جو لوگ اُن سے ناجائز فائدہ اٹھانا چاہیں اُن سے وہ بہت سختی سے پیش آتے ہیں ۔

سود خواری کا نام تک نہ تھا اور قوانین میں لمبی چوڑی مقدمے بازی کی گنجائش نہ تھی ۔ ایک پرانی عبارت میں جو میک کرنڈل نے ڈھونڈھ کر نکالی ہے لکھا ہے "ہندوستانی نہ تو سود پر روپیہ قرض لیتے ہیں اور نہ دیتے ہیں ۔ ہندوستان کے دستور کے مطابق نہ کوئی شخص دوسرے کے ساتھ زیادتی کرتا ہے اور نہ اپنے اوپر زیادتی ہونے دیتا ہے ۔ اس لئے ان کو نہ معاہدے کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ ضمانتوں کی "

ایک اور ٹکڑا یہ ہے "ہندوستانیوں میں جو شخص قرضہ یا امانت واپس نہ دے سکے اس کے لئے کوئی قانونی تدبیر نہیں وہ یہی کر سکتا ہے کہ اپنے آپ کو کوسے کہ کیوں ایک بدمعاش پر بھروسہ کیا "

طب کا اچھا خاصا رواج تھا لیکن مہلک اور خصوصاً متعدی بیماری کو لوگ ایک قسم کی ناپاکی اور جسمانی فساد سمجھتے تھے اور اس کا علاج یہی سمجھا جاتا تھا کہ بیمار اپنے ہاتھوں اپنا خاتمہ کرلے ہندوستانی حکیم کلانوس جو معتوب ہوگیا تھا سکندر کی ہندوستان سے واپسی کے وقت اس کے ساتھ تھا جب سخت پیچش میں مبتلا ہوا تو اس نے چتا میں جل کر جان دے دی۔ حالانکہ سکندر اس کو بہت خوشامد سے روکتا رہا۔ کہتے ہیں کہ اس زمانے میں علاج دواؤں سے زیادہ غذا کے اعتدال سے کیا جاتا تھا۔ سب سے اچھا علاج مرہم اور پلاسٹر کا استعمال سمجھا جاتا تھا۔ علاج کے اور طریقے بڑی حد تک مضر سمجھے جاتے تھے۔

لڑائی بالکل موقوف تو نہیں ہوئی تھی مگر صرف سپاہیوں کے طبقے تک محدود تھی۔ کاشتکاروں کا طبقہ "جو اوروں سے تعداد میں کہیں زیادہ تھا" جنگی خدمت اور دوسری عمومی خدمات سے مستثنیٰ تھا۔ حملہ آور دشمن کو اگر کوئی کسان کھیت میں کام کرتا ہوا ملے تو اسے نہیں چھیڑتا تھا۔ اس لئے کہ اس طبقے کے لوگ جو خلق خدا کے محسن سمجھے جاتے تھے ہر طرح کے نقصان سے محفوظ تھے۔ زمین تباہی سے بچی رہتی تھی۔ فصلیں اچھی ہوتی تھیں اور لوگوں کی ضرورت کی سب چیزیں جو زندگی کو خوشگوار بناتی ہیں۔ میسر تھیں۔

رپورٹ کا حسب ذیل بیان آج کل کے سرحدی پٹھان قبائل کے
متعلق اوپر کے بیان کی صدائے بازگشت معلوم ہوتا ہے۔
اُس خطے کے پٹھان باہمی لڑائیوں کے سلسلے میں ایک دوسرے
کے زرعی مزدوروں کو یا عورتوں بچوں، مہمانوں اور اجنبیوں کو
کبھی نہیں ستاتے اس مثال سے وہ لوگ سبق لے سکتے ہیں جنہیں
برتر تمدن کے مالک ہونے کا دعوٰے ہے"

یہاں سے دور پاٹلی پتر میں معاشیات کا ماہر کوٹلیہ جو اپنے
جنم بھوم ٹیکسلا سے ہجرت کر کے گیا تھا۔ ایک ایسے معاشی نظام
کی بنیاد ڈال رہا تھا جس میں ادنیٰ تر کا بھی اتنا ہی لحاظ رکھا جاتا
تھا جتنا اعلیٰ تر کا۔ اس کے ارتھ شاستر کا یہ ٹکڑا سنئے:

" ان عورتوں کے لئے جو اپنے گھروں سے نہیں نکل سکتیں جن کے
شوہر پردیس گئے ہیں، جو چلنے پھرنے سے معذور ہیں اور ان لڑکیوں کے
لئے جو اپنی روزی کمانے پر مجبور ہیں (سوت کاتنے کا) کام عزت کے
ساتھ کتائی کے مرکزوں کی ملازمہ عورتوں کی معرفت مہیا کرنا چاہئے
جو عورتیں خود کتائی کے مرکز میں جا سکتی ہیں ان کے لئے ایسا انتظام
ہونا چاہئے کہ صبح تڑکے اپنا سوت دے کر اجرت لے سکیں۔ وہاں
صرف اتنی روشنی ہو کہ سوت کے تار نظر آجائیں۔ اگر داروغہ
ان عورتوں کی طرف یا کسی اور معاملے کے متعلق گفتگو کرے تو اُسے
سخت سزا ملنی چاہئے۔ اجرت کی ادائیگی میں دیر ہو یا بغیر کام کے

مکمل ہونے کے اجرت دے دی جائے تب بھی وہ سزا کا مستوجب ہے۔

نصف صدی بعد ٹیکسلا میں اشوک کے فرمانوں کا دور دورہ تھا جن میں سے بعض آج بھی شہباز گڑھ میں موجود ہیں۔ ہم ان کے کچھ ٹکڑے نقل کرتے ہیں جو آج دنیا کی قوموں کے لیے دستور العمل کا کام دے سکتے ہیں:۔

"نیکی کرنا مشکل ہے لیکن کرنے والے اس مشکل کام کو کر ڈالتے ہیں...... اپنی تخت نشینی کے سترہ سال بعد میں نے دھرم مہاماتر مقرر کیے۔ ان کا کام یہ ہے کہ چھتریوں اور برہمنوں، امیروں غریبوں اور بوڑھوں۔ یونانیوں، افغانوں اور دوسری سرحدی قوموں کے لوگوں سے ملیں۔ وہ اس شخص کو جس کے پاؤں میں زنجیر ہے تسکین دیتے ہیں۔ اس کی راہ سے رکاوٹوں کو دور کرتے ہیں اور اس کو رہائی دلاتے ہیں۔ اس لیے کہ اس کے بال بچے ہیں جن کا اسے پیٹ بھرنا ہے وہ مکر و فریب کا شکار ہے اور اس کی کمر بڑھاپے سے جھک گئی ہے"

عدل و انصاف کے متعلق یہ ہدایت ہے:۔

"میں نے یہ کیا ہے ہر وقت اور ہر جگہ کھانے کے وقت، سونے کے وقت، زنانے میں، خلوت خانے میں، باغ کی آرام گاہ میں، وہ افسر جن کا کام ہے کہ مجھے اپنی رعایا کی خبر دیں میرے پاس آتے ہیں اور میں اپنے فرائض انجام دیتا ہوں۔ چنانچہ میں نے حکم دیا ہے

کہ جہاں کہیں بھکشوؤں کی کسی مجلس میں اختلاف یا جھگڑا ہو تو مجھے فوراً اطلاع دی جائے۔ اس لئے کہ عدل و انصاف کے معاملے میں جتنا اہتمام کیا جائے کم ہے .... رفاہ عام کی جڑ مستعدی اور عدل گستری ہے ...... میری ساری کوششوں کا ایک ہی مقصد ہے .... کہ جو ذمہ داری مجھ پر اپنی رعایا کی طرف سے عائد ہوتی ہے۔ اُسے پورا کروں "۔

ذیل کی سرحدی پالیسی ہمارے حکمرانوں کی توجہ کی مستحق ہے اس پر عمل کرنے کی جتنی ضرورت آج ہے کبھی نہ تھی "یہ مذہبی کتبہ اس مقصد سے کھدوایا گیا ہے کہ ہمارے بیٹے اور پوتے یہ نہ سمجھیں .... کہ جو فتح تلوار سے حاصل کی جاتی ہے وہ فتح کہلانے کی مستحق ہے۔ تاکہ انھیں یہ معلوم ہو جائے کہ وہ تشدد اور تباہی کے سوا کچھ نہیں .... تاکہ غیر مفتوح سرحدی علاقے مجھ سے ڈریں نہیں بلکہ مجھ پر اعتماد کریں اور انھیں مجھ سے رنج نہ پہنچے بلکہ راحت "۔

اور ان میں سب سے زیادہ شاندار ذیل کی ہدایت ہے جو مذہبی رواداری کے متعلق ہے :-

" یہ سچ ہے کہ مختلف فرقوں کے نزدیک مختلف نیکیاں اہمیت رکھتی ہیں۔ لیکن ان کی ایک مشترک بنیاد ہے اور وہ حلم اور نرم گفتاری ہے۔ چنانچہ کسی شخص کو یہ نہیں چاہیے کہ اپنے فرقے کی بہت زیادہ

تعریف کرے اور دوسروں کی تحقیر کرے۔ ان کو خواہ مخواہ بُرا نہیں کہنا چاہیئے۔ بلکہ ہر موقع پر ان کا وہ احترام کرنا چاہیئے جس کے وہ مستحق ہیں۔ اگر وہ ایسا کرتا ہے تو دوسروں کی بھلائی کے ذریعے اپنے فرقے کا بھلا کرتا ہے۔ لیکن اگر اس کے خلاف کرتا ہے، تو دوسروں کو نقصان پہنچاتا ہے اور اپنے فرقے کو کوئی فائدہ نہیں پہنچاتا۔ جو کوئی شخص اپنے فرقے کی محبت میں اور اس کی ترقی کے خیال سے اس کو بہت بڑھاتا اور دوسروں کو گراتا ہے اور اصل خود اپنے فرقے کو صدمہ پہنچاتا ہے۔ اس لئے ثواب صرف اس میں ہے کہ آپس میں اتفاق ہو۔ ہر شخص دوسروں کے عقیدے سے رواداری برتے اور سچے دل سے برتے۔"

آخر میں ایک اور ہدایت نقل کرتا ہوں جس پر ہندو مسلم اتحاد اور گئو رکھشا کے حامیوں کو غور کرنا چاہیئے۔ "لوگوں میں مذہب دو طریقوں سے رواج پاتا ہے۔ ایک تو مقررہ ضابطوں کے ذریعوں سے اور دوسرے مذہبی جذبات کے ذریعے سے جو ان کے دل میں پیدا کئے جائیں۔ ان دونوں میں سے مقررہ قاعدے کچھ زیادہ قدر و قیمت نہیں رکھتے۔ کامیابی دراصل اسی سے ہوتی ہے کہ دل میں مذہبی روح پیدا کی جائے۔ مقررہ قاعدے وہ احکام ہیں جنہیں میں جاری کرتا ہوں مثلاً بعض جانوروں کو ذبح کرنے کی ممانعت یا بعض مذہبی ہدایات جنہیں سنے بہت سے لوگوں کے لئے جاری

کی ہیں۔ لیکن صرف دلی جذبات میں انقلاب پیدا کرنے ہی کے ذریعے مذہب جمہور رکھشا کو رواج دینے میں کامیاب ہوسکتا ہے۔ اس خیال سے میں نے کتبہ شائع کیا ہے تاکہ وہ میرے بیٹوں اور پوتوں کے وقت تک باقی رہے۔۔۔۔۔۔۔۔ کیونکہ صرف اس طریقے سے انسان دنیا میں اور آخرت میں سچی خوشی حاصل کرسکتا ہے۔ جہاں کہیں یہ فرمان پتھر کے ستونوں پر کھدا ہوا ہے، خدا کرے ہمیشہ باقی رہے۔"

ظاہر ہے کہ اس پر ہر انسان آمین کہے گا۔

سترھواں باب

ٹیکسلا

(۲)

سکندر اعظم کے ماتحت یونانیوں کے ہندوستان پر حملہ کرنے کی داستان میں تاریخ ہند کے بہت سے دلچسپ حاشیے ملتے ہیں لیکن غالباً ان میں سب سے زیادہ دلچسپ وادی ٹیکسلا میں مقدونیہ اور ہندوستان کے عقلیموں کی ملاقات کا قصہ ہے جسے مختلف یونانی مورخوں نے تفصیل سے لکھا ہے۔ اس قصے کی اہمیت اس کے تمثیلی پہلو کی وجہ سے ہے۔

جنگ میں فریقین کو بہادری دکھانے کے بڑے بڑے موقع ملے جس کا دونوں نے اعتراف کیا۔ راجہ پورو (جس کو یونانی پورس کہتے ہیں) لڑائی ہار گیا لیکن جو کچھ اس نے میدانِ جنگ میں کھویا تھا اپنی ہمت اور استقلال کی بدولت اس سے زیادہ حاصل کرلیا جب سکندر نے اس سے پوچھا کہ فاتح کو مفتوح کے ساتھ کس طرح پیش آنا چاہیے تو اس نے جواب دیا "اس سبق کو سامنے

رکھ کر جو آج کے دن حاصل ہوا ہے۔ جب کہ تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ دولت و اقبال کتنی جلدی خاک میں مل جاتا ہے"۔ مورخ لکھتا ہے کہ سکندر اس تیکھے جواب سے اس سے زیادہ خوش ہوا جتنا کہ وہ لجاجت سے ہوتا۔

میدان جنگ میں یونانیوں کو کامیابی ہوئی اور سکندر کی طاقت نے ہر ایک کو مغلوب کر لیا۔ لیکن اس عالم گیر فاتح سے کچھ نہ بن پڑی۔ جب اُسے اُن لوگوں سے مقابلہ پڑا جنھوں نے اُسے اپنی حاضر جوابی کی قابلیت سے چکر میں ڈال دیا اور پھر ایک ایسا شخص ملا جس نے نہتا ہونے کے باوجود اپنی روح کو ایسی سپر بنایا جس پر دنیا کا کوئی ہتھیار اثر نہیں کر سکتا تھا۔

پشاور کے قریب سکندر نے دس سنیاسیوں کو گرفتار کیا جنھوں نے راجا سنبھاس کو اس کے مقابلے پر آمادہ کیا تھا، اور "دوسرے طریقے سے بھی اہل مقدونیہ کو نقصان پہنچایا تھا" یعنی عام طور پر لوگوں میں مزاحمت کی ایسی روح پیدا کر دی تھی جو کسی طرح دبائی نہیں جا سکتی تھی۔ اس نے اُن کے سامنے چند مشکل مسئلے حل کرنے کے لئے پیش کئے اور یہ کہا "جو شخص سب سے کمزور جواب دے گا اس کو پہلے قتل کیا جائے اور ترتیب وار دوسروں کو"۔

اس نے پہلے شخص سے پوچھا "تمھارے خیال میں کون تعداد میں زیادہ ہیں۔ زندے یا مردے؟" اس نے جواب دیا "زندے" کیونکہ

لئے کہ مُردوں کا تو وجود ہی نہیں۔" دوسرے سے پوچھا "کہاں زیادہ
جانور ہیں سمندر میں یا زمین پر؟" اس نے جواب دیا "زمین پر اس لئے
کہ سمندر اسی کا ایک حصہ ہے۔" تیسرے سے پوچھا گیا "کون جانور
سب سے زیادہ ہوشیار ہے؟" اس نے کہا "جس سے انسان
واقف نہ ہو۔" چوتھے سے پوچھا کہ "سمبھاس کو کس وجہ سے مقابلے
پر آمادہ کیا" اس نے جواب دیا "اس لئے کہ میں چاہتا تھا وہ
عزت سے جئے اور عزت سے مارا جائے۔" پانچویں سے پوچھا
"تمہارے خیال میں کون پہلے تھا، دن یا رات؟" اس نے کہا
"دن، ایک دن پہلے تھا۔" بادشاہ یہ سن کر متعجب ہوا تو اس
نے کہا "مہمل سوالوں کا جواب بھی مہمل ہونا چاہیئے۔" اب سکندر
چھٹے کی طرف متوجہ ہوا اور اس سے پوچھا "آدمی کس طرح ہر دلعزیز
ہو سکتا ہے۔" اس نے جواب دیا "اس کے پاس بہت بڑی طاقت
ہو مگر وہ اس کی کوشش نہ کرے کہ لوگ اس سے ڈریں۔" اب جو سنیاسی
باقی رہ گئے تھے، ان میں سے ایک سے پوچھا "انسان دیوتا کیونکر
بنتا ہے؟" جواب ملا "ان کاموں کو کرنے سے جو انسان نہیں کرسکتا۔"
دوسرے سے پوچھا "دونوں میں سے کون زیادہ طاقت ور ہے
زندگی یا موت؟" اس نے کہا "زندگی اس لئے کہ وہ اتنی بہت
سی برائیوں کا بوجھ اٹھالیتی ہے۔" آخری شخص سے پوچھا "آدمی کے
لئے کتنے دن تک زندہ رہنا مناسب ہے۔" اس نے جواب دیا

جب تک وہ زندہ رہنے کو مرنے پر ترجیح دے"۔ اب سکندر نے جج کی طرف متوجہ ہو کر کہا کہ تم فیصلہ کرو۔ جج نے کہا کہ سب نے ایک سے بدتر جواب دئے ہیں۔ سکندر نے کہا "اگر تمھارا یہ فیصلہ ہے تو سب سے پہلے تم ہی کو قتل کرنا چاہیئے۔ اس نے کہا "نہیں اے بادشاہ اگر ایسا ہوا تو آپ کا قول غلط ہو جائے گا۔ اس لئے کہ آپ نے کہا تھا کہ جو شخص سب سے بدتر جواب دے گا اُسے پہلے قتل کیا جائے گا"۔

ٹیکسلا پہنچ کر سکندر کو یہ شوق پیدا ہوا کہ ان دانشمندوں میں سے ایک اس کے ساتھ رہے اس لئے کہ اس کو ان کا صبر استقلال اور جفاکشی بہت پسند تھی۔ اونیسکریٹس (ONESIKRITOS) جو دیوجانوس کے مذہب کا ایک فلسفی تھا بادشاہ کا پیام لے کر ڈنڈامیس (DANDAMIS) کے پاس گیا جو اس علاقے کے سنیاسیوں کا گرو تھا۔ ہندوستان کی قدیم تاریخ میں اس ہندوستانی حکیم سے زیادہ دل کش شخصیت کوئی نہیں تھی۔ اس میں ساوانرولا (SALA YAROLA) کا سا خلوص ٹیلیماچس (TELMACHOUS) کی سی صاف گوئی اور ان دونوں سے بڑھ کر دانش مندی اور روحانیت تھی۔ مسلسل ریاضت سے اس نے مکمل ضبط اور تجرد کا وہ درجہ حاصل کر لیا تھا جس کے آگے بادشاہوں کی شان و شوکت ماند پڑ جاتی تھی اور اپنشد کا یہ جملہ یاد آ جاتا تھا "وہ حکیم جس نے برہمہ کی معرفت حاصل

کرلی ہے۔ خوف کا نام تک نہیں جانتا۔" شاہی پیام بر نے اس جنید حکیم
کو جنگل میں پتوں کے بستر پر لیٹا ہوا پایا اور اس سے گفتگو شروع
کی۔

حکیم کی گفتگو کا منشا یہ تھا کہ سب سے بہتر فلسفہ وہ ہے جو انسان
کے نفس کو رنج و راحت سے آزاد کر دے۔ رنج اور محنت میں یہ فرق
ہے کہ اول الذکر انسان کے لیے مضر اور آخر الذکر مفید ہے۔
اس پر اونیسکریٹوس نے کہا کہ فیثاغورث نے بھی اس قسم کی تعلیم
دی تھی اور اپنے شاگردوں کو ترک حیوانات کی ہدایت کی تھی اور سقراط
اور دیوجانس کا بھی یہی خیال تھا۔ ڈنڈامیس نے جواب دیا کہ میں ان
بزرگوں کو اور تو ہر لحاظ سے دانش مند سمجھتا ہوں۔ لیکن یہ ان کی
غلطی تھی کہ "رسم و رواج کو فطرت پر ترجیح دیتے تھے" ورنہ وہ
انتہائی سادگی کی زندگی بسر کرتے اور سادہ غذا کھانے سے نہ شرماتے
تھے" اس لئے کہ سب سے اچھا مکان وہ ہے جسے سب سے کم
مرمت کی ضرورت ہو" اس کے بعد اونیسکریٹوس نے اپنے آنے
کی غرض بیان کی اور کہا "اے برہمنوں کے گرو۔ زیس دیوتا
کا بیٹا سکندر جو سب انسانوں کا شہنشاہ ہے، تم کو اپنے ہاں بلاتا
ہے۔ اگر تم اس کے حکم کی تعمیل کرو گے تو وہ تمھیں بہت بڑا صلہ
دے گا۔ لیکن تم نے انکار کر دیا تو وہ تمھارا سر کٹوا دے گا۔"
حکیم نے مسکراتے ہوئے اس کی پوری بات سنی" اس

نے تیوں کے لستر سے سر تک نہ اُٹھایا ۔" بلکہ لیٹے لیٹے جواب دیا کہ اگر سکندر زیس کا بیٹا ہے تو میں بھی ہوں ۔ مجھے اس سے کسی چیز کی ضرورت نہیں ، جو کچھ میرے پاس ہے وہی بہت ہے ۔ میں دیکھتا ہوں کہ جو لوگ سکندر کے ساتھ ہیں وہ بے کار سمندر اور خشکی میں گھومتے پھرتے ہیں اور ان کا چکر کبھی ختم ہی نہیں ہوتا ۔" پھر اس نے بہت حقارت سے کہا " جاؤ سکندر سے کہہ دو کہ شہنشاہ خدا ہے جو کبھی ظلم نہیں کرتا ، بلکہ روشنی کا ، امن کا ، زندگی کا ، پانی کا اور انسان کے جسم و روح کا خالق ہے ۔ جب موت ان کو آزاد کر دیتی ہے یہ خدا سے مل جاتی ہیں ، جو مرض اور فساد سے بری ہے ۔ وہی خدا میری اطاعت کا سزاوار ہے جو خوں ریزی سے نفرت کرتا ہے اور لوگوں کو لڑائی کے لئے نہیں اکساتا ۔ سکندر خدا نہیں ہے اس لئے کہ اسے خود فنا کا جام پینا ہے ۔ بھلا ایسا شخص دنیا کا مالک کیوں کر ہو سکتا ہے ، جو ابھی تک سب ملکوں کو فتح نہیں کر سکا ۔

"اس کے علاوہ کیا سکندر نے آخرت کی زندگی کا مسئلہ حل کر لیا ہے ؟ وہ نہ تو اب تک زندہ ہیڈلیس یعنی یم لوک میں داخل ہوا ہے اور نہ یہ جانتا ہے کہ زمین کے اندرونی حصے میں سورج کا راستہ کیا ہے ۔ ان قوموں نے جو سطح ارض پر رہتی ہیں کبھی ان کا نام تک نہیں سنا ۔ اگر اس کی موجودہ قلم رو اس کے حوصلے سے کم ہو تو گنگا کے پار چلا جائے ۔ اگر ادھر کے علاقے میں اس کی سمائی نہیں ہے

تو دھر اس کو ایسا خطہ نظر آئے گا جس میں اس کی ساری فوج سما جائے گی۔

"تم یہ جان لو کہ جو انعام و اکرام مجھے دینے کا وعدہ کرتا ہے ان کی میری نظر میں کوئی قیمت نہیں۔ میں جن چیزوں کی قدر کرتا ہوں اور جنھیں مفید سمجھتا ہوں وہ یہ پتے ہیں جو میرے لئے گھر کا کام دیتے ہیں۔ یہ ہرے بھرے پودے ہیں جن سے مجھے کھانا ملتا ہے اور یہ پانی ہے جو میں پیتا ہوں۔ ان کے علاوہ اور سب چیزیں اور وہ املاک جو بڑی مشکل سے جمع کی جاتی ہے۔ جمع کرنے والے کے لئے تباہی کا باعث ہوتی ہے۔ اس سے سوا رنج اور تکلیف کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ جوگی فانی انسان کے لئے یوں ہی کچھ کمی نہیں جہاں تک میرا تعلق ہے میں جنگل میں پتوں کے بستر پر لیٹ جاتا ہوں اور چونکہ میرے پاس کچھ نہیں جس کی حفاظت کرنی ہو اس لئے بڑے چین سے سوتا ہوں۔ لیکن اگر میرے پاس نگہبانی کرنے کے لئے کچھ ہوتا تو میری نیند اڑ جاتی۔ زمین مجھے سب کچھ دے دیتی ہے، اسی طرح جیسے ماں بچے کو دودھ پلاتی ہے۔ میں جہاں جی چاہتا ہے جاتا ہوں۔ مجھے کوئی فکر نہیں جسے خواہ مخواہ لادے لادے پھروں۔

اگر سکندر میرا سر بھی کاٹ لے تو میری روح کو برباد نہیں کرسکتا میرا جسم سر سے الگ ہوکر خاموش ہو جائے گا۔ اور میرا جسم پھٹے ہوئے لباس کی طرح زمین پر رہے گا اور اسی مٹی میں مل جائے گا

جس سے وہ پیدا ہوا تھا مگر میں روح بن کر اپنے خدا کے پاس چلا جاؤں گا جس نے مجھے جسم خاکی عطا کر کے زمین پر بھیجا تھا تاکہ وہ اس کا امتحان کرے کہ آیا ہم اس دنیا میں اس کے احکام کی پابندی کرتے ہیں یا نہیں۔ جب ہم یہاں سے رخصت ہو کر اس کے پاس جائیں گے تو وہ ہم سے ہماری زندگی کا حساب لے گا۔ وہ ہر سرکشی اور ظلم کا انتقام لینے والا ہے۔ مظلوم کی آہیں ظالم کے لئے سزا بن جاتی ہیں۔

سکندر یہ دھمکیاں ان لوگوں کو دے جو مال اور دولت کے طلب گار ہیں اور موت سے ڈرتے ہیں۔ ہمارے خلاف یہ دونوں ہتھیار بے کار ہیں۔ اس لیے کہ برہمنوں کو نہ روپے کا لالچ ہے نہ موت کا خوف۔

"پس تم سکندر سے جا کر یہ کہہ دو ڈنڈامیس کو تم سے کچھ نہیں چاہیئے۔ اس لئے وہ تمھارے پاس نہیں آیا۔ اگر تم اس سے کچھ چاہتے ہو تو خود اس کے پاس چلے جاؤ۔"

مورخ لکھتا ہے کہ سکندر کو اونیسکریٹوس سے ملاقات کا حال سن کر ڈنڈامیس سے ملنے کا اور زیادہ اشتیاق پیدا ہو گیا۔ یہ وہ بوڑھا اور برہنہ حریف تھا جس سے بہت سی قوموں کے فاتح سکندر نے زک اٹھائی۔

اٹھارھواں باب

خاتمہ

(مطلع پر بادل چھا گئے)

واقعات کی رفتار کو دیکھتے ہوئے اس کی ضرورت پیش آئی کہ کتاب کے آخر میں ایک خاتمہ کا اضافہ کیا جائے اور اسے اُس کے غیر متوقع اور افسوس ناک انجام تک پہنچایا جائے۔ اس منصوبے کے مطابق جو بادشاہ خاں نے گاندھی جی کے مشورے سے بنایا تھا انھوں نے سردریاب میں خدائی خدمت گاروں کی ٹریننگ کے لئے ایک مرکز قائم کیا، ان کی درخواست پر گاندھی جی نے پہلے شریمتی میرابین (مس سلیڈ) اور پھر بی بی امتہ السلام کو (یہ ایک مسلم خاتون ہیں۔ جو اُن کے آشرم میں داخل ہوئی تھیں اور جنھیں وہ اپنی بیٹی کی طرح سمجھتے تھے) اس غرض سے بھیجا کہ وہ بادشاہ خاں کو ان کے کام میں خاص طور پر مسلمان عورتوں کی تعلیم اور معاشرتی اصلاح میں مدد دیں۔ ۱۹۳۹ء میں گاندھی جی پھر صوبہ سرحد گئے

لیکن اس عرصے میں ان کی صحت بہت بگڑ گئی تھی اور وہ اضلاع کا دورہ نہیں کر سکے یہاں تک کہ خدائی خدمت گاروں کے مرکز میں بھی نہیں جا سکے۔ اس لئے انھیں اپنے اور بادشاہ خاں کے اس ارادے کی تکمیل کو آئندہ کے لئے ملتوی کرنا پڑا کہ پٹھانوں اور خدائی خدمتگاروں کے ساتھ جا کر رہیں اور انھی بہادروں کا عدم تشدد سکھانے کا تجربہ کریں۔ مگر افسوس کہ اس کی کبھی نوبت نہ آسکی۔

۳ ستمبر ۱۹۳۹ء کو انگلستان اور فرانس نے محوری طاقتوں کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ ۲۳ اکتوبر کو کانگریس نے حکومت چھوڑنے کا فیصلہ کیا اور ورکنگ کمیٹی نے صوبوں کی کانگریسی وزارتوں کو ہدایت کی کہ وہ ان دو باتوں کے خلاف احتجاج کے طور پر استعفیٰ دے دیں ——— ایک یہ کہ ہندوستان کو اس کی رضامندی کے بغیر جنگ میں شریک کر دیا گیا اور دوسرے یہ کہ برطانوی حکومت نے اس اصول کو جس کے لئے وہ جنگ کرنے کا دعوےٰ کرتی تھی ہندوستان پر عائد کرنے سے مسلسل انکار کیا۔ اس ہدایت کے مطابق صوبہ سرحد کی کانگریسی وزارت نے ۷ نومبر کو استعفیٰ دے دیا، جو ایک ہفتے کے بعد منظور کر لیا گیا۔ اس استعفیٰ کے بعد کوئی دوسری وزارت نہیں بن سکی اور ۱۹۳۵ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کی دفعہ ۹۳ کے مطابق صوبے پر گورنری راج مسلط کر دیا گیا۔ یہ الجھن مئی ۱۹۴۳ء تک جاری رہی۔ ۱۴ اکتوبر سنہ ۱۹۴۰ء

کو باعزت سمجھوتے کی ساری کوششوں کے ناکام ہونے کے بعد کانگریس نے گاندھی جی کی رہنمائی میں انفرادی سول نافرمانی کی تحریک شروع کی جس کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان جنگی کوششوں میں حصہ نہ لے اور تقریر کی آزادی کا حق دیا جائے۔ اس کے بعد واقعات کی رفتار بہت تیز ہو گئی جس کا نقطۂ عروج اگست ۱۹۴۲ء کی "ہندوستان چھوڑ دو" کی تحریک تھی۔

بادشاہ خان اس وقت کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ممبر تھے جب اس نے پونا کے اجلاس میں جنگی کوششوں میں مشروط تعاون کی پیش کش کی اور گاندھی جی کو اپنے اہنسا کے اصول کی بنا پر اس سے الگ ہونا پڑا۔ بادشاہ خان نے اسی بنا پر استعفیٰ دے دیا۔ ہندوستان چھوڑ دو کی تحریک کے دوران میں وہ گاندھی جی اور دوسرے ممتاز کانگریسیوں کے ساتھ گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیئے گئے۔ گاندھی جی اپریل ۱۹۴۴ء میں چھوڑ دیئے گئے۔

اس عرصے میں صوبہ سرحد میں نقشہ بدل گیا تھا۔ اورنگ زیب وزارت جس نے مئی ۱۹۴۳ء میں گورنر کے کانگریسی وزارت کی جگہ مقرر کیا تھا اور جو اپنے آپ کو صرف اس طرح قائم رکھے ہوئے تھی کہ اس نے قانون ساز مجلس کے مخالف ممبروں کو گرفتار کر کے جیل میں ٹھونس دیا تھا، اپنے لالچ، نالائقی اور بے ایمانی کی وجہ سے بے حد غیر مقبول ہو گئی تھی۔ ۱۲ مارچ ۱۹۴۵ء کو ایک عدم اعتماد کے

رزولیوشن کی بنا پر یہ وزارت ٹوٹ گئی، اور ڈاکٹر خاں صاحب کی کانگریسی وزارت نے اس کی جگہ لے لی۔ اس کا سب سے پہلا یہ کام تھا کہ اس نے بادشاہ خاں، خدائی خدمت گاروں اور دوسرے سیاسی قیدیوں کو رہا کر دیا۔

مارچ ۱۹۴۶ء میں کیبنٹ ڈیلی گیشن ہندوستان آیا اور مئی میں مرکزی اسمبلی اور صوبوں کی مجالس کے انتخابات ہوئے۔ بادشاہ خاں نے ان انتخابات میں حصہ لیا، لیکن ان کا مقصد ووٹ حاصل کرنا نہیں بلکہ ووٹروں کو تعلیم دینا تھا۔ وہ ان سے کہتے تھے "میں ووٹ مانگنے نہیں آیا ہوں، اس لئے کہ میرے نزدیک یہ ووٹ اور موجودہ اسمبلیاں کوڑی کام کی نہیں۔ میں تو تمھارے لئے یہ دوستانہ پیام لایا ہوں کہ اس آزادی کو جس کے لئے تم برسوں سے لڑ رہے ہو حاصل کرو۔ تم آزادی کی دہلیز تک پہنچ گئے ہو......... اس موقع سے فائدہ اٹھاؤ، اب کی بار اسے نہ کھوؤ۔"

انتخابات کے بعد نئی منتخب شدہ کانگریس پارلیمنٹری پارٹی کے ممبروں سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے کہا "تم جانتے ہو کہ اب تک میں نے وزارت کے یا اس کے کام کے معاملے میں براہِ راست کوئی حصہ نہیں لیا۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے۔ مجھے ان چیزوں سے مطلق دلچسپی نہیں......... اب......... دوستوں نے مجھے سمجھایا ہے کہ پارلیمنٹری پروگرام بھی غریبوں کی خدمت کا ایک طریقہ

ہے۔ ایک اور موقع پر کراچی میں انھیں پبلک کی طرف سے جو ایڈریس دیا گیا اس میں "سلطان" کے لقب سے خطاب کیا گیا۔ انھوں نے اس کا جواب اپنے مخصوص انداز سے دیا۔ " کہا ہو .... میں اس ایڈریس کے لئے آپ کا شکر گذار ہوں۔ مجھے بہت افسوس ہے کہ تم نے مجھے "سلطان" کہا .... ہماری خدائی خدمت گاروں کی تحریک سلطانوں کے پیدا کرنے کے لئے نہیں ہے، تم جانتے ہو کہ سلطان کے معنی بادشاہ کے ہیں، اور لفظ بادشاہ .... سب کہیں عوام کے لئے .... افلاس اور مصیبت کے معنی رکھتا ہے .... جب تم سلطانوں کا ذکر کرتے ہو تو در اصل خدائی خدمت گار تحریک کے بنیادی اصول سے انحراف کرتے ہو!!

اکتوبر ۱۹۴۶ء میں گاندھی جی نواکھلی روانہ ہوئے تاکہ اس طوفان کے بعد جو دو قوموں کے نظریے کے حامیوں نے فرقہ وارانہ نفرت کی تلقین سے برپا کیا تھا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان میں ملاپ کا سنہری پل باندھیں، نواکھلی کے بعد اس قسم کے فرقہ وارانہ فسادات کا سلسلہ ہندوستان کے اور حصوں میں بھی شروع ہو گیا یعنی بہار، کلکتہ، یو۔پی اور اس کے بعد پنجاب، صوبہ سرحد کے ضلع ہزارہ اور سندھ میں۔ ان سے خان بھائیوں کے دل ہل گئے، لیکن ان کا عقیدہ اور زیادہ مضبوط اور واضح ہو گیا۔ جنوری

۱۹۴۷ء میں بادشاہ خاں گاندھی جی کے امن کے مشن میں ان کا ساتھ دینے کے لئے بہار گئے۔ ان کا وقار، توازن، چٹان کی سی مضبوطی، انسانی فطرت کی بنیادی، نیکی کا عقیدہ اور خدا پر سچا ایمان، طوفانی رات کی تاریکی میں ایک روشن رہنما مینار کی طرح تھا۔

ایک اخبار نویس نے جو کوئی جذباتی آدمی نہ تھا لکھا ہے "اس شخص کے خلوص نے جو اس کے ہر ایک لفظ میں شیشے کی طرح جھلکتا ہے۔ سننے والوں کے دل پر بڑا گہرا اثر کیا ہے۔ یوں دیکھو تو ان کی تقریر میں کوئی خاص بات نہیں ہوتی .... پھر بھی چند سیدھے سادے لفظ جو ایک غمگین دل سے نکلتے ہیں سننے والوں کے دلوں کے تار کو چھیڑ دیتے ہیں۔ سرحدی گاندھی کے ایک جلسے میں ہندو مسلمانوں کا بھائیوں کی طرح گلے ملنا، اور عبادت گاہوں میں اکٹھا جانا خلافت کے دنوں کو یاد دلاتا ہے۔" آگے چل کر یہ نامہ نگار کہتا ہے "یہ چھوٹے چھوٹے واقعات ہیں، لیکن وہ اس گھنی تاریکی میں روشنی کی کرن بن سکتے ہیں۔"

بادشاہ خاں کو پٹنہ شہر میں ہر مندر کے گوردوارے میں جو گرو گوبند سنگھ کی ولادت کی جگہ ہے بلایا گیا یہاں انھوں نے ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں کے ایک مشترک مجمع کو خطاب کرتے ہوئے کہا۔ "ہندوستان آج دیوانگی کا ایک جہنم نظر آتا ہے اور میرا دل یہ دیکھ کر روتا ہے کہ ہم اپنے ہاتھ سے اپنے گھروں کو آگ

لگا رہے ہیں آج مجھے ہندوستان پر تاریکی چھائی ہوئی نظر آتی ہے۔ میری آنکھیں روشنی کی تلاش میں ادھر ادھر بھٹکتی پھرتی ہیں۔ مگر وہ کہیں نظر نہیں آتی" انھوں نے کہا کہ وہ طاقت کی سیاست سے اُکتا گئے ہیں، اور انھیں نفرت کے سبق سے جو سارے ہندوستان میں پڑھایا جارہا ہے سخت تکلیف ہوتی ہے۔ ایک "خدائی خدمتگار" کی حیثیت سے انھیں صرف اس کا شوق ہے کہ دکھ بھرنے والی انسانیت کی خدمت کریں۔ جلسے کے ختم ہونے کے بعد ہندو، مسلمان اور سکھ اُن کے ساتھ ایک مسجد میں جو گوردوارے سے متصل ہے گئے اور ایک دوسرے کو سلام کرکے گلے ملے۔

بادشاہ خاں نے مونگیر میں ایک موقع پر یہ کہا "میں یہ سمجھتا ہوں کہ ہندوستان میں ایک ہی قوم رہتی ہے جس میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل ہیں۔ بعض صوبے ایسے ہیں جن میں ہندو ایک بہت چھوٹی سی اقلیت کی حیثیت رکھتے ہیں، اور بعض میں مسلمانوں کی یہی حیثیت ہے۔ جو کچھ یہاں ہوا ہے اگر یہی دوسری جگہ بھی ہو اور اکثریت اقلیت کو کچلنے اور قتل کرنے کی کوشش کرے تو پھر قوم کا خدا ہی حافظ ہے۔ پھر وہ ہمیشہ کے لیے غلام بن کر رہ جائیں گے۔"
اپنے خاص صاف گوئی کے انداز میں انھوں نے سب کو کھری کھری سنائی، کانگریسی وزیروں کو بھی نہیں چھوڑا، ظاہر ہے کہ ہندوستان کے قوم پروروں کو تنبیہہ کرنے کا ان سے زیادہ اور کسے حق تھا

انھوں نے کہا کہ صوبوں کی حکومتیں جو عوامی وزیروں کے ہاتھ میں ہیں، اتنی طاقت نہیں رکھتیں کہ بڑے جھگڑوں کو روک سکیں۔ انھوں نے مسلم لیگ سے بھی اپیل کی "میں آپ کو اس بات کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ اسلام سے زیادہ رواداری کی تعلیم دنیا میں اور کسی مذہب نے نہیں دی۔ اگر ہم سچے مسلمان بننا چاہتے ہیں تو ہمیں یہ حقیقت یاد رکھنی چاہئے اور انتہائی کوشش کرنی چاہئے کہ اپنے بھائیوں میں رواداری پیدا کریں.......... آج میں یہ دیکھتا ہوں کہ دوسرے فرقوں میں ہم سے زیادہ رواداری ہے، ہمیں اپنی اس کوتاہی کو دور کرنا چاہئے .... تاکہ ہم سچے مسلمان بن سکیں"

لیکن یہ ایک عام جنون کا زمانہ تھا اور ان کی آواز صدا بصحرا ثابت ہوئی۔ دسمبر ۱۹۴۶ء ہی میں بہار سے آتش زبان فتنہ پردازوں نے فرقہ وارانہ نفرت کی آگ صوبہ سرحد تک پہنچا دی تھی اور مارچ میں ضلع ہزارہ میں بدامنی پھیل گئی۔ اس لئے بادشاہ خاں کو بڑی عجلت میں اپنے صوبے میں واپس جانا پڑا۔ انھوں نے پشاور میں ایک بیان دیتے ہوئے کہا "شاید یہ ہمارے ملک کی تاریخ میں سب سے نازک وقت ہے۔ ساری فضا میں تشدد پھیل گیا ہے ہم میں سے بہت سے لوگ انسانیت سے گذر گئے ہیں ہم وحشی بن گئے ہیں" انھوں نے یہ وعدہ کیا کہ صوبہ سرحد میں اپنا سارا وقت اس کوشش میں صرف کریں گے کہ اپنے ہم مذہبوں کو صوبے کے اندر

بھی اور قبائلی علاقے میں بھی، وحشیانہ حرکتوں سے باز رکھیں مجھے مسلم لیگ سے یا یورپین افسروں سے کوئی عداوت نہیں ہے۔ میری تو بس یہ آرزو ہے کہ پٹھانوں کو اور کچھ انھیں پر موقوف نہیں بلکہ دنیا کی ساری قوموں کو غیروں کے تسلط سے آزاد دیکھوں۔"

انھوں نے بہار میں ساڑھے تین مہینے رہنے کے بعد پہلے عام جلسے میں کہا "میں ان لوگوں کو جو ہمارے پیارے ملک میں آگ لگا رہے ہیں، تنبیہہ کرتا ہوں کہ ان کی لگائی ہوئی آگ انھیں بھی بھسم کر دے گی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ عبادت گاہوں میں آگ لگانے سے .... اور بے گناہوں کو مارنے اور لوٹنے سے اسلام کی خدمت کیسے ہو سکتی ہے۔"

مگر ان کے مجروح دل کو اس سے بڑی تسکین ہوئی کہ مارچ کے فسادات میں خدائی خدمت گاروں نے ان کی ساری توقعات پوری کیں اور ان میں سے دس ہزار جو اپنے عہد کے سچے تھے اپنے مصیبت زدہ ہندو اور سکھ بھائیوں کی مدد کے لئے پہنچ کر ان کے جان و مال کی حفاظت کی۔

جتنا زیادہ وہ اس بات پر غور کرتے تھے کہ آخر بے گناہوں کے اس قتل اور خانماں بربادی کی اصل وجہ کیا ہے، اتنی ہی زیادہ ان کے دل کو تکلیف ہوتی تھی، مگر انھوں نے کبھی ہمت نہیں ہاری سب صحیح العقل عناصر کو تاکید کرتے رہے کہ وہ مایوس نہ ہوں

اور امن کی کوشش برابر جاری رکھیں ۔ انھوں نے ایک شلک سے جوان باتوں پر ہنستا تھا کہا " تم ہندو مسلم اتحاد سے مایوس کیوں ہو؟ کوئی کوشش جو سچے دل سے کی جائے بے کار نہیں جاتی ۔ ذرا اس کھیت کو دیکھو! جو بیج اس میں بویا جاتا ہے وہ کچھ عرصے تک زمین میں رہتا ہے اس کے بعد ایک دن پھوٹ نکلتا ہے اور اپنے وقت پر اپنے جیسے سینکڑوں دانے پیدا کرتا ہے ۔ یہی صورت ہر کوشش کی ہے جو کسی نیک مقصد کے لئے کی جائے " ۱۹۴۵ء میں رہا ہونے کے بعد سے وہ خدائی خدمت گاروں کی نئی تنظیم اور تہذیب نفس میں لگے ہوئے تھے ۔ اب انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ یہ نفس خدائی خدمت گاروں کی جماعتوں کو سارے صوبے میں دورے کے لئے بھیجیں تاکہ وہ بھٹکے ہوئے لوگوں کے ضمیر کو خدا کے اور انسانیت کے نام پر جگائیں اور انھیں ان کی غلطیوں کا احساس دلائیں ۔ انھوں نے کہا " مجھے یقین ہے کہ خدا اس مقدس مشن میں میری مدد کرے گا ، اور لوگ اس بات کو سمجھ جائیں گے کہ محبت سچائی اور عدم تشدد کی صفات ایک اچھی آزاد اور خوش حال سماج کی نشانیاں ہیں "

لیکن خدا کو انھیں ایک اور آزمائش میں ڈالنا منظور تھا برطانوی کیبنٹ کا جو ڈیلیگیشن ہندوستان آیا تھا اس نے اپنے ۱۵ مئی کے بیان میں اعلان کیا تھا کہ " صوبوں کے گروپ بنانا "

ان کی انتقالِ اختیارات کی اسکیم کا ایک لازمی جزو ہے اس اسکیم کے مطابق ہندوستان کے شمال مغرب اور شمال مشرق کے صوبے جن میں مسلمانوں کی اکثریت تھی الگ الگ گروپ بننے والے تھے اور یہ تجویز تھی کہ ہر ایک گروپ کے نمائندے ایک سیکشن میں جمع ہوں۔ یہ سیکشن گروپ کا آئین بنائے اور صوبوں کو یہ اختیار رہے کہ اگر چاہیں تو نئے آئین کے مطابق منتخب کیے ہوئے نمائندوں کی اکثریت سے اس گروپ سے الگ ہو جائیں۔ اس طرح صوبہ سرحد پنجاب، بلوچستان اور سندھ گروپ (ب) میں رکھے گئے تھے اور آسام اور بنگال گروپ (ج) میں۔ باقی سب صوبے گروپ (الف) میں۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ شمال مغرب اور مشرق میں مسلم اکثریت کے الگ علاقے بن جائیں تاکہ مسلم لیگ کا پاکستان کا مطالبہ عملی طور پر پورا ہو جائے۔ مگر اس میں خرابی یہ تھی کہ اگرچہ کیبنٹ مشن کی تجویز میں گروپ میں شامل ہونا اختیاری رکھا گیا تھا لیکن جو دفعہ گروپ بنانے کے بارے میں تھی اس کا نتیجہ عملاً یہ ہوتا کہ صوبہ سرحد کو اپنے نمائندوں کی مرضی کے خلاف گروپ (ب) میں شامل ہونا پڑتا جس پر دو قوموں کے نظریے کے حامی چھائے ہوئے تھے، حالانکہ خود صوبہ سرحد اس نظریے کو قطعی طور پر رد کر چکا تھا اور ہو سکتا تھا کہ یہ گروپ ایک ایسا آئین بنا تا کہ کسی صوبے کے لئے آگے چل کر گروپ سے الگ ہو جانا ناممکن ہو جاتا۔ لیکن کانگریس نے یہ سمجھ کر کہ اگر کسی صوبے

لوگ یہ طے کرلیں کہ وہ ایک خاص گروپ میں شریک نہیں ہوں گے تو کوئی انہیں مجبور نہیں کر سکتا۔ ۱۶ / مئی کی تجویز کو منظور کر لیا تھا مگر وہ ان دفعات کی جو گروپ بنانے سے تعلق رکھتے تھے یہ تعبیر کرتی تھی کہ صوبہ سرحد کے لوگوں کو یہ آزادی ہے کہ وہ اپنی قسمت کا جس طرح چاہیں فیصلہ کریں۔ خان بھائیوں کو گروپ بنانے کی تجویز کے سیاسی پہلو سے کوئی بحث نہ تھی۔ انھیں کسی ایسے گروپ میں شامل ہونے پر اعتراض نہ تھا جو پٹھانوں کو اپنی راہ پر چلنے کی پوری آزادی دے۔ جولائی ۱۹۴۶ء میں بادشاہ خان نے یہ کہہ دیا تھا مجھے پنجاب، سندھ اور بلوچستان والے گروپ میں شامل ہونے پر کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن میں ضرور کہتا ہوں کہ اس طرح کی شرکت سے پہلے ہمیں چاہیے کہ بھائیوں کی طرح سر جوڑ کر بیٹھیں اور ایک دوسرے کے شکوک دور کر کے اس بات کا یقین دلائیں کہ گروپ میں شامل ہونے سے ہر صوبے کو فائدہ ہوگا۔ بعض لوگ اسے مذہبی رنگ دیتے ہیں، یہ ٹھیک نہیں ہے۔ بھلا مذہب کو اس سے کیا تعلق ہے؟ یہ تو ایک معاشی مسئلہ ہے یعنی فائدے اور نقصان کا سوال ہے۔ زبردستی سے کام نہیں چل سکتا۔ آج کل باپ بھی بیٹے کو مجبور نہیں کر سکتا۔ اس کے علاوہ دوسرا اہم مسئلہ جو قابل توجہ ہے یہ ہے کہ ایسی حالت میں جب ہم پنجاب، سندھ اور بلوچستان سے ہر طرف سے گھرے ہوئے ہیں، ہندوستان سے ملنا کیوں کر ممکن ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے، ہم اور اپنے ہمسائے کو نظر انداز کر دیں اور

اسے چھوڑ کر دوسروں سے مل جائیں۔ اگر ہم کبھی کوئی گروپ بنائیں گے تو وہ صرف پنجاب، سندھ اور بلوچستان کے ساتھ مل کر بن سکتا ہے دوسرے صوبوں کے ساتھ نہیں، اس لئے کہ وہ سب صوبے جن میں ہندوؤں کی اکثریت ہیں ہم سے سینکڑوں میل دور ہیں۔

لیکن کیبنٹ ڈیلی گیشن کی تجویز ناکام رہی اور ۲۰ر فروری ۱۹۴۷ء کو مسٹر ایٹلی نے دارالعوام میں یہ اعلان کیا کہ اگر کیبنٹ ڈیلی گیشن کی ۱۶ر مئی والی تجویز کے مطابق اختیارات کو منتقل کرنے اور آئندہ آئین بنانے پر دونوں بڑی پارٹیاں متفق نہ ہوئیں تو برطانوی حکومت کو یہ سوچنا پڑے گا کہ جب وہ ہندوستان کو چھوڑے تو اختیارات کس کے سپرد کرے اور کیسے کرے؟ اشارتاً یہ بھی کہہ دیا گیا کہ جن صوبوں کی نمائندگی آئین ساز اسمبلی میں پوری طرح نہ ہوگی ممکن ہے کہ وہاں اختیارات اُس حکومت کو منتقل کردئے جائیں جو اس وقت موجود ہو۔ اس کے معنی یہ تھے کہ صوبہ سرحد میں اختیارات اس حکومت کی طرف منتقل ہوتے جس کے صدر ڈاکٹر خان صاحب تھے چنانچہ دو قوموں کے نظریے کے حامیوں نے اُس حکومت کو توڑنے میں اپنا سارا زور لگا دیا اور ظاہر ہے کہ اس کے لئے سب سے آسان ترکیب یہ تھی کہ فرقہ وارانہ جذبات کو بھڑکایا جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پہلے مارچ اور پھر اپریل میں ہزارہ اور صوبے کے بعض اور حصوں

میں پھر ہندوؤں اور سکھوں کے خلاف بڑے پیمانے پر فساد کھڑا کر دیا گیا۔ اس کے بعد آسام اور پنجاب کی طرح یہاں بھی ڈاکٹر خان صاحب کی وزارت کے خلاف "ڈائرکٹ ایکشن" شروع ہو گیا۔

مارچ ۱۹۴۷ء میں لارڈ ویول کی جگہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن وائسرائے ہو کر ہندوستان پہنچے۔ اپریل ۱۹۴۷ء میں وہ صوبہ سرحد آئے۔ اس موقع پر مسلم لیگ کے والنٹیروں کا ایک مظاہرہ کیا گیا اور گورنر انھیں اس جماعت کی ریلی دیکھنے کے لئے لے گئے۔ جو خود اُن کے وزیروں کے خلاف شورش برپا کر کے قانون کی خلاف ورزی کر رہے تھے۔ ایک صوبے کے حاکم کے لئے ایسی حرکت کرنا ایک عجیب بات تھی۔

گورنر نے ایک اور عجیب حرکت کی انھوں نے وائسرائے کو اس پر آمادہ کرنا چاہا کہ صوبہ سرحد میں دفعہ ۹۳ نافذ کر دیں اور نئے سرے سے انتخاب کرائیں۔ وہ اس پر بھی اُتر آئے کہ صوبے کے کیبنٹ کے ایک جلسے کی جو لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے قیام کے دوران میں ہوا تھا غلط اور مسخ کی ہوئی رپورٹ وائسرائے کو بھیجی اور وزیر اعظم کی بھیجی رپورٹ کو روک دیا۔ بعد میں یہ رپورٹ براہ راست دہلی بھیجی گئی۔

بات یہ ہے کہ صوبہ سرحد کے بڑے برطانوی افسر چاہتے تھے کہ اس طاقت میں سے جو ان کے ہاتھ سے نکلی جا رہی تھی جتنی بھی بچ سکے بچا لیں، اور اس کی صورت یہ تھی کہ اسے اپنی منظور نظر اور

اور "تاریخی حلیف" مسلم لیگ کے حوالے کر دیں جو اب پھر اُٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ ادھر برطانوی کیبنٹ کو بھی جو دل سے یہ چاہتی تھی کہ ہندوستان کو برطانیہ کے تسلط سے آزاد کر دے۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ ہندوستان کی ایسی تقسیم کرے جو مسلم لیگ کے لئے قابلِ قبول ہو۔ اور اس کے لئے یہ ضروری تھا کہ صوبہ سرحد طوعاً کرہاً مسلم لیگ کے ہاتھ میں دے دیا جائے۔ ہمیں برطانیہ کے تعلقوں کی توہین مقصود نہیں۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ برطانوی کیبنٹ اور مقامی برطانوی افسروں کے بیچ میں صوبہ سرحد مفت میں مارا گیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ انصاف کو مصلحت پر قربان کر دیا گیا۔

لپنے بہار کے قیام کے زمانے میں بادشاہ خاں سنجیدگی سے اس پر غور کر رہے تھے کہ وہ سیاست سے بالکل الگ ہو جائیں۔ سیاسی میدان میں جو تنگ نظری اور خود غرضی نظر آتی تھی اس سے اُن کی طبیعت کراہت کرتی تھی۔ لیکن صوبہ سرحد کے حالات نے انھیں اپنے فیصلے کو بدلنے پر مجبور کیا۔ انھوں نے سوچا کہ ایسے وقت میں پبلک لائف سے ہٹنا گویا پٹھانوں کو منجدھار میں چھوڑ دینا ہوگا۔ مہمند قبیلے کے ایک مجمع میں تقریر کرتے ہوئے انھوں نے کہا "ہم نازک دور سے گذر رہے ہیں۔ انگریز اور اُن کے پٹھو اس خیال سے پریشان ہیں کہ اُن کے ہاتھ سے طاقت نکلنے والی ہے لوگ تمھیں اسلام کے نام سے گمراہ کرتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔ میں اپنا فرض سمجھتا ہوں۔

کہ تمھیں آنے والے خطروں سے آگاہ کردوں تاکہ میں قیامت کے دن خدا کے سامنے شرمندہ نہ ہوں .... مجھے کسی طرح چین نہیں آتا"۔ گورنر کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا" میں دہلی گیا تھا اور مجھے اچھی طرح سے معلوم ہے کہ وہی شخص جو جرگے میں تم سے ملتا ہے اور تمھارے دوست ہونے کا دعوےٰ کرتا ہے۔ تمھارے خلاف رپورٹیں بھیجتا رہا ہے اور دہلی کی حکومت سے اصرار کرتا رہا ہے کہ وہ بمبار ہوائی جہازوں کو تیار رکھے تاکہ وہ تم پر ہلاکت اور تباہی کی بارش کریں۔ اب کے جو وہ جرگے میں آئیں تو اُن سے پوچھنا کہ وہ سچ ہے یا نہیں۔ اگر وہ انکار کریں تو انھیں میرا سامنا کرنے دو اور میں اپنے الزام کا پورا ثبوت دوں گا

انھوں نے کہا کہ حال میں سر اولف کیرو نے سرحد کے وزیر اعلیٰ سے کہا تھا یاد رکھو کہ تمھارے اور ہندوستان کے درمیان کوئی چیز مشترک نہیں۔ اگر تم کانگریس کو چھوڑ دو تو میں پوری طرح تمھارا ساتھ دوں گا۔

انھوں نے لوگوں سے پوچھا کہ آخر سر اولف کیرو سرحد میں نئے انتخابات کیوں چاہتے ہیں؟ ۱۹۴۶ء کے انتخابات میں جو خاص پاکستان کے مسئلے کی بنیاد پر لڑے گئے تھے، کانگریس نے ۵۰ نشستوں میں سے ۳۲ نشستیں جیت لی تھیں۔ ان میں ۲۸ مسلم نشستوں میں سے ۲۱ اور ۹ کی ۹ ہندو نشستیں اور تین میں سے دو سکھ نشستیں

شامل تھیں۔ ان کے مخالفوں نے جو ۱۷ مسلم نشستیں حاصل کی تھیں ان میں سے گیارہ ہزارہ ضلع کی تھیں جو پشتو بولنے والوں کا علاقہ نہیں ہے۔" سر اولف کا منشا صاف ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ طاقت اپنے ٹوڈیوں اور پٹھوؤں یعنی خانوں، نوابوں اور چند افسروں کے ہاتھ میں دے دیں جنھوں نے ان سب تحریکوں میں جو خدائی خدمت گاروں نے برطانیہ کے خلاف چلائی تھیں، انگریزوں کی مدد کی ہے انتقالِ اختیارات کے وقت گورنر کیرو کو یہ فکر ہے کہ حکومت انھیں انگریزوں کے دوستوں کے سپرد کریں۔ نئے انتخابات کے اس کے سوا اور کوئی معنی نہیں ہو سکتے۔ اس لئے کہ ابھی سال بھر پہلے پٹھانوں نے ان انتخابات میں جو پاکستان کے مسئلے کی بنیاد پر ہوئے تھے۔ اپنی رائے صاف صاف ظاہر کر دی تھی۔ پٹھانوں نے بہت بڑی اکثریت کے ساتھ خدائی خدمت گاروں کو منتخب کیا تھا۔"

یہ بد دیانتی ہوگی کہ مسلم لیگ کی فرقہ وارانہ تحریک کو جس کے پیرو جرائم کے مرتکب ہوئے ہیں، ایک سیاسی تحریک کی حیثیت دی جائے۔"

یہ بات بادشاہ خان نے اس لئے کہی کہ گورنر دلیل پیش کر رہا تھا کہ جو پرتشدد مظاہرے سارے صوبوں میں ہوئے ہیں ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ لوگوں کو وزارت پر اعتماد نہیں ہے۔ بادشاہ خان نے اس بات کی طرف توجہ دلائی کہ اگر گورنر اپنا فرض ادا کرتا تو وہ

خون ریزی کو روک سکتا تھا۔ ۱۹۳۷ء میں ایک سرپھرے پٹھان نے ایک برطانوی افسر پر گولی چلائی تو ۴۸ گھنٹے کے اندر مجرم گرفتار بھی ہوگیا اور اُسے پھانسی کی سزا بھی دے دی گئی۔ جب مس ہولی الیس کو اغوا کیا گیا تھا اور ان کو چھوڑا گیا تھا تو ٹوری پارٹی کے ایک ممتاز اخبار نے لکھا کہ یہ واقعہ اس کی مثال ہے کہ ایک برطانوی عورت کی عزت کی حفاظت کے لئے برطانوی سلطنت کے سارے وسائل سے کام لیا جاتا ہے۔ جنگ کے دوران میں چھ سال تک جبکہ انگریز خود مشکل میں گرفتار تھے، قبائلی علاقے میں کوئی جھگڑا نہیں ہوا، چونکہ انگریز امن چاہتے تھے، اس لئے امن رہا، اور اب سینکڑوں آدمی قتل کر دئے گئے۔ ہزاروں بچے یتیم ہو گئے اور بہت سے گھر اُجڑ گئے۔ مگر سرحد کے برطانوی حکام چپ چاپ تماشہ دیکھتے رہے، اور انھوں نے اس بدامنی کو روکنے کے لئے وہ سخت کارروائی جو اُن کے وزیر چاہتے تھے نہیں کی۔ بلکہ اس بدامنی کی بنا پر انھوں نے ان وزیروں کو ہٹا دینے کا مطالبہ کیا۔ حالانکہ انھیں رائے دہندوں کی بہت بڑی اکثریت نے منتخب کیا تھا، اور اب تک آئین ساز اسمبلی میں ان کی اکثریت تھی۔

بادشاہ خان نے مسلم لیگیوں سے پرجوش اپیل کی "خدائی خدمت گاروں کے ساتھ ایک مشترک جرگہ کرکے ان مختلف مسائل پر غور کریں جو انگریزوں کے ہندوستان سے جانے کے بعد پیدا ہوں

گے ...."اب جبکہ انگریز جا رہے ہیں ان کو ہمارے ساتھ ایک جرگے میں بیٹھنا چاہیے۔ اگر وہ بھائیوں کی طرح ہم سے ملیں اور اپنے تشدد کے طریقے چھوڑ دیں تو ہم آج بھی اپنے اختلافات کو دور کر سکتے ہیں۔ میں ہر باعزت سمجھوتے کو جو ہم آپس میں کریں منظور کر لوں گا، اگر واقعی دل سے کیا جائے۔ مسلم لیگ والوں کو ہندوؤں کے تسلط کا ڈر ہے اور ہمیں انگریزوں کے تسلط کا۔ بہتر ہے کہ ہم دونوں مل کر ایک دوسرے کو سمجھائیں۔ ہم تو اُن کا خوف دور کرنے کے لئے تیار ہیں۔ لیکن میں یہ پوچھتا ہوں کہ کیا وہ بھی ہمارا خوف دور کر دیں گے۔"

جون ۱۹۴۷ء میں انھوں نے پھر سمجھوتے کی کوشش کی۔ انھوں نے لیگیوں سے کہا کہ وہ پاکستان میں شامل ہونے پر تیار ہیں۔ اگر:

(۱) باعزت شرطوں پر سمجھوتا کیا جائے۔

(۲) اس صورت میں کہ پاکستان آزادی کے بعد برطانیہ کے تسلط میں رہنا چاہے تو آئینی اضلاع اور قبائلی علاقے کے پٹھانوں کو یہ اختیار ہوگا کہ وہ اس ڈومنین سے الگ ہو کر ایک آزاد ریاست بنا لیں۔

(۳) ان سب معاملات کا جو قبائلیوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ فیصلہ خود پٹھان کریں اور اس میں غیر پٹھانوں کا کوئی دخل نہ ہو جیسا کہ موجودہ آئین ساز اسمبلی نے منظور کیا ہے۔

یہ پیش کش ٹھکرا دی گئی اور پاکستان بن گیا۔ تقسیم کی تجویز میں یہ بھی شامل تھا کہ صوبہ سرحد میں اس مسئلے پر عام رائے شماری کی جائے کہ وہ کس کے ساتھ شامل ہوگا یہ ناانصافی کی بات تھی۔ بلوچستان میں تو عام رائے شماری کی جگہ عوام کے نمایندوں کی ایک جماعت گھڑ لی گئی اور سرحد میں جہاں عوامی نمایندوں کی جماعت پہلے سے موجود تھی۔ اس کے فیصلے سے بچنے کے لئے یہ چال کی گئی کہ ایک غلط سوال پر عام رائے شماری کی گئی۔ خان بھائیوں نے کہا کہ یہ سوال کہ سرحد ہندوستان میں شامل ہوگا یا پاکستان میں پہلے ہی ختم ہو گیا ہے۔ اس لئے کہ اصولاً کانگریس اور مسلم لیگ دونوں نے تقسیم کی تجویز مان لی ہے اور صوبہ سرحد جغرافی لحاظ سے باقی ہندوستان سے بالکل الگ ہے وہ عام رائے شماری سے نہیں ڈرتے تھے مگر یہ چاہتے تھے کہ وہ اس سوال پر ہو کہ کیا پٹھان اپنے علاقے میں خود مختار حکومت چاہتے ہیں۔ بادشاہ خان کہتے تھے کہ پٹھان یہ چاہتے ہیں کہ پاکستان کی ریاست کے اندر ایک خود مختار پٹھانستان ہو جس میں پٹھانوں کو اپنے معاملات خود طے کرنے کی آزادی ہو۔

پٹھان پچھلی تاریخ کی بنیاد پر اس کے سخت مخالف تھے کہ ان پر میدانی علاقے کے لوگوں کا تسلط ہو، اور بادشاہ خاں کا خیال تھا کہ پاکستان میں شامل ہونے سے پنجابی مسلمان سرمایہ دار پٹھانوں پر حاوی ہو جائیں گے۔ انھوں نے ایک بیان میں جو اخباروں کو دیا تھا یہ کہا "ہمارے صوبے پر پنجابی چھا گئے ہیں

اور وہ پٹھانوں کو آپس میں لڑوانے کی پوری کوشش کر رہے ہیں۔ پنجاب کے نوابوں اور بڑے سرمایہ داروں نے صوبے کی فرقہ واری تقسیم کے بعد پنجاب کا ایک بڑا حصہ کھو دیا ہے، اور اس کی تلافی کے لئے وہ اب ہمارے صوبے پر قبضہ کرنے کی فکر میں ہیں۔" اس اعتراض کے جواب میں کہ پٹھانستان کا علاقہ اپنی معاشی ضرورتوں کو خود پورا نہیں کر سکے گا۔ انھوں نے اپنے خاص انداز میں کہا "یہ غلط ہے کہ پٹھانستان ایک خسارے کی ریاست ہوگی۔ اس وقت ہمارا نظم و نسق سرمایہ داری طرز کا ہے جس میں حکام کو بہت بڑی بڑی تنخواہیں ملتی ہیں۔ اکیلے گورنر پر ایک لاکھ روپیہ خرچ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اور برطانوی حکام ہیں جو ہمارے صوبے کی آمدنی کا ایک ایک بڑا حصہ لے جاتے ہیں۔ اگر ہم اس فضول خرچی کو ختم کر دیں اور جو رقم بچے اُسے ایسی اسکیموں پر صرف کریں جس سے پیداوار میں اضافہ ہو تو ہم یقیناً اپنا خرچ پورا کر لیں گے۔ اگر ہماری آزادی برقرار رہے تو ہم پھونس کی جھونپڑیوں پر اور سوکھی روٹی پر قناعت کریں گے اور اسے اس پر ترجیح دیں گے کہ غلام بن کر محلوں میں رہیں۔"

ایک اور موقع پر انھوں نے اعلان کیا "ہم میں اور مسلم لیگ میں پاکستان اور آزاد پٹھانستان کے مسئلے پر رائے شماری کا مقابلہ ہو جائے۔ اگر عوام اس مقابلے میں پاکستان کے حق میں

رائے دیں تو میں پہلا آدمی ہوں گا جو پاکستان کی حمایت کرے گا۔"
ان پر یہ الزام لگایا گیا کہ وہ افغانستان کے ہاتھوں میں کھیل رہے ہیں۔ ایک ایسے شخص پر جس کی جان اپنی قوم کی آزادی میں اٹکی ہوئی تھی۔ یہ الزام صریحی طور پر غلط اور مضحکہ خیز تھا۔ خود گاندھی جی کو جنھوں نے خاموشی اختیار کرلی تھی اس لیے بنیاد پروپاگنڈا کی وجہ سے اس شخص کی حمایت میں مہر خاموشی توڑنی پڑی جس کے متعلق وہ جانتے تھے کہ سچائی اور دیانت داری کی جان ہے۔

انھوں نے تیسری جولائی کو جو ان کا ہفتے کا خاموشی اور مشاہدۂ نفس کا دن تھا۔ پرا تھنا کے بعد ایک لکھے ہوئے پیام میں کہا "بادشاہ خاں اور ان کے رفیق کار اسے پسند نہیں کرتے کہ ان سے ہندوستان اور پاکستان میں انتخاب کرنے کو کہا جائے جسے زبردستی ہندوؤں اور مسلمانوں میں انتخاب کرنے کے معنی پہنائے جاتے ہیں۔ اسی لیے خدائی خدمت گار اپنے ووٹ استعمال نہیں کریں گے۔ بادشاہ خاں پر یہ الزام لگایا جارہا ہے کہ پٹھانستان کا نعرہ بالکل نیا ہے۔ لیکن جہاں تک مجھے معلوم ہے کانگریس کی وزارت قائم ہونے سے بھی پہلے بادشاہ خاں کا یہ خیال تھا کہ پٹھانوں کو اندرونی معاملات میں خود محتاجی حاصل ہو۔ وہ کوئی نئی ریاست قائم کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اگر انھیں اپنا مقامی آئین بنانے کا حق دیا جائے تو وہ خوشی سے دونوں ریاستوں میں سے ایک میں شامل ہونے کا فیصلہ کرلیں گے۔

پٹھانوں کی اس آزادی کی آرزو پر جو اعتراض کیا جاتا ہے اس کا سمجھنا میرے لئے مشکل ہے۔ ہاں اگر اس کا مقصد پٹھانوں کو ذلیل کرنا اور انھیں زبردستی محکوم بنانا ہو تو اور بات ہے۔ اس سے زیادہ سنگین الزام یہ ہے کہ بادشاہ خان افغانستان کے ہاتھوں میں کھیل رہے ہیں۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ ان میں تو اس قسم کی ریشہ دوانیوں کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔ وہ اس کو ہرگز گوارا نہیں کریں گے کہ صوبہ سرحد افغانستان میں شامل ہو جائے۔"

گاندھی جی نے آگے چل کر کہا "اُن کے دوست کی حیثیت سے اور دوست ہونے کی وجہ سے میں ان کی ایک کمزوری کا اعتراف کرتا ہوں۔ انھیں برطانیہ کے دعووں اور ارادوں کے بارے میں بہت شبہ ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ سب لوگ اس خامی کو جو صرف انھی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے نظر انداز کر دیں۔ یہ ضرور ہے کہ ان جیسے بلند پایہ لیڈر کو یہ بات زیب نہیں دیتی۔ پھر بھی اگر چہ میں نے اسے خامی کہا ہے، اور ایک لحاظ سے ہے بھی، دوسرے لحاظ سے اسے خوبی کہہ سکتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ اگر کوشش بھی کریں تو اپنے دلی خیالات کو چھپا نہیں سکتے۔ یہ ان کی دیانت داری کی دلیل ہے۔"

چنانچہ رائے شماری ہوئی[۵] ۔ خدائی خدمت گاروں اور اُن کے

---

[۵] ہزارہ میں رائے شماری سے پہلے جو "ایب دھوا" تھی اس کا اندازہ ایک (بقیہ اگلے صفحہ پر)

حامیوں نے اس میں حصہ نہیں لیا۔ رائے شماری کے بعد یہ اعلان کر دیا گیا کہ صوبہ سرحد پاکستان کا ایک حصہ ہے لیکن بادشاہ خان (۱)

(بقیہ بسلسلہ صفحہ ۳۱۹) صاحب کے شائع کئے ہوئے بیان سے ہوگا جو ضلع ہزارہ کی طرف سے اسمبلی کے ممبر تھے:۔

"میں وزارت کو متنبہ کرتا ہوں کہ اگر کوئی وزیر ضلع ہزارہ میں کانگریس کا پروپیگنڈا کرنے کے لئے آنے کی کوشش کرے گا تو وہ قتل کر دیا جائے گا۔" یہ الفاظ ضلع ہزارہ کے ممبر اسمبلی خان جلال الدین نے ایبٹ آباد میں ایک جلسے میں کہے جو لوگوں کو پاکستان کی تائید پر آمادہ کرنے کے لئے کیا گیا تھا۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ جو ہندو اور سکھ ہزارہ میں واپس آنا چاہتے ہیں انھیں اگر اس ضلع میں چین سے رہنا ہو تو یہ اعلان کر دینا چاہیے کہ پاکستان کی پوری طرح تائید کریں گے اور اس اعلان کی ایک کاپی لیگ کے دفتر میں بھیج دینا چاہیے۔

ہندوستان ٹائمز ۳ر جولائی ۱۹۴۷ء

رائے شماری کے نتیجے سے یہ ظاہر ہوا کہ ۵۷۲۷۸۸ ووٹوں میں سے مسلم لیگ کو ۲۸۹۲۴۴ ووٹ ملے۔ اگر کل ووٹوں میں سے ۸۴۷۸۱ مسلمانوں کے ووٹ منہا کر دیئے جائیں جنھوں نے انتخاب میں حصہ نہیں لیا تو ۱۹۸۲۷۳ یعنی چالیس فیصدی آدمی باقی رہ جاتے ہیں جنھوں نے پاکستان کے حق میں ووٹ نہیں دیا غیر پٹھان رائے دہندوں کو جن کی ضلع ہزارہ اور بعض شہروں میں اکثریت تھی چھوڑ کر دیکھا جائے تو غالباً پاکستان کے حق میں رائے دینے والوں سے کہیں زیادہ نکلیں گے۔

کے نزدیک لڑائی ہاری نہیں گئی تھی ، وہ تو ابھی شروع ہوئی تھی اب تک تو ان کا مقابلہ انگریزوں سے تھا جو بدیسی تھے۔ اب حکومت اُن کے بھائیوں کے ہاتھ میں تھی اگر وہ ان سے انصاف کی امید نہ کرتے تو اور کس سے کرتے ؟ جو لڑائی وہ سالہا سال سے لڑ رہے تھے اس کا مقصد یہ نہیں تھا کہ ایک جوا گردن سے اتار کر دوسرا رکھ لیں۔ تقسیم کے بعد بھی ڈاکٹر خان صاحب کی وزارت قائم تھی یہ اتنی مضبوطی سے جمی ہوئی تھی کہ اسے آئینی طریقے سے اکھاڑنا ناممکن تھا۔ اسی لئے ۲۱ اگست ۱۹۴۷ء کو قائد اعظم نے اسے اپنے حکم سے برخاست کر دیا۔ تیسری اور چوتھی ستمبر کو سرداریاب میں ایک مجمع سے خطاب کرتے ہوئے جو صوبائی جرگوں پارلیمنٹری پارٹی، ظلمے پختون (نوجوان پٹھانوں کی جماعت) خدائی خدمت گاروں اور قبائلی علاقوں پر مشتمل تھا۔ بادشاہ خان نے ایک بار اور اپنے پٹھانوں کے مطالبے کی تشریح کی اور اس کے معنی یہ بتلائے کہ پٹھانوں کو پاکستان کے اندر اپنے اندرونی معاملات میں پوری آزادی ہو۔ اس جلسے میں جو رزولیوشن پاس ہوئے ان میں سے ایک کے الفاظ یہ تھے "نئی ریاست صوبہ سرحد کے چھ آئینی اضلاع اور پٹھانوں کے ان متصل علاقوں پر مشتمل ہوگی جو اپنی خوشی سے اس میں شامل ہوں۔ یہ ریاست دفاع ، امور خارجہ اور مواصلات کے بارے میں پاکستان کے ڈومینین سے معاہدہ کرے گی "

بادشاہ خاں نے اپنی تقریر کے دوران میں کہا" میں ساری عمر پٹھانستان قائم کرنے کی کوشش کرتا رہا ہوں۔ خدائی خدمت گاروں کی تنظیم سنہ ۱۹۳۰ء میں اسی غرض سے شروع کی گئی کہ پٹھانوں کو متحد کیا جائے۔ میرے اصول اب بھی وہی ہیں جو سنہ ۱۹۳۰ء میں تھے۔ اسی لئے میرا راستہ بالکل صاف ہے۔ اسے ہرگز نہیں چھوڑوں گا چاہے میں دنیا میں اکیلا ہی کیوں نہ ہوں"۔ لیکن خدائی خدمت گاروں کو بدنام کرنے اور ستانے کی مہم جاری رہی۔ بادشاہ خاں رائے عامہ کو پٹھانستان کے نصب العین کی حمایت کے لئے تیار کرنے کی ان تھک کوشش کرتے رہے۔ جنوری سنہ ۱۹۴۸ء میں گاندھی جی جو اتنے سال سے اہنسا کی راہ میں اُن کی رہنمائی کر رہے تھے قاتل کی گولی کھا کر شہید ہو گئے اور سرحدی گاندھی پٹھانوں میں عدم تشدد کا خطرناک تجربہ کرنے کے لئے جو اب تک دونوں مل کر کرتے رہے تھے اکیلے رہ گئے۔ گاندھی جی کی شہادت کے بعد کے چند مہینوں میں بادشاہ خاں کی عظمت اور بلندی اس طرح ظاہر ہوئی جیسے پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔

فروری میں انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ کراچی جا کر ڈومنین پارلیمنٹ کے جلسے میں شریک ہوں۔ خاص طور پر اس مقصد کے لئے کہ جو غلط فہمی اُن کے خلاف ایک منظم پروپاگنڈے کے ذریعے سے پاکستان کے مسلمانوں میں پیدا کی گئی ہے اُسے دور کریں۔ کئی پرزور بیانوں میں

جو انھوں نے اخباروں میں شائع کئے، پٹھانستان کے بارے میں اپنے خیالات صاف صاف ظاہر کر دیئے۔

انھوں نے بتایا کہ پٹھانستان یا پختونستان، پاکستان کے اندر ایک خود مختار علاقہ ہوگا۔ وہ پٹھانوں کے لئے ہوگا، جیسے سندھ سندھیوں کے لئے، پنجاب پنجابیوں کے لئے اور بنگال بنگالیوں کے لئے۔ شمال مغربی سرحدی صوبہ، انگریزوں کا گھڑا ہوا نام ہے اور اُسے اب باقی نہیں رہنا چاہئے۔

انھوں نے اس الزام کو بالکل بے بنیاد قرار دیا کہ وہ پٹھانستان کی ایک آزاد ریاست بناکر پاکستان میں رخنہ ڈالنا چاہتے ہیں خود یہ بات کہ وہ پاکستان کے دستور کی وفاداری کا حلف اُٹھا چکے تھے اس الزام کی تردید کے لئے کافی تھی۔ انھوں نے اپنے مطالبے کی وجوہ سمجھاتے ہوئے کہا کہ سرحد کے لوگ سیاسی حیثیت سے پس ماندہ ہیں اور زیادہ تر غریب طبقے اور متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں ان میں سرمایہ داروں کا طبقہ نہیں ہے۔ درآں حالیکہ پاکستان میں دولت مند زمیندار، سرمایہ دار اور اونچے طبقے والے چھائے ہوئے ہیں، جو پالیسی پاکستان پٹھانوں کے بارے میں اختیار کر رہا ہے وہ انگریزوں کی "لڑاؤ اور حکومت کرو" کی پالیسی سے بھی بدتر ہے۔ انگریز حکمراں پٹھانوں کے حوصلے کو اتنا پست نہیں کرسکے تھے جتنا کہ اب پاکستان کے حکام نے کر دیا ہے۔

انھوں نے اس سوال کا کہ آیا اُن کی تنظیم کو فقیرا یپی سے کوئی تعلق ہے نفی میں جواب دیا۔ انھوں نے اس پر زور دیا کہ اس قسم کے سب بیانات بالکل غلط ہیں اور اُن کے دشمنوں کے پھیلائے ہوئے ہیں۔

انھوں نے اس سے بھی انکار کیا کہ ان کی تنظیم پٹھانستان کے معاملے میں افغانستان سے کسی قسم کا علاقہ رکھتی ہے۔ ان میں اور افغانستان کے لوگوں میں اس کے سوا کوئی تعلق نہیں کہ دونوں ایک نسل سے ہیں اور خون کے رشتے سے وابستہ ہیں۔

بادشاہ خاں نے یہ بھی کہا کہ افغانستان کی حکومت نے پٹھانوں کو حق خود اختیاری ملنے کے متعلق جو کچھ کیا ہو یا افغانستان اور پاکستان میں دوسرے مسئلوں کے بارے میں جو اختلاف ہو اس سے ان کو کوئی واسطہ ہے اور نہ انھیں اس کا علم ہے یہ دونوں حکومتوں کا اپنا معاملہ ہے۔

انھوں نے اس الزام کی پر زور تردید کی کہ پٹھانستان کا مطالبہ صوبہ داری جذبہ پر مبنی ہے اور اسلامی برادری کی روح کے منافی ہے۔ انھوں نے کہا "اسلام کا جوہر مساوات ہے نہ کہ ایک کا دوسرے پر تسلط۔ ہم پٹھان لوگ نہ تو دوسروں کے حقوق غصب کرنا چاہتے ہیں اور نہ یہ چاہتے ہیں کہ دوسرے ہمارے حقوق غصب کریں۔ پاکستان میں چار جماعتیں ہیں۔ پٹھان، بنگالی،

پنجابی اور سندھی ۔ ہم سب آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ ہماری خواہش یہ ہے کہ ان میں سے کوئی دوسرے کے معاملات میں مداخلت نہ کرے۔ سب کو کامل خود اختیاری حاصل ہو۔ اگر ایک دوسرے سے مدد چاہے تو اسے ضرور دینا چاہیے"۔

جب ان سے پوچھا گیا کہ کیا اس سے پاکستان کمزور نہیں ہو جائے گا تو انھوں نے جواب دیا کہ نہیں بلکہ اس طرح مختلف حصے اپنی خوشی سے ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں گے۔ انھوں نے کہا "میں نے قائداعظم جناح سے درخواست کی کہ وہ پٹھانوں کو ایک مضبوط قوم بننے دیں تاکہ وہ اپنی حفاظت اور پاکستان کے مسلمانوں کی حفاظت کر سکیں اور انسانیت کو فائدہ پہنچا سکیں۔ میں انسانیت کا ایک ادنےٰ خادم ہوں"۔

اس سوال کے جواب میں کہ کیا وہ پٹھانستان کے سوال پر رائے شماری چاہتے ہیں اور اگر ایسا ہے تو انھوں نے پچھلی رائے شماری کا بائیکاٹ کیوں کیا۔ بادشاہ خاں نے کہا کہ "بائیکاٹ اس لئے کیا گیا کہ یہ رائے شماری غلط مسئلے پر کی گئی تھی اور اس کا طریقہ نامناسب تھا۔ اب رائے شماری کا کوئی سوال نہیں بلکہ وہ یہ چاہتے ہیں کہ پاکستان سے براہِ راست گفت و شنید کر کے معاملہ طے کر لیں۔

ان سے پوچھا گیا کہ کیا آپ کو یہ اندیشہ نہیں کہ گاندھی جی کی

وفات کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں کی حالت بدتر ہو جائے گی۔ بادشاہ خاں نے اس کی سختی سے تردید کی اور کہا "جب تک ہندوستان میں وہ بڑے بڑے لیڈر زندہ ہیں جو گاندھی جی کے اصولوں کے پیرو ہیں جیسے پنڈت نہرو، بابو راجندر پرشاد اور کئی حضرات، اس وقت تک ہندوستان مسلمانوں کو ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ اُن کی حالت ہرگز خراب نہیں ہوگی"۔

اس بات کی مثال کے طور پر انھیں کس کس طرح ستایا گیا۔ انھوں نے یہ واقعہ بیان کیا کہ جنوری کے مہینے میں ایک نوعمر لڑکا جو خدائی خدمتگار تھا آکر اُن کے پاس ٹھہرا۔ اس کے پاس ایک پستول تھا تاکہ اس بدامنی کے زمانے میں ضرورت کے وقت اپنی حفاظت کر سکے۔ پستول لڑکے کے چچا کا تھا اور ان دونوں نے یہ بیان دیا کہ بادشاہ خاں کو اس پستول سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ انھیں اس کا علم بھی نہیں۔ پھر بھی بادشاہ خاں مجرم قرار دیے گئے، اور ان کو یہ سزا دی گئی کہ یا تو دو روپے جرمانہ ادا کریں یا عدالت کے برخاست ہونے تک قید رہیں۔ ظاہر ہے کہ انھوں نے جرمانہ ادا کرنے سے انکار کیا۔

آخر میں انھوں نے عدم تشدد پر کامل اور غیر مشروط یقین کا اظہار کیا "میں ایک عملی آدمی ہوں، اور ہر بات کا اندازہ اس کے نتائج سے کرتا ہوں۔ فی الحال میں انتظار کروں گا اور واقعات کی

رفتار کو دیکھتا رہوں گا۔ اپنے ہر عمل میں میں عدم تشدد کا پابند رہوں گا۔ جو میری زندگی کا لنگر ہے۔"

۲۰ مارچ ۱۹۴۸ء کو سب کی آنکھیں ان کی طرف لگی ہوئی تھیں جب انھوں نے پاکستان کی ڈمینین پارلیمنٹ میں تحریک پٹھانستان کی تشریح کی اور بڑے جوش کے ساتھ یہ اپیل کی کہ رواداری سے اور اسلام کی تعلیم کے مطابق اخوت اور مساوات سے کام لیا جائے تاکہ پاکستان مضبوط اور خوش حال ہو۔

عام نظم و نسق کی بحث کے سلسلے میں احتجاج کے طور پر تخفیف کی تجویز پیش کرتے ہوئے انھوں نے کہا " آزادی کے بعد چھ مہینے میں پاکستان کے نظم و نسق میں بدیسی حکومت اور نوکرشاہی کا رنگ اس سے بھی زیادہ گہرا ہو گیا تھا جیسا کہ برطانوی حکومت کے بدترین زمانے میں تھا۔ اس میں اور ہندوستان کی حالت میں ایک نمایاں تضاد ہے۔ وہاں کم سے کم ہندوستانی گورنروں کی تعداد بہت زیادہ ہے اور تقریباً سارا نظم و نسق ہندوستانیوں کے ہاتھ میں ہے۔ پاکستان کی حکومت کو عوام کی خدمت کی طرف زیادہ توجہ کرنی چاہیے اور فنی ماہروں کے سوا بدیسیوں کو بالکل نہیں رکھنا چاہیے۔"

یہ رائے ظاہر کرتے ہوئے کہ پاکستان قائم ہونے کے بعد مسلم لیگ کا کام ختم ہو گیا ہے۔ بادشاہ خاں نے یہ رائے دی کہ مسلم لیگ کو توڑ

دیا جائے، اور اس کی جگہ ایک خالص غیر فرقہ دار جماعت بنائی جائے جو غریب اور بے بس لوگوں کی خدمت کے لئے وقف ہو۔ وزارتی پارٹی کے اعتراض کے جواب میں انھوں نے کہا کہ جب سے سندھ الگ صوبہ بنا ہے۔ صوبہ واری جذبات کو اکسانے کی ذمہ داری مسلم لیگیوں پر خصوصاً پنجابیوں پر ہے۔ پٹھان بھی ویسی ہی خود مختاری چاہتے ہیں جیسی سندھ، پنجاب اور بنگال۔ میں نہ تو پاکستان کے ٹکڑے کرنا چاہتا ہوں اور نہ اُسے برباد کرنا۔

انھوں نے کہا " ہندوستان آزاد ہو گیا ہے، لیکن پاکستان جہاں برطانوی گورنروں کا راج ہے اور برطانوی افسروں کی تعداد اتنی زیادہ ہو گئی ہے جتنی سالہا سال سے نہیں ہوئی تھی۔ استبداد کے پنجے میں پہلے سے بھی زیادہ گرفتار ہے۔ پاکستان کی حکومت اس طریقے سے راج کر رہی ہے جو انگریزوں نے ایجاد کیا تھا بلکہ سچ پوچھئے تو نئے قاعدوں اور ضابطوں بدیسی طرز معاشرت اور فضول خرچی کو دیکھتے ہوئے پہلے سے بدتر ہے۔ لوگ صوبے داری جذبے کی شکایت کرتے ہیں۔ لیکن حقیقت میں یہ جذبہ مسلم لیگ کا اور پنجابیوں کا پیدا کیا ہوا ہے۔ میں یقیناً پٹھانستان چاہتا ہوں، مگر وہ پٹھانستان جو پاکستان کے اندر ہو، اسی طرح جیسے سندھی اور پنجابی چاہتے ہیں۔"

آگے چل کر انھوں نے کہا " مسلم لیگ کو جو اس وقت ایک

فرقہ وار جماعت کی حیثیت رکھتی ہے نئے سرے سے بنا نا چاہیئے اور اس میں پاکستان کے سب باشندوں کو شریک کرنا چاہیئے ، اسی میں ملک کا بھلا ہے ۔ پاکستان امریکی اور برطانوی ماہرینِ فن کو صنعتی ترقی کے لئے ضرور رکھے ۔ لیکن ان کو انتظامی عہدوں سے الگ کر دے ۔ ورنہ پاکستانیوں کو اپنے ملک پر بھروسہ نہیں رہے گا ۔"

اخباروں کو ایک بیان دیتے ہوئے انھوں نے ان سختیوں اور بدسلوکیوں کی ایک لمبی فہرست پیش کی جو خدائی خدمت گاروں کے ساتھ کی گئی تھیں :" پاکستان کی حکومت کہتی ہے کہ اس نے ہمارے اخبار پختون کی زبان بندی نہیں کی ۔ صرف اتنا ہوا کہ جب اس کے پرانے پبلشر نے استعفیٰ دے دیا تو حکومت کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے اُسے آئندہ کے لئے ڈکلیریشن دینے سے انکار کر دیا ۔ اگر ڈکلیریشن نامنظور کر دینا جس کی وجہ سے اخبار بند ہو گیا ۔ زبان بندی نہیں ہے تو پھر اور کیا ہے ؟"

"اب رہا ضلع مردان میں شہری آزادی کا سوال تو مجھے اس کی بھی اجازت نہیں دی گئی کہ میں اپنے دوستوں سے ملوں ۔ جب مجھے عدالت میں حاضر ہونا پڑا تو سارے علاقے میں دفعہ ۱۴۴ ضابطہ فوجداری نافذ کر دیا گیا ۔ مرداس کے جشن کے موقع پر یہی دفعہ سارے ضلع مردان اور ضلع پشاور میں نافذ کر دی گئی .... یہ صحیح

ہے.......... کہ اس کا مقصد ان لوگوں کو دبانا تھا جو غذا کی رسد بڑھانے کا تقاضا کر رہے تھے۔ لیکن محض اس بات سے کہ اس کی زد میں مسلم لیگی بھی آتے تھے، یہ ثابت نہیں ہوتا کہ لوگوں کے شہری حقوق میں مداخلت نہیں کی گئی بلکہ اس سے تو الزام اور شدید ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ نئے انتظام میں خود سرکاری پارٹی کے لوگوں کے بنیادی حقوق بھی سلب کر لیے گئے ضابطہ فوجداری کی دفعہ ۴۰ کی رو سے ہزارہا شہریوں کو بغیر عدالتی تحقیقات کے جیل میں بھر دیا گیا۔ کیا حکومت اس کے صحیح اعداد پیش کرے گی؟"

انھوں نے کہا معلوم نہیں حکومت مخالف پارٹیوں کی خبروں کو دبانے کے لئے کیا ترکیب کرتی ہے۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ سُرخ پوشوں کے دو اہم جلسے ہوئے جن میں اخباروں کے نمایندے موجود تھے۔ لیکن ان کی خبر کسی جگہ کے کسی اخبار میں شائع نہیں ہوئی۔" ظاہر ہے کہ اخبار کے نمایندوں نے اتنی زحمت خواہ مخواہ نہیں اُٹھائی تھی۔" آخر میں انھوں نے کہا کہ یہ باتیں اس وقت تو سمجھ میں آتی تھیں جب ملک میں بدیسیوں کی حکومت تھی۔ مگر اب جبکہ پاکستان آزاد ہو گیا ہے اور یہ دعوے کیا جاتا ہے کہ ایک عوامی اسلامی حکومت وجود میں آئی ہے تو یہ کسی طرح عقل میں نہیں آتا کہ آخر صوبے کی حکومت نے "وہی بدیسی سامراجیوں کے پرانے نوکر شاہی طریقے" کیوں استعمال کئے

بادشاہ خاں کے آخری سفر کراچی کے موقع پر ان کے ساتھ کوئی تیس خدائی خدمت گار تھے جو اپنے خرچ پر آئے تھے اور ان کے باڈی گارڈ کا کام کرتے تھے۔ یہ لوگ اُن کے اپنے گاؤں اُتمان زئی میں اور دوسری جگہ مسلح ہوکر پہرہ دیتے تھے تاکہ اگر ان پر قاتلانہ حملہ کیا جائے تو اُن کی حفاظت کریں۔ دس سال پہلے جب گاندھی جی اتمان زئی میں بادشاہ خاں کے مہمان تھے تو یہ سوال اُٹھا تھا کہ گاندھی جی کی حفاظت کے لئے رات کو مسلح پہرہ لگایا جائے۔ بادشاہ خاں کو وہ گفتگو یاد تھی جو اس موقع پر گاندھی جی سے ہوئی تھی " بادشاہ خاں نے اپنے ساتھیوں کو کئی بار اس بات پر جھڑکا کہ وہ ان کی حفاظت کے لئے مسلح ہوکر پہرہ دیتے ہیں۔ کیونکہ وہ اسے عدم تشدد کے اصول کے خلاف سمجھتے ہیں۔ لیکن وہ اُسے اپنا فرض سمجھ کر اس سے باز نہیں آئے۔ انھیں اپنے محبوب لیڈر کی طرف سے بڑی فکر ہے، اور ان کی وفاداری کو دیکھ کر دل پر بڑا گہرا اثر ہوتا ہے۔ ان کو بڑی تکلیفیں اُٹھانی پڑتی ہیں...... لیکن وہ کبھی پہرے سے غافل نہیں ہوتے .... ایک منٹ کے لئے بھی نہیں

ایک پارٹی میں جو بادشاہ خاں کے اعزاز میں کراچی میں دی گئی، سندھ کے اقلیت کے ایک نمائندے نے کہا کہ مہاتما جی کی زندگی میں وہ اپنی مشکلوں کو حل کرنے کے لئے ہمیشہ اُن کے پاس جایا کرتے تھے لیکن اب ان کی وفات کے بعد ایسے موقعوں پر وہ بادشاہ خاں

کے پاس جایا کریں گے" جن کی وہ مہاتما جی کے بعد سب سے زیادہ عزت کرتے ہیں"۔ انھوں نے یہ درخواست کی کہ اس مشکل زمانے میں وہ ان کی رہنمائی کریں۔ بادشاہ خاں نے اس کے جواب میں اپنے دلی جذبات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ یہ زمانہ سب کے لئے آزمائش اور مصیبت کا ہے۔ خدائی خدمت گاروں نے صوبہ سرحد میں اپنی وزارت بنالی تھی۔ لیکن چند سال کے بعد وہ ختم ہو گئی۔ اس لئے کہ وزارت نے عوام کی اتنی خدمت نہیں کی جتنی اُسے کرنی چاہئے تھی۔ اس نے جو وعدہ عوام سے کیا تھا اُسے پوری طرح نہیں نباہا۔ انھوں نے کہا کہ وہ کانگریس ورکنگ کمیٹی کو صوبہ سرحد کی وزارت کی کمزوریاں جتایا کرتے تھے، لیکن نہ تو ورکنگ کمیٹی نے اس صورت حال کی اصلاح کی اور نہ خود وزارت نے۔

بادشاہ خاں نے کہا" آخرکار دنیا میں حق اور انصاف کا بول بالا ہوگا اور ملک کی ترقی بے غرض اور مخلص لیڈروں ہی کے ہاتھوں ہوگی نہ کہ خودغرض اور خودمطلب زمانہ سازوں سے۔ ہندوستان اور پاکستان کے سامنے ترقی اور بہبودی کی راہ اسی وقت کھلے گی جب اُن کے لیڈروں میں یہ صفات ظاہر ہوں"۔

گفتگو کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے انھوں نے کہا کہ میں نے مغربی پاکستان میں اقلیتوں کی مصیبت کی داستان بہت غور سے سُنی۔ خدا کی طرف سے ہمیشہ انسانوں کا امتحان ہوتا رہتا ہے

اور صرف وہی قومیں اور افراد جو ان آزمائشوں کا مقابلہ صبر، استقلال اور ہمت سے کرتے ہیں، آخر میں کامیاب ہوتے ہیں۔ پاکستان کے قائم ہونے کے بعد سے شمال مغربی سرحدی صوبے میں خاص آرڈیننس کی حکومت ہے۔ پاکستان کے وجود میں آنے کا باعث دراصل آزادی کی وہ لڑائی ہے جو پٹھان اور دوسرے لوگ ایک مدت سے لڑ رہے ہیں۔ اگر وہ انگریزوں کو اختیارات کے منتقل کرنے پر مجبور نہ کر دیتے تو پاکستان کبھی نہ بن سکتا۔ لیکن ملک کو چھوڑتے وقت انگریز حکمرانوں نے اختیارات ان لوگوں کے ہاتھ میں نہیں دئیے جو آزادی کے لئے لڑ رہے تھے، بلکہ ان کو سونپے جنھوں نے اس کے لئے کچھ بھی نہیں کیا تھا۔

بادشاہ خاں نے یہ دعوے کیا کہ وہ سچے امن پسند ہیں، اور ہمیشہ اس پر اصرار کرتے رہے ہیں کہ خدمت کا جو عہد غریبوں سے خدا کے سامنے کیا گیا ہے اس پر عمل کیا جائے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ بدقسمتی سے ایسا نہیں ہوا۔ اسی لئے ان لوگوں کو یہ مصیبت اٹھانی پڑی۔ اس آزمائش کے وقت لوگوں کو اپنے غصّے کو قابو میں رکھنا چاہیے، ایک کڑے اخلاقی ضابطے اور نصب العین کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہر حال میں اس پر عمل کرنا چاہیے، اور اس کی کوشش کرنی چاہیے کہ یہی اخلاقی ضابطہ حکومت کے نظم ونسق پر بھی عاید کیا جائے۔

پٹھانوں کے ایک مجمع کے سامنے جو زیادہ تر مزدوروں پر مشتمل تھا۔ بادشاہ خاں نے اپنی صاف گوئی کو خطرناک حد تک پہنچا دیا۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں جماعت کی حیثیت سے صرف پٹھان ہی ایسے ہیں جنھوں نے انگریزوں کے خلاف لڑائی لڑی ہے، اور انھیں کی بدولت پاکستان بن سکا۔ وہ سرمایہ دار طبقہ جس کے ہاتھ میں پاکستان کی حکومت ہے پٹھانوں سے اس لئے ڈرتا ہے کہ وہ خود غرضی سے پاک ہیں اور ملک کی خاطر تکلیفیں اٹھانے کو ہمیشہ تیار رہتے ہیں۔

انھوں نے کہا کہ "وہ ہمیشہ ہندوستان کی تقسیم کے خلاف رہے اور اس خون ریزی اور ناقابلِ بیان مصیبت نے جو تقسیم کے بعد لاکھوں کروڑوں آدمیوں کو اٹھانی پڑی یہ ثابت کر دیا کہ ان کی رائے صحیح تھی۔ مگر پھر بھی جب سے پاکستان بنا ہے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ پاکستان کا فائدہ خود ان کا فائدہ اور پاکستان کا نقصان خود ان کا نقصان ہے"

آخر میں بادشاہ خاں نے کہا "پٹھانوں کو اپنے مستقبل کے بارے میں شبہ ہے اور وہ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ پاکستان میں ان کا مقام کیا ہوگا۔ اگر واقعی ان کے ساتھ بھائیوں کا سا برتاؤ کرنے کی نیت ہے تو پاکستان کے طرز حکومت اور دوسرے معاملات کے متعلق ان کی رائے لی جانی چاہیئے۔ ہندوستان

میں صوبوں کے گورنر کے انتخاب میں صوبائی وزارتوں سے مشورہ کیا جاتا ہے۔ لیکن صوبہ سرحد میں ایک انگریز افسر جسے پٹھان ناپسند کرتے ہیں، اُن کے سر پر مسلط کر دیا گیا ہے۔ پٹھان یہ جاننا چاہتے ہیں کہ پاکستان میں ان کی حیثیت کیا ہوگی، کیا ان کے ساتھ برابری کا برتاؤ کیا جائے گا؟

خدائی خدمت گار اس کے سوا کچھ نہیں چاہتے کہ پاکستان کے عوام کی موجودہ غربت اور پس ماندگی کو دور کیا جائے اور اس کوشش میں وہ ہر حال میں عدم تشدد کے جو ساری عمر ان کا اصول رہا ہے پابند رہیں گے۔

۱۵ اپریل کو بادشاہ خاں کی ملاقات قائداعظم جناح سے ہوئی قائداعظم نے اُن سے پوچھا کہ کیا خدائی خدمت گار مسلم لیگ میں شامل ہو جائیں گے اور صوبہ سرحد کی وزارت کے ساتھ کولیشن کی صورت میں تعاون کریں گے؟ اس کے جواب میں بادشاہ خاں نے پھر سے پاکستان کی وفاداری کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ وہ مسلم لیگ میں شریک ہونے اور سرحد کی وزارت کی کولیشن بنانے سے معذور ہیں۔ اس کے بعد قائداعظم نے ایک بہت بڑے جلسے میں اعلان کیا کہ ان کے اور بادشاہ خاں کے درمیان گفت و شنید ناکام رہی۔ انھوں نے پٹھانوں کو تاکید کی کہ "وہ ایسے لوگوں سے کوئی واسطہ نہ رکھیں کہ جو پاکستان کی وفاداری کا بہانہ کرتے ہیں۔ لیکن حقیقت میں اس کی بنیاد کو کمزور

کرنا چاہتے ہیں۔"

۲۳ رمئی کو بادشاہ خاں نے اعلان کیا کہ انھوں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ خدائی خدمت گاروں کی تحریک کو پاکستان کے سب صوبوں میں پھیلائیں گے۔ اُنھوں نے کہا کہ یہ جماعت پاکستان کی عوامی پارٹی کے لئے جو اسی وقت بنی تھی اور جس نے انھیں اپنا پہلا عارضی صدر منتخب کیا تھا ایک والنٹیر کور کا کام دے گی۔ اس پارٹی کا منجملہ اور مقاصد کے ایک مقصد یہ تھا کہ پاکستان کو ایک مضبوط اور مستحکم ریاست اور سوشلسٹ جمہوریتوں کا ایک یونین بنائیں جس کی بنیاد عوام کے ارادے اور مرضی پر ہو۔ جس میں سب صوبوں کو پوری آزادی حاصل ہو اور جو ہمسایہ ریاستوں خصوصاً انڈین یونین سے دوستانہ تہذیبی تعلقات رکھے۔"

اس پارٹی کی کانفرنس نے ختم ہونے سے پہلے کئی ریزولیوشن پاس کئے جن میں صوبہ سرحد کی استبدادی پالیسی پر ملامت کی گئی جس نے خدائی خدمت گاروں کو جیلوں میں ڈال دیا تھا۔ یہ مطالبہ کیا گیا کہ پاکستان کے فائدے کو مدنظر رکھ کر یہ پالیسی بدل دی جائے اور یہ مطالبہ کیا گیا کہ بلوچستان کے نیشنلسٹ لیڈر عبدالصمد خاں کو رہا کر دیا جائے۔"

"کانفرنس نے یہ اعلان کیا کہ عوامی پارٹی اس پارٹی سے جو برسر حکومت ہے تعاون کرنے کے لئے پوری طرح تیار ہے

"آئین ساز مجلس کے اندر بھی اور باہر بھی ایک متفقہ پروگرام کی بنیاد پر جو نئی ریاست کی سلامتی استحکام اور فلاح و بہبود کے لئے بنایا جائے۔"

ایک تجویز یہ بھی تھی کہ جب تک اس قسم کا کوئی سمجھوتہ نہ ہو اس پارٹی کی پالیسی یہ ہوگی کہ پاکستان کی موجودہ حکومت کا ساتھ دے۔

بہت جلد یہ بات ظاہر ہوگئی کہ پاکستان کی حکومت نئی عوامی پارٹی کے قیام کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتی۔ صوبہ سرحد کے وزیر اعظم خان عبدالقیوم خان نے سرخ پوشوں کے لیڈر خان عبدالغفار خان کو ایک ایسا "دشمن" قرار دیا جو پاکستان کی حکومت کی جڑ کھودنے کی پوری کوشش کر رہا ہے" اور اس حلف وفاداری کے متعلق جو انھوں نے اور ان کی پارٹی نے اٹھایا تھا یہ کہا کہ "یہ ایک ڈھونگ سے زیادہ نہیں!" اسی کے ساتھ انھوں نے یہ معنی خیز جملہ کہا "جب کبھی ہم اپنے امن پسند شہریوں کی بھلائی کے لئے مناسب سمجھیں گے۔ ضروری تدبیریں اختیار کریں گے۔"

بادشاہ خان پر انتشار پیدا کرنے کا الزام لگایا گیا مگر ان کا کہنا یہ تھا کہ میں بہت سوچتا ہوں مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ پاکستان کے ارباب اختیار کدھر جا رہے ہیں۔ وہ اسلام کا نام لے کر ریاست کے قوت اور استحکام کی اپیل کرتے ہیں لیکن اسی کے

ساتھ وہ ان لوگوں سے جو پاکستان کی قوت اور خوش حالی کے بنیادی مسئلے میں اُن سے متفق ہیں لیکن اس کے طریقے کے بارے میں ایمان داری کے ساتھ ان سے اختلاف رکھتے ہیں۔ تنگ دلی اور تنگ نظری سے پیش آتے ہیں ۔"

ہمارے ہمسایہ ڈومینین ہندوستان میں تقسیم سے پہلے ہندو مہاسبھا اور ڈاکٹر امبیدکر کا اچھوتوں کا فیڈریشن برابر ہر قدم پر کانگریس کی مخالفت کرتا تھا ۔ لیکن جیسے ہی ہندوستان آزاد ہوا سب مخالف پارٹیاں مل گئیں ۔ چنانچہ ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی اور امبیدکر اب پنڈت نہرو اور سردار پٹیل کے رفیق کار ہیں ۔ اگرچہ انھوں نے اپنی جماعتوں کو کانگریس پارٹی میں ضم نہیں کیا ہے ۔ بخلاف اس کے جو کچھ پاکستان میں ہو رہا ہے وہ بہت افسوسناک ہے اور اگر یہی صورت حال رہی تو نہ صرف مسلم لیگ کے لیڈروں کو بلکہ خود قوم کو اس کا نتیجہ بھگتنا پڑے گا ۔ میں نے بارہا ان بیانات میں جو اخباروں کو دئے جو ان تقریروں میں جو مجمع عام میں کیں پاکستان کی وفاداری کا اظہار کیا ہے لیکن اس کے باوجود مسلمانوں میں باہم تفریق کی جاتی ہے اور میری ہی پارٹی کے لوگوں کے ساتھ مخالفت بلکہ دشمنی کا برتاؤ ہو رہا ہے ۔ میں نے ان سے صاف صاف کہہ دیا :۔ ہم آپ کے نظم ونسق میں رکاوٹ نہیں ڈالتے ۔ ہم کو حکومت کی ہوس نہیں ۔ وزارت آپ کو

مبارک ہو ، ہم تو صرف اس کی اجازت چاہتے ہیں کہ اپنے تعمیری طریقے سے اپنے بھائیوں کی خدمت کرسکیں۔ مگر اس پر بھی وہ ہمارا پیچھا نہیں چھوڑتے "۔

.... بادشاہ خاں صوبہ سرحد میں واپس آئے تاکہ نئی جمعیتہ العوام کا پروگرام اپنی قوم کے سامنے پیش کریں۔ انھوں نے ضلع مردان میں ایک بہت بڑے جلسے کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کہا " میں نے پاکستان کی آئین ساز اسمبلی کا تماشا دیکھ لیا۔ پاکستان کے لیڈروں میں اور پرانے انگریز حکام میں کوئی مطلق فرق نہیں ہے۔ اس حکومت کی حمایت میں جو دلیل بظاہر سب سے زیادہ معقول معلوم ہوتی ہے اور عموماً پیش کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ نئی ریاست ابھی ایک نوزائیدہ بچہ ہے۔ میں ان سے یہ کہتا ہوں کہ ہندوستان کو دیکھو جس کے لیڈروں نے سخت طوفان کے باوجود ریاست کی کشتی کو کنارے تک پہنچا دیا ہے۔ انھوں نے اپنا نیا آئین بنا لیا ہے۔ درآں حالیکہ پاکستان میں ابھی تک کچھ بھی نہیں ہوا ہے "۔

اس سے ہم صرف یہی نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ پاکستان کے موجودہ لیڈر جمہوری نظام سے ڈرتے ہیں۔ یہ لیڈر جنھیں اپنے اپنے فائدے کی فکر ہے۔ پاکستان کو اپنی ذاتی جاگیر سمجھتے ہیں، افسوس کی بات ہے کہ یہ سب مہاجرین ہیں اور پاکستان کے

اصلی باشندے نہیں ہیں۔

میں اس موقع پر تمھیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اسلامی یا قرآنی قانون جس کے لیے تم اتنے دن سے چلا رہے ہو، اور جس کی خاطر تم نے اور تمہارے عزیزوں نے اپنی جانیں قربان کی ہیں، پاکستان میں کبھی نافذ نہیں ہوں گے۔

انھوں نے اپنی تقریر کو ان پرزور الفاظ پر ختم کیا "میرے افغان بھائیو! میں تمھیں یہ جتانا چاہتا ہوں کہ تم پاکستان کی ریاست میں حصہ دار ہو، اس کا چوتھائی حصہ تمھارا حق ہے۔ اب یہ تمھارا کام ہے کہ تم مل کر اٹھ کھڑے ہو، اور یہ عہد کرو کہ اپنا حق لے کر رہیں گے۔ تم متحد ہو جاؤ اور مضبوط ارادے سے کام لے کر ان ریت کی دیواروں کو گرا دو جو پاکستان کے لیڈروں نے تمھارے گرد کھڑی کر دی ہیں۔ ہم موجودہ صورتِ حال کو اب برداشت نہیں کر سکتے۔ اپنی کمریں کس لو اور اپنی منزل کی طرف بڑھے چلو۔ تمھاری منزل اُن پٹھانوں کی آزادی ہے۔ جنھوں نے بڑی بڑی قربانیاں دی ہیں اور بڑی بڑی مصیبتیں اُٹھائی ہیں۔ ہم اس وقت تک چین نہیں لیں گے جب تک پٹھانستان یعنی پٹھانوں کی حکومت پٹھانوں کے ذریعے سے اور پٹھانوں کے لئے قائم نہ کر لیں۔"

تین دن بعد وہ گرفتار کر لئے گئے۔ اُن کے ساتھ اُن کے بیٹے عبدالولی خاں اور دو اور سُرخ پوش لیڈر بھی پکڑ لئے گئے۔

بندہ دادشاہ کے چھوٹے سے کچے ڈاک بنگلے میں جو بنوں کی بڑی سڑک پر واقع ہے۔ اُن کے مقدمے کی سرسری تحقیقات ہوئی۔ اِن پر "بغاوت" کا اور "پاکستان کے دشمن فقیر ایپی کے ساتھ تعاون کا ارادہ رکھنے" کا الزام لگایا گیا۔ کوہاٹ کے ڈپٹی کمشنر نے جس کے سامنے مقدمہ پیش ہوا تھا اُن سے کہا کہ اپنی صفائی پیش کریں۔ انھوں نے ارتکابِ جرم سے انکار کیا۔ مگر اس کے سوا اور کوئی صفائی پیش نہیں کی۔ اس پر مجسٹریٹ نے پوچھا کہ کیا آپ صوبہ سرحد کے ضابطہ فوجداری دفعہ ۴۰ کے مطابق تین سال کے لئے نیک چلنی کا مچلکہ دینے پر تیار ہیں۔ بادشاہ خان نے جواب دیا کہ "میں نے ایسے مچلکے نہ کبھی دئے ہیں اور نہ اب دوں گا" چنانچہ انھیں تین سال کی قیدِ بامشقت جو اس جرم کی کم سے کم سزا ہے دی گئی۔

بادشاہ خان کی گرفتاری کے فوراً بعد صوبہ سرحد کی حکومت نے اپنے اس اقدام کی توجیہہ کے لئے ایک کمیونکے شائع کیا جس میں کہا گیا کہ باوجود اس کے کہ ہندوستان کی تقسیم کانگریس اور مسلم لیگ کی باہمی رضامندی سے ہوئی، عبدالغفار خاںؒ پاکستان کے قیام کے قطعاً مخالف ہیں۔" یہ بات صحیح نہیں تھی۔ عبدالغفار خاں ستمبر ہی میں یہ اعلان کر چکے تھے کہ وہ پاکستان کو قبول کرتے ہیں البتہ وہ یہ چاہتے تھے کہ پشتو بولنے والے لوگوں کو اپنے وطن

میں جس کا نام اُنھوں نے پٹھانستان رکھا، وہی حیثیت اور حقوق حاصل ہوں جو سندھیوں کو سندھ میں، پنجابیوں کو پنجاب میں اور بنگالیوں کو بنگال میں ہیں۔ بہرحال اس کمیونکے میں یہ لکھا تھا "انھوں نے اپنے پیرؤں کو یہ حکم دیا کہ ۱۵ اگست کے جشن آزادی میں شرکت نہ کریں اور پاکستان کی نئی ریاست کا حلفِ وفاداری نہ اُٹھائیں۔ اسی لئے اُن کے بھائی کی وزارت جو ان دنوں برسرِ حکومت تھی، پاکستان سے غداری کی بنا پر برخاست کردی گئی تھی۔"

ظاہر ہے کہ یہ الزام اُسی وقت غلط ثابت ہو گیا جب بادشاہ خان نے کراچی میں حلف وفاداری اُٹھایا، اور صاف صاف الفاظ میں پاکستان کی ریاست سے سچی وفاداری کا اظہار کیا۔ اس کے علاوہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جو الزام اُن پر لگایا گیا اُسے اُن کے بھائی کی وزارت" سے "جو ان دنوں برسرِ حکومت تھی" کیا تعلق ہے؟ کیا یہ وہی پرانا قصہ نہیں، معلوم ہوتا ہے کہ بھیڑیے نے میمنے پہ یہ الزام لگا کر کہ وہ اس کا پانی گدلا کر رہا ہے اُسے ہڑپ کر لیا تھا۔ اس کے بعد کمیونکے میں یہ الفاظ تھے" اسی کے ساتھ اُنھوں نے نام نہاد جمعیت العوام کو قائم کرکے اپنے دائرۂ عمل کو اور وسیع کر لیا" کوئی پوچھے کہ یہ کون سا جرم تھا اور پاکستان کے پُرانے کانگریسی عناصر کو اکٹھا کر لیا۔ ظاہر ہے جسے سزا دینا ہو، اس پر کچھ الزام تو لگانا ہی چاہیئے " دوسری بار کراچی جانے کے بعد...... بادشاہ خان

نے سوچ سمجھ کر اور پورا انتظام کر کے صوبے میں شورش کرنے کی کوشش کی۔ عین اس وقت جب ہندوستانی فوج کا حملہ، جس کا بہت کچھ اشتہار دیا گیا تھا، صوبہ سرحد پر ہونے کی توقع تھی" اگر کوئی ایسی سازش تھی کہ بادشاہ خاں کی مفروضہ جدوجہد اسی وقت شروع ہو جب "ہندوستانی فوج کا حملہ، جس کا بہت کچھ اشتہار دیا گیا تھا، صوبہ سرحد پر ہونے کی توقع تھی" (دراصل یہ حملہ کمیونیک کے مصنف کے ذہن کی پیداوار تھی) تو پاکستان کی حکومت بھی اسی سازش میں ضرور شریک رہی ہوگی، تبھی تو اس نے آئین ساز اسمبلی کا جس میں بادشاہ خاں حلفِ وفاداری اٹھانے کے لئے گئے تھے ٹائم ٹیبل ایسا بنایا کہ وہ اس کی کارروائی ختم ہونے کے بعد ٹھیک وقت پر اپنے صوبے میں پہنچ سکیں۔ "گڑھی حبیب اللہ کی بم باری" جو ہندوستان کی ہوائی فوج نے کہر کی وجہ سے غلطی سے کر دی تھی اور جس کے لئے ہندوستان کی حکومت نے فوراً علانیہ معافی مانگی تھی" نے بادشاہ خان کو ورغلایا"۔ (یہ اس شخص کا ذکر ہے جس نے حال ہی میں کراچی میں کہا تھا کہ پاکستان کے قائم ہونے کے بعد سے وہ پاکستان کے فائدے کو اپنا فائدہ اور اس کے نقصان کو اپنا نقصان سمجھتا ہے)" اور وہ گاؤں گاؤں پھر کر لوگوں سے کہنے لگے کہ پاکستان ایک ریل کے پل کی طرح ہے جو ایک ہی دھکے میں بیٹھ جائے گا" یہ بات ان کے الفاظ کو زبردستی توڑ مروڑ کر کہی گئی۔ حقیقت میں انھوں نے

کہا تھا کہ پٹھانوں کو متحد ہو کر" ان ریت کی دیواروں کو گرا دینا چاہیے جو پاکستان کے لیڈروں نے ان کے گرد کھڑی کر دی ہیں" تاکہ ان کے حقوق کو محدود کر دیں۔ کمیونکے کے آخری الفاظ یہ تھے" اپنی تقریروں میں جو وہ آخر مئی سے کر رہے ہیں وہ نہ صرف حکام کو برا بھلا کہتے ہیں بلکہ لوگوں کو واقعی اکسا رہے ہیں کہ اس حکومت کے خلاف جو جائز طور پر قائم ہوئی ہے شورش برپا کریں۔ اب آپ ان الفاظ کا مقابلہ بادشاہ خاں کے اس بیان سے کیجئے جو انھوں نے صاف دلی سے ۱۶ مئی ۱۹۴۸ء کو یعنی اپنی گرفتاری سے ایک مہینے پہلے دیا تھا" مجھے مجبوراً یہ کہنا پڑتا ہے کہ باوجود اس اپیل کے جو میں نے حال میں اپنے مخالف پارٹی کے دوستوں سے اخباروں اور تقریروں کے ذریعے سے کی تھی انھوں نے جمعیتہ العوام کے قیام کو ہمدردی کی نظر سے نہیں دیکھا بلکہ وہ میری پارٹی والوں کی نیت پر بار بار شبہہ کا اظہار کر رہے ہیں محض اس لیے کہ وہ ایک زمانے میں ہندوستان کی نیشنل کانگریس سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ بات اس وجہ سے اور بھی زیادہ افسوس ناک ہے کہ اس جمعیت نے اپنے خاص رزولیوشن میں حب وطن کے جذبے کے ساتھ غیر مشروط طور پر حکومت کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا۔ ہمارے حریفوں کے نزدیک ریاست سے وفاداری کا معیار یہ ہے کہ ایک پارٹی کی حکومت کے سامنے بے چون و چرا سر جھکا دیا جائے"۔ دنیا سے یہ توقع کرنا بے جا ہے کہ وہ اس بات کو

مان لے گی کہ وہ شخص جس کو ساری عمر اپنی قوم کو تشدد سے باز رکھنے کی لگن رہی جو اُسے اُن کے لئے مہلک سمجھتا تھا جس نے خوفناک پٹھانوں کو عدم تشدد کا پابند بنا کر دنیا کو حیران کر دیا جس کے خلوص اور سچائی کی گاندھی جی نے اچھی طرح جانچ کرنے کے بعد شہادت دی تھی۔ اس جرم کا مرتکب ہو سکتا ہے کہ جو بار بار خالص عدم تشدد کا اور پاکستان کی وفاداری کا دعوے کرنے اور مجمع عام میں اس کی خیر خواہی کا اعتراف کرنے کے بعد ایک دم سے اپنے عقیدے سے پھر جائے گا اور اِن اصولوں کو جن کا وہ عمر بھر پابند رہا چھوڑ دے گا راقم الحروف جسے بادشاہ خاں کی دوستی اور ہم طعامی کا فخر حاصل ہے اور جو گاندھی جی کے زیر سایہ اُن کے گھر میں خاندان کے ایک رکن کی حیثیت سے رہ چکا ہے۔ یہ کہہ سکتا ہے کہ آج ہندوستان یا پاکستان میں کوئی ایک شخص بھی نہیں جو بادشاہ خاں کی طرح گاندھی جی کے حق اور عدم تشدد کے اصولوں کا اور اُن کی گہری روحانیت کا مجسمہ ہو جو ان کی طرح خدا پر عقیدہ رکھتا ہو اس کی مرضی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتا ہو اور اس کے بندوں کی دل و جان سے خدمت کرتا ہو[1]۔

---

[1] مہادیو ڈیسائی نے جو گاندھی جی اور بادشاہ خاں دونوں کو اتنی اچھی طرح جانتے تھے جتنا کوئی اور نہیں جانتا ہوگا ۱۹۳۸ء میں لکھا تھا "مجھے آج تک کوئی ایسا شخص نہیں ملا جو پاکبازی اور زہد و تقوٰے اور اسی کے ساتھ رقت قلب اور خدا پر سچا عقیدہ رکھنے میں بادشاہ خاں سے بڑھ کر بلکہ ان کے برابر بھی ہو۔"

"دو خدائی خدمت گار" از مہادیو ڈیسائی

خان بھائیوں کی مسلسل اسیری مہذب دنیا کے ضمیر کے لئے ایک چیلنج ہے۔ اگر بے گناہوں کی جنھوں نے اپنی زندگی کو ایک اعلیٰ نصب العین کی خدمت کے لئے وقف کر دیا ہے۔ قربانی کی مثال دیکھنی ہو تو ان دونوں بھائیوں کو خصوصاً بادشاہ خان کو دیکھئے۔ اُن کے دل میں کسی کی طرف سے دشمنی کا جذبہ نہیں بادشاہ خان کی کوئی ذاتی غرض نہیں، کوئی شخصی حوصلہ نہیں" میں ساری عمر ایک سپاہی رہا ہوں اور مرتے دم تک سپاہی رہنا چاہتا ہوں" ان الفاظ کے ساتھ انھوں نے ۱۹۳۴ء میں کانگریس کا صدر بننے سے انکار کیا تھا۔ انھوں نے اپنی خوشی سے ضبط نفس کے لئے ہر طرح کی جسمانی تکلیفیں اٹھانے کی عادت ڈالی۔ سفر کے زمانے میں وہ اپنا سامان خود اُٹھاتے تھے اور تیسرے درجے میں سفر کرتے تھے۔ ۱۹۳۱ء میں جب وہ پہلی بار گاندھی جی سے ملنے کے لئے بورسد آئے تو اُن کے پاس صرف ایک جوڑا کپڑا تھا "جب فاصلہ اتنا ہو جسے وہ پیدل طے کر سکیں تو کبھی سواری استعمال نہیں کرتے، لیکن جب اس کے بغیر کام نہ چل سکے تو وہ سب سے سستی سواری ڈھونڈھتے ہیں۔ وہ ہر قسم کے تعیشات سے پرہیز کرتے ہیں اور نہایت سادی غذا استعمال کرتے ہیں۔ انھیں لوگوں کی اطاعت اور سچی وفاداری حاصل ہے۔ اس لئے کہ وہ خود ان صفات کا مجسمہ ہے۔

خان بھائیوں کو پاکستان کی حکومت سے جو اختلاف بھی ہو

نگران کی دیانت داری شبہ سے بالاتر ہے۔ مجھے یاد ہے کہ تقسیم کے بعد جب میں آخری مرتبہ گاندھی جی کے ساتھ دسمبر ۱۹۴۷ء اور جنوری ۱۹۴۸ء میں ٹھیرا تھا تو بادشاہ خاں نے گاندھی جی کو یہ پیام بھیجا تھا کہ آپ میری طرف سے یا ڈاکٹر خان صاحب کی طرف سے کوئی فکر نہ کیجیے۔ ہم آپ سے ملنے یا آپ کو خط لکھنے سے خاص کر کے پرہیز کرتے ہیں تاکہ پاکستان کے ساتھ ہماری وفاداری کے بارے میں کوئی شبہہ نہ کیا جاسکے۔ ان دونوں کے ساتھ یہ بڑا ظلم ہوگا کہ ان پہ دھوکے یا دوغلے پن کا شبہہ کیا جائے۔ وہ اس قسم کی حرکتیں کرہی نہیں سکتے۔ انھیں اپنے ملک سے اور اپنی قوم سے گہری اور والہانہ محبت ہے۔ بادشاہ خاں فطری طور پر سیدھے سادے اور کھرے واقع ہوئے ہیں اور کبھی ایسے بھولے پن کی باتیں کرتے ہیں کہ دوسرا آدمی گھبرا جاتا ہے۔ ایسا شخص کبھی اس ریاست کا دشمن نہیں ہوسکتا جو اپنے آپ کو اسلامی ریاست کہتی ہے۔

خان بھائی اس مٹی کے بنے ہیں جس سے ہیرو اور شہید بنتے ہیں۔ وہ اس مقصد کی خاطر جس کے لئے انھوں نے اپنی ساری زندگی گذار دی، خوشی سے جان دینے پر تیار ہو جائیں گے "مجھے پوری طرح یقین ہے کہ سب کچھ خدا کی طرف سے ہے۔ جب تک وہ مجھ سے جیل کے باہر کام لینا چاہتا تھا اس نے مجھے جیل سے باہر رکھا۔ اب اس کی مرضی یہ ہے کہ میں اندر رہ کر کام کروں میں اسی میں

خوش ہو جو اس کی خوشی ہو،، یہ الفاظ بادشاہ خاں نے اس وقت کہے تھے جب وہ وارد ھا سے اس زمانے کی بھی حکومت کے حکم سے گرفتار کر کے لے جائے گئے تھے اور انھیں تین سال کی قید سخت کی سزا دی گئی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ آج بھی وہ یہی الفاظ دہرا تے ہوں گے۔ اس لئے وہ جہاں ہیں اچھے ہیں۔ لیکن انصاف سے کہیے کہ کیا ایسے خدائی خدمت گاروں سے اس سے بہتر کام نہیں لیا جا سکتا تھا کہ انھیں جیل کی دیواروں کے اندر زندہ دفن کر دیا جائے کاش آج ہندوستان کا کوئی خدمت کرنے والا بادشاہ خاں کی طرح با خدا بے نفس، حق شناس اور سچی تنقید کرنے والا ہوتا جو حکومت کو تنبیہہ کرتا رہتا اور اُسے سیدھے راستے پر چلاتا جو ان کی سی کھری سیرت، بے لاگ دیانت رکھتا اور جسے حضرت مسیح کی طرح غریبوں اور بے کسوں سے محبت اور ہمدردی ہوتی اور جو اپنی زندگی کے ہر سانس کو ان کی آزادی اور خدمت کے لئے وقف کر دیتا۔ اگر دونوں ملکوں میں ایسے دو دو آدمی ہوتے تو یہ ان دونوں بلکہ شاید سارے ایشیا اور پوری دنیا کے لئے امن اور سلامتی کی بہترین ضمانت ہوتی۔

اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ بادشاہ خاں میں کوئی خامی یا کمزوری نہیں ہے۔ کون انسان اس سے خالی ہے؟ ان کی ایک کمزوری یہ ہے کہ وہ انگریزوں کی بات پر شبہہ کرتے ہیں۔ اس

کے بارے میں گاندھی جی کی رائے بیان کر چکا ہوں۔ بات یہ ہے کہ انسان ویسا ہی بن جاتا ہے جیسا واقعات اُسے بناتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ سالہ ۱۹۳۱ء میں گاندھی ارون معاہدے کے بعد گاندھی جی انھیں سر آرتھر گریفتھ سے ملنے کے لئے لے گئے۔ بادشاہ خاں بڑے افسروں سے ملنا نہیں چاہتے تھے۔ انھوں نے کہا کہ میں ایک سیدھا سادا آدمی ہوں اور ڈپلومیسی نہیں جانتا ہوں۔ گاندھی جی نے اُنھیں سمجھا بجھا کر راضی کیا۔ جب سر گریفتھ سے ملاقات ہوئی تو بادشاہ خاں نے اُن سے کہا "میں ایک صاف آدمی ہوں اور صاف باتیں پسند کرتا ہوں۔ میرے ساتھ ڈپلومیسی نہ برتیے گا۔" انھوں نے جواب دیا "خاں صاحب سیاست ایک شطرنج کا کھیل ہے جس میں دونوں طرف سے چالیں چلی جاتی ہیں۔ میں آپ کو مات دینے کی کوشش کرتا ہوں، آپ کو موقع ملے تو مجھے مات دیجئے۔" بادشاہ خاں نے کہا "تو پھر میں آپ کے ڈھب کا آدمی نہیں ہوں۔" اور یہ کہہ کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ سر گریفتھ نے حکمت عملی سے اپنا طرز بدل دیا۔ انھیں روک لیا اور ملاقات جاری رہی۔ اس کے کئی سال بعد بادشاہ خاں نے اس کے نتیجے کو بیان کیا "میں نے اپنی تجویز اُن کے سامنے رکھی (کہ قبائلیوں میں جاکر اور محبت کے ساتھ ان کی خدمت کر کے ان کے دلوں کو ہاتھ میں لیا جائے) .... مگر اس پر غور کرنے کے بجائے انھوں نے مجھے جیل میں ڈال دیا۔" وہ حد سے زیادہ

حساس ہیں اور کبھی کبھی اُن کے مزاج میں چڑچڑا پن آجاتا ہے۔ وہ صاف گو اور مُنہ پھٹ ہیں، اور جب کبھی اُنھیں غصہ آجاتا ہے تو اُن کے منہ سے گرم لاوا کی طرح الفاظ ابلنے لگتے ہیں اور سُننے والے کی روح کے اندر جھوٹ کی کھیتی جل جاتی ہے۔ لیکن اُن کے غصّے میں عداوت نہیں ہوتی۔ انھیں غصہ برائی پر آتا ہے۔ بُرے آدمی پر نہیں آتا۔ پھر بھی ستیہ گرہ کے نقطہ نظر سے یہ ایک خامی ہے اس لئے کہ ستیہ گرہ کا یہ ایک مسلمہ اصول ہے کہ سچی بات جب محبت بھرے دل سے نکلے تو اس میں سختی نہیں ہونی چاہئے۔ سارا معاملہ یہ ہے کہ انسان کو اس کا ڈھب آتا ہو۔ اسی طرح ان کی بعض اور کمزوریاں بھی گنائی جا سکتی ہیں۔ خدا اپنے سچے خدمت گذاروں کی غلطیوں کو درست کر دیتا ہے۔ مگر اُن سے چشم پوشی نہیں کرتا۔ عدم تشدد کا قانون اٹل ہے۔ اور اگر اس پر عمل کرنے میں ناتجربہ کاری سے کام لیا جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہو سکتا ہے کہ فوری مقصد میں ناکامی ہو، مگر یہ نام نہاد ناکامی عدم تشدد کی نہیں ہوتی بلکہ اس ناقص ذریعے کی ہوتی ہے جس سے وہ ظاہر کیا جائے۔ بجائے اس کے کہ اس سے انسان کا عقیدہ کمزور ہو یا اس پر مایوسی کا غلبہ ہو عدم تشدد کے پیرو کو چاہیے کہ توفیق الٰہی کے لئے۔ جس کے بغیر انسان کوئی چیز نہیں، اور زیادہ دعا کرے۔

"انسان کو اس سے زیادہ نہیں دیا گیا۔

اس کی روح میں صرف اتنی ہی طاقت ہے
کہ جو آج سیکھے، اس پر کل عمل کرے۔
اس کے لیے یہ کام کیا کم ہے
کہ صناعِ حقیقی کو کام کرتے ہوئے دیکھے
اور اس سے کاری گری کے حقیقی گر
اور اوزاروں کا صحیح استعمال تھوڑا بہت سیکھ لے!!

اب رہے خدائی خدمت گار تو جو خبریں اس کے بارے میں مل رہی ہیں کہ بادشاہ خاں کی اسیری کے زمانے میں انھیں اپنے سردار کی وفاداری کے جرم میں کیا کچھ بھگتنا پڑ رہا ہے اگر ان کا ایک شمہ بھی صحیح ہے تو انھیں بڑی سخت آزمائش کا سامنا کرنا ہے۔ انھیں گاندھی جی کے یہ الفاظ جن میں آیندہ کی خبر دی گئی ہے، یاد رکھنے چاہئیں :۔

"اگر آخری مقابلے میں خدائی خدمت گار اس عقیدے میں سچے ثابت نہ ہوئے جس کی پابندی کا وہ دعوےٰ کرتے ہیں تو ظاہر ہوگا کہ دراصل عدم تشدد اُن کے دل میں نہ تھا یہ آزمائش کا موقع بہت جلد آئے گا۔ اگر وہ جوش اور خلوص سے تعمیری پروگرام پر عمل کرتے رہے تو اُن کے لیے کوئی خطرہ نہیں۔ وہ امتحان کے وقت دنیا کے سب سے زیادہ بہادر آدمی ثابت ہوں گے۔

"عدم تشدد کسی کی اجازت کا پابند نہیں۔ وہ آپ ہی اپنی مہر اور اپنی سند ہے۔ وہ بے گناہ قربانی اور ظاہری شکست کے ذریعے سے ہر معرکے کو سر کر لیتا ہے۔ وہ کبھی ناکام نہیں ہوتا۔"

آپ لوگوں نے بنی نوع انسان کی بہبودی کے لئے جو نیک کام شروع کیا ہے
اس سے مجھے پورا پورا اتفاق ہے۔ اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالی آپ لوگوں
کو اس پاک مقصد میں کامیاب کرے۔

دستخط عبدالغفار
(قیدی)

۲۹ دسمبر سنہ ۱۹۴۹ء

FRONTIER OF INDIA
THIS NOTICE BOARD
THE PASSPORT REGULATIONS

CHICAGO CHICAGO

بادشاہ خاں کے اس خط کی عکسی تصویر جو موصوف نے امن پسندوںکی کانفرنس بمقام شانتی نکیتن و سیوا گرام (دسمبر سنہ ۱۹۴۹ء) کے دعوت نامہ کے جواب میں بھیجا تھا۔

Form B

(See Rule 24 of the Punjab [illegible] Rules 1949)

Name of Sender Abdul Ghaffar Montgomery Central Jail W. Punjab

Full name of address and relationship of addressee and of any other mentioned in the letter Hiralal Bose org. Secretary World Pacifist Meeting, 1 Upper Wood Street Calcutta 16, INDIA

To be detained here

[illegible]

Signature of [illegible] officer [illegible] Name of sender

Censored and passed.

For Deputy Inspector General of Police, West Bengal

9/1/50

پیارے ہیرا لال جی، آپ کا ۱۵ نومبر سنہ ۱۹۴۹ء کا خط مجھے ۸ دسمبر سنہ ۱۹۴۹ء کو ملا۔ شکریہ۔ شاید آپ کو معلوم نہیں کہ میں قید ہوں اور آپ لوگوں کی مجلس میں شرکت کرنے سے معزور ہوں